علیٌ ولیُّ الله

محکم عہد وفا

امیر المومنینؑ کی الٰہی خلافت اور امت مسلمہ کا برتاؤ

عبد العلی موحدی

مترجم: سید لیاقت علی کاظمی

جامعۃ الامام امیر المومنین (ع) نجفی ہاؤس، ممبئی، ہندوستان

بسم الله الرحمن الرحيم

نام کتاب : ـــــــــ مستحکم عہدِ وفا (امیر المومنینؑ کی الٰہی خلافت اور امت مسلمہ کا برتاؤ)

مؤلف : ـــــــــ عبد العلی موحدی

مترجم : ـــــــــ سید لیاقت علی کاظمی

نظر ثانی : ـــــــــ سید حسن عباس زیدی

طباعت : ـــــــــ بارِ اوّل

تعداد اشاعت : ـــــــــ پانچ سو (۵۰۰) عدد

سال اشاعت : ـــــــــ نومبر ۲۰۲۱ء

ناشر : ـــــــــ جامعۃ الامام امیر المومنینؑ نجفی ہاؤس نشان پاڑہ روڈ

آف امام حسینؑ چوک ممبئی، ہندوستان

۴۰۰۰۰۹، ٹیلیفون : ۲۳۴۳۳۴۵۲

فہرست

عرض سخن

شیعہ اور اہل تسنّن کے درمیان جن موضوعات پر بہت زیادہ بحث و گفتگو ہوئی ہے ان میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اسلامی معاشرے کی حکمرانی کا مسئلہ ہے۔ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سے لے کر آج تک کی پوری تاریخ میں، یہ مسئلہ ہمیشہ مسلمانوں میں تنازعے کا ایک اہم نقطہ رہا ہے اور اس ضمن میں مختلف نظریات و خیالات پیش کیے جا چکے ہیں۔

شیعہ مکتب، ایک حقیقی اسلامی عقیدے کے طور پر، اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حکمرانی کا حق ائمہ علیہم السلام کا الٰہی حق ہے اور دوسروں نے ان عظیم ہستیوں سے ناجائز طور پر مسند حکومت کو غصب کر لیا ہے۔ دوسری طرف مخالفین نے بھی اسلام کے آغاز میں رونما ہونے والے واقعات کو قانونی حیثیت دینے، انھیں خدا کی مرضی اور اسلام کی شریعت کے مطابق ثابت کرنے کے لیے مسلسل اور جی توڑ کوششیں کی ہیں۔

اس کتاب میں جس چیز کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسے تنقید کی ترازو پر تولا گیا ہے وہ ایک ایسا نظریہ ہے جو **"رضایت اور رضامندی"** کے نام پر پیش کیا گیا ہے۔ اس نظریے کے حامیوں کا کہنا ہے کہ اگرچہ امیر المومنین علیہ السلام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حکومت کو چلانے کی صلاحیت رکھتے تھے اور اگرچہ آپؑ خود بھی اس مقام کو یقینی طور پر اپنے ہی

لیے تسلیم کرتے تھے (چاہے وہ الٰہی نص کی بنا پر ہو یا افضلیت کی خاطر) لیکن جب آپ اس بات کی طرف لوگوں کے متوجہ ہونے کی طرف سے مایوس ہو گئے تو آپؑ دوسروں کی حکمرانی پر راضی ہو گئے اور اپنے حق سے دستبردار ہو گئے۔ جب آپؑ نے خدا کے احکامات کے نفاذ کے مطابق خلفائے وقت کی حکمرانی کو دیکھا تو حکومت کے ساتھ تعاون کیا اور حکومتی امور میں حصہ لیا۔[1] ساتھ ہی اس گروہ نے اپنے دعوے کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے شیعوں کی کتابوں سے حوالے بھی نقل کیے ہیں اور پھر اسی کے ضمن میں شیعہ عقائد کو خود ان کے ہی مسلمات سے متضاد بتایا ہے۔

اس نظریے کی تحقیق کا ہمارا بنیادی مقصد اس وقت کے حکمرانوں سے امیر المؤمنین علیہ السلام کی ناراضگی اور ان سے عدم رضایت کو واضح کرنا ہے اور خود امام علیہ السلام کی زبانی آپؑ کے سکوت کی وجہ اور اس کی دلیل پیش کرنا ہے تاکہ ہم دکھا سکیں کہ شیعہ دستاویزات کے مطابق نہ صرف امیر المؤمنین علیہ السلام کی طرف سے اپنے مخالفین کے بارے میں "**رضایت**" کا وجود نہیں ہے بلکہ اس کے بر خلاف امام علیہ السلام کے قول و فعل اور طرز عمل میں ناراضگی اور اپنی مظلومیت کا جابجا تذکرہ موجود ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے اپنی باتوں کو چار ابواب میں پیش کیا ہے:

پہلے باب میں، دین کی وضاحت کے ضمن میں خلافت کے غصب پر مختصر گفتگو کی ہے۔ جیسا کہ "امامتِ تطبیقی" کی بحث میں، ہم نے خلافتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مفہوم کو حکمرانی سے آگے بڑھاتے ہوئے ائمہ کی جانشین کے مسئلے میں شیعہ عقائد کو پیش کیا ہے کہ ائمہ علیہم السلام مختلف شعبوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختلف امور میں جانشین ہیں؛ اس بحث میں بھی ہم نے ائمہ سے خلافت کے غصب کو حکمرانی کے غصب اور مختلف مواقع پر اسلامی معاشرے کی

---

[1] ایسے بعض افراد کے بیانات گیارھویں سبق میں بیان ہوئے ہیں۔

حکمرانی میں ان کے حق کے غصب کو عمومیت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اور پھر عمومیت کے ساتھ اس سے متعلق آیات و معارفِ دین کی توضیح کے ضمن میں اس واقعے پر تفصیلی بحث و گفتگو کی ہے۔

دوسرا باب، جو کہ اس کتاب کے بنیادی مقصد پر مشتمل ہے، حکمرانی و خلافت کے سلسلے میں اپنی حقانیت اور دوسروں کے باطل پر ہونے کے بارے میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کے فرامین و بیانات سے متعلق ہے۔ اس باب میں ہم نے امیرالمؤمنین علیہ السلام کی فریاد اور ان پر ڈھائے گئے مظالم کا ایک حصہ سپردِ قلم کیا ہے تاکہ اس بات سے خبردار کیا جاسکے کہ حکومت کے مسئلے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کو امیرالمؤمنین علیہ السلام نے اپنا غصب شدہ حق مانا ہے، ساتھ ہی غاصب حکومت کے بارے میں آپؑ کے مستقل عدم اطمینان اور ناراضگی کی یاددہانی ہوجائے۔

تیسرے باب میں، امیرالمؤمنین علیہ السلام کو اللہ کی جانب سے عطا کردہ حقِ حکومت کے غصب اور اس پر ناجائز قبضے کے خلاف امیرالمؤمنین علیہ السلام کے ردِّعمل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور شیعہ شواہد کے لحاظ سے ہم نے یہ واضح کیا ہے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام نے اپنا حقِ حکومت غصب کرنے والوں کے خلاف تحریک چلائی لیکن پھر، خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے گئے اپنے وعدے کی وجہ سے اور لوگوں کی ذلالتوں کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنی تحریک روک دی اور خاموشی کا تلخ گھونٹ پی لیا۔ ساتھ ہی اس خاموشی کی حکمت اور اس کے اسباب کو بھی ہم نے خود امیرالمؤمنین علیہ السلام کی زبانی اور انھیں کے الفاظ میں بیان کیا ہے تاکہ آپ علیہ السلام کے طرزِ عمل سے کسی کو غلط فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے کہ گویا امیرالمؤمنین علیہ السلام اپنا حق غصب کرنے والوں سے راضی ہوگئے تھے۔

دوسرے اور تیسرے ابواب پر غور کرتے ہوئے، جن میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کے بیانات اور آپؑ کے طرز عمل کی روشنی میں آپؑ کا الٰہی حق غصب کرنے والوں سے آپؑ کی ناراضگی کا پتہ چلتا ہے، **چوتھے باب** میں اس بیان پر اعتراض کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کے تمام شکوک و شبہات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی اس خام خیالی کا پردہ چاک کیا گیا ہے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام اپنا الٰہی حق غصب کرنے والوں سے **راضی** ہو گئے تھے اور اس ضمن میں موجود تمام تر پہلوؤں، حوالوں اور دستاویزات کی چھان پھٹک کرتے ہوئے صحیح معانی و مطالب اور قطعی شواہد کی روشنی میں مخالفت کرنے والوں کے بے جا تعصب اور ان کی علمی خیانتوں کو واضح و آشکار کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں چند نکات پر توجہ بے حد ضروری ہے:

أ. اس کتاب میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کے سکوت اور آپؑ کی خاموشی کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کا مطلب امیرالمؤمنین علیہ السلام کا مخالفوں کے خلاف قیام اور حکومت حاصل کرنے کے لیے عملی اقدام نہ کرنا ہے۔ بصورت دیگر، مختلف مواقع اور مناسب مقامات پر امام علیہ السلام نے شکوے کا اظہار کرتے ہوئے موجودہ صورت حال کے بارے میں اپنی شکایت درج کی ہے اور اپنے بیانات و طرز عمل سے خلفائے وقت سے اپنی ناراضگی کا جابجا اظہار کیا ہے۔ امیرالمؤمنین علیہ السلام کی ان تمام فریادوں کا ذکر اس کتاب میں نظر آئے گا۔

ب. اس کتاب میں ہمارا بنیادی مقصد امیرالمؤمنین علیہ السلام کی حقانیت کے اثبات کی بحث نہیں ہے بلکہ ہم نے **رضایت کے مفروضے** کو غلط ثابت کرنے کے لیے ثبوت فراہم کیے ہیں۔ لہذا، اس بحث میں، ہم نے امیرالمؤمنین علیہ السلام کی امامت و خلافت کے شواہد و نصوص پر گفتگو نہیں کی ہے، اگرچہ بعض دلائل کے بارے میں بحث کرتے ہوئے جیسے: آیت ولایت، آیت اولوالامر اور کچھ احادیث جیسے: حدیث غدیر اور حدیثِ منزلت؛ امامت

و خلافت امیرالمؤمنین علیہ السلام پر موجود شواہد کا ذکر کیا ہے جو کہ شیعہ عقائد کے علاوہ تمام تر دوسروں کے عقیدوں کی بنیادوں کو ہلا کر اکھاڑ پھینکنے کے لیے کافی ہے ساتھ ہی **رضایت کے مفروضے** کا جائزہ لیتے ہوئے شیعہ عقائد پر جو اُوچھے اور سستے قسم کے شبہات واعتراضات کیے گئے ہیں ان کا بھی قلع قمع کر دیا گیا ہے۔

دوسری طرف، یہ خیال بھی موجود ہے کہ **رضایت کے مفروضے** کے حامی یہ دعویٰ کریں کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام کی خلافت کے بارے میں اگر یہ قبول بھی کر لیا جائے کہ اس پر شواہد و نصوص موجود ہیں، تب بھی آپؑ کے بیانات اور طرز عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے حق کو چھوڑ دیا تھا اور دوسروں کی حکمرانی کو تسلیم کر لیا تھا اور اس پر راضی ہوگئے تھے، اس لیے شیعوں کو بھی اپنے امام کی پیروی میں اختلافات کو ایک طرف رکھتے ہوئے اہل تسنن کے خلفاء کو قبول کر لینا چاہیے۔

لہذا خود امام علیہ السلام کے بیانات کو ان کی اپنی حقانیت وصداقت میں بطور ثبوت پیش کرتے ہوئے اور جو امیرالمؤمنین علیہ السلام کا حق غصب کیا گیا اس کام کو باطل قرار دیتے ہوئے ہم نے امیرالمؤمنین علیہ السلام کے قول اور طرز عمل میں پائے جانے والے بظاہر دو طرح کے پہلوؤں کا ٹھوس جواز پیش کیا ہے اور اس تہمت اور الزام کا پوری طرح سے صفایا کر دیا ہے کہ شیعہ عقائد ان کے الٰہی رہنماؤں کے طرز عمل اور بیانات کے خلاف اور منافی ہیں۔

قابل ذکر ہے کہ فٹ نوٹ میں اہل تسنن کی کتابوں سے جو ثبوت پیش کیے گئے ہیں وہ محض شواہد کے طور پر اپنی بات کی تائید کے لیے لائے گئے ہیں اور بعض جگہوں پر ان کا استعمال تنازعے کے حل کے لیے کیا گیا ہے تاکہ مخالفین کو شکوہ وشکایت کا موقع نہ ملے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، اس کتاب کا بنیادی مقصد شیعہ عقائد میں کسی بھی قسم کے عدم تضاد کو ظاہر کرنا اور ان میں کسی

بھی قسم کے عدم اختلاف کو واضح کرنا ہے کہ شیعہ عقائد پوری طرح سے مزاجِ اسلام کے ساتھ ہماہنگ ہیں اور اسلام کے عقائد وہی ہیں جو شیعوں کے ہیں۔

ج. پچھلے نکتے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، شواہد و دلائل پیش کرنے میں ہم نے انھی کتابوں کے حوالے بطور ثبوت پیش کیے ہیں جن سے، **رضایت کے مفروضے** کو ثابت کرنے کے لیے مخالفین نے مدد لی ہے تاکہ اختصار کی رعایت کے ساتھ خود مخالفوں کی کتابوں سے ہی امیر المؤمنین علیہ السلام کی حقانیت کا ثبوت خود امیر المؤمنین علیہ السلام کی ہی زبانی فراہم کیا جاسکے۔اسی کے ساتھ مخالفین کے ذریعے علمی معیارات کی عدم پابندی بھی واضح ہو جائے، لہٰذا، دوسرے باب میں، ہم نے نہج البلاغہ کے خطبات اور خطوط کا عمومی طور پر جائزہ لیتے ہوئے بعض ایسی روایات کی طرف اشارہ کیا ہے جنھیں ہمارے مخالف افراد بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔

د. **رضامندی کے مفروضے** کے جائزے میں دو اہم عنوانات بھی موجود ہیں۔ ایک امیر المؤمنین علیہ السلام (اور دوسرے ائمہ علیہم السلام) کی اپنے زمانے کے حکمرانوں سے بیعت اور دوسرے امیر المؤمنین علیہ السلام کا شوریٰ میں شریک ہونا اور اس کا حوالہ دینا (جیسے: نہج البلاغہ کا خط نمبر ٦)۔ چونکہ ان دو موضوعات پر مزید مفصل گفتگو کی ضرورت ہے، لہٰذا ہم اس سلسلے کی اگلی جلدوں میں الگ سے اور مفصل طریقے سے اس پر ہونے والے شکوک و شبہات کی جانچ کو مؤخر کرتے ہیں، اس کتاب میں ہم صرف ان شکوک و شبہات پر بحث و مباحثہ اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں جو اس وہم کو پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ امیر المؤمنین علیہ السلام اپنے آپ کے لیے خلافت کو الٰہی حق نہیں سمجھتے تھے اور غاصب حکمرانوں کی حکومت کی تائید کرتے تھے۔

اسی کے ساتھ ہم امیرالمؤمنین علیہ السلام اور دوسرے ائمہ علیہم السلام کے مابین مختلف خلفاء کے درمیان ذاتی اور ممکنہ طور پر خاندانی تعلقات (جیسے ان کے بچوں کے مابین شادی بیاہ یا خلفائے جور کو دیے گئے ان کے بعض مشوروں اور اسی طرح کی دوسری چیزوں) کے بارے میں پائے جانے والے شکوک و شبہات کا بھی ایک اور دوسری جلد میں جائزہ لیں گے۔

المختصر یہ کہ اس کتاب میں ہم نے امیرالمؤمنین علیہ السلام کی خلافت غصب کیے جانے کے موضوع پر اپنی ساری توجہ مبذول رکھی ہے اور ہمارا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام کے نقطۂ نظر سے جو کچھ بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد پیش آیا، وہ خلافت کے ان کے الٰہی حق کو غصب کرنا تھا اور ان کے قول و فعل سے اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے پتہ چلتا ہو کہ آپ کا حق غصب کرکے آپ پر ظلم رَوا رکھنے والوں سے آپ راضی رہے ہوں۔ آپؑ کی مظلومیت کی انتہاء یہ ہے کہ برسرِاقتدار آنے کے بعد بھی آپ کی مظلومیت میں کمی واقع نہیں ہوئی اور آپؑ کو کہنا پڑا:

«مَا زِلتُ مَظلوماً مُنذُ قَبَضَ اللهُ رَسُولَهُ حَتّى يَومِ النّاسِ هٰذا»[1]

جب سے اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا سے اٹھایا، مجھ پر ہمیشہ ظلم ہوتا رہا ہے۔

---

(1) شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید ۹/۳۰۶ اور اسی سے مشابہ بیان: بحار الانوار ۲۸/۳۷۳، اہل سنت کی کتابوں کے حوالے سے۔

مقدمہ

"تقابلی امامت" کی بحث کے ذیل میں امامت کے نظریے کو پیش کرتے ہوئے ہم نے شیعہ اور اہلسنت کے نظریات کی وضاحت کی اور واضح کیا کہ اہل تسنّن کے مطابق رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امامت اور خلافت کا مطلب ہے؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی معاشرے کی حکمرانی اور جو بھی اس مقام کو حاصل کرلے لوگوں کے لیے اس کی اطاعت کرنا اور اسے اپنا امام ماننا ضروری ہے لیکن شیعہ عقیدے کے مطابق، امام وہ ہے جو خداوند متعال کی طرف سے مقرر ہو اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے ولایتِ تشریعی اور واجب الاطاعت منصب پر فائز ہوا ہو اور پھر ایسی صورت میں اس کے احکام کی اطاعت ہر ایک کے لیے لازم اور واجب ہوجاتی ہے۔

اہل تشیع کے نزدیک، اسلامی معاشرے کی حکمرانی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمۂ طاہرین علیہم السلام کی ولایت تشریعی[1] کا ہی ایک حصہ ہے اور ائمہ علیہم السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امت پر حکومت کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اور خلیفہ ہیں لیکن جو کچھ بھی

---

(1) ولایت تشریعی سے مراد وہ اسلامی اور قانونی حاکیت و سرپرستی ہے، جو کبھی محدود پیمانے پر ہوتی ہے جیسے چھوٹے بچے پر باپ اور دادا کی ولایت اور کبھی وسیع پیمانے پر ہوتی ہے جیسے حکومت اور اسلامی ملک کے نظم و ضبط میں حاکم شرعی کی ولایت۔

ائمہ علیہم السلام کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وراثت میں ملا ہے وہ امت کی حکمرانی تک ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ جس طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت صرف حکومتی امور سے ہی وابستہ نہیں تھی اسی طرح ائمہ علیہم السلام بھی امرِ ولایت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ ہونے کے ساتھ ہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ دوسرے فرائض میں بھی ان کے وارث اور خلیفہ ہیں۔

ایک عام عنوان کے تحت کہا جائے تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ائمۂ معصومین علیہم السلام قرآنی آیات اور اسلام کے احکام و معارف کی تعلیم و تفسیر میں پیغمبرِ عظیم الشان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین ہیں۔ یہ اہم بات ان دوسری خصوصیات کے علاوہ ہے جن پر شیعہ اپنے ائمہ کے سلسلے میں عقیدہ رکھتے ہیں؛ کچھ خصوصیات جیسے: الٰہی علم، عصمت، ولایتِ تکوینی اور کچھ دوسری خصوصیات۔ مختصراً یہ سمجھ لیجیے کہ شیعوں کا ماننا ہے کہ امتِ مسلمہ میں (اور حتیٰ کہ تمام مخلوقات میں) خداوند متعال کے کچھ منتخب بندے ہیں جنھیں اللہ رب العزت نے بے شمار فضائل اور خوبیاں عطا کی ہیں اور اپنے بندوں کی رہنمائی اور ہدایت کی ذمہ داری انھیں سونپی ہے۔ اللہ کے ان چنندہ بندوں میں سب سے پہلے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور پھر ان کے برحق جانشین ائمۂ معصومین علیہم السلام ہیں جو کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دین و دنیا میں مادی اور معنوی کاموں میں انفرادی اور سماجی سبھی قسم کی ذمہ داریوں میں امت کی ہدایت و رہبری کے ذمہ دار ہیں۔ لوگوں پر اللہ کی جانب سے فرض کر دیا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کے برحق اوصیاء کی طرف رجوع کریں اور اپنی دنیا و آخرت کی ہدایت و کامیابی کو ان سے حاصل کریں اور ان کے سامنے پوری طرح سے سرِ تسلیم خم رکھیں۔ یہ عظیم ہستیاں مخلوقات میں خدا کی حجت اور زمین پر اس کی امین ہیں۔

شیعہ عقائد میں ایک بہت اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ امام کا امامت کے منصب پر فائز ہونا اس لحاظ سے لوگوں کے لیے ثمر بخش ہے کہ لوگ خود امام کی طرف رجوع کرکے اپنی ذمہ داریوں کو

سمجھیں، دوسرے لفظوں میں؛ اللہ رب العزت اپنے منتخب کردہ لوگوں کو بطور ائمہ متعارف کروانے کے ساتھ ہی اپنے بندوں کو بھی حکم دیتا ہے کہ وہ ان کے پرچم تلے آجائیں اور ان سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کریں۔ امام اپنی امامت کے لحاظ سے خدا کی حجت اور مرجعِ خلائق ہے اور خدا نے امام کی تقرری کے ذریعے لوگوں کو ہدایت حاصل کرنے کا مقام بتا دیا ہے اور ان کی نیک بختی کو یقینی بنانے کی جگہ کا تعین کر دیا ہے۔

رسول اور امام کے مابین امتیازات میں سے ایک موضوع یہ ہے کہ رسول اپنی رسالت کے لحاظ سے تبلیغ پر مامور ہوتا ہے چاہے لوگ اس کی بات پر کان نہ دھریں اور اس کے پاس نہ آئیں لیکن امام اپنی امامت کے لحاظ سے ایک مرجع اور رہنما ہے اور یہ لوگوں پر فرض ہے کہ اس کی طرف رجوع کریں اور اس کی تقلید و پیروی کریں۔ ایسا نہیں ہے کہ امام لوگوں کے پاس جا کر انہیں اپنے پاس بلانے کا پابند ہو۔

لہٰذا امام باقر علیہ السلام کے فرمان کے مطابق:

«مَثَلُ الْاِمامِ مَثَلُ الْكَعْبَةِ، اِذْ يُؤْتىٰ وَلا يَأْتِي»[1]

امام کی مثال کعبے کی ہے کہ لوگ اس کے پاس آتے ہیں وہ کسی کے پاس نہیں جاتا ہے۔

کعبہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں لوگ حج اور دیگر اعمال و فرائض انجام دینے خود جاتے ہیں۔ اللہ نے خانہ کعبہ کو معیّن کر کے اسے مرجع قرار دیا ہے تاکہ لوگ وہاں جائیں اور اپنے فرائض کو انجام دیں نہ یہ کہ چونکہ لوگوں پر حج واجب ہے، لہٰذا خود کعبہ ان تک چل کر جائے اور خود کو لوگوں کے سامنے پیش کرے کہ لو میں کعبہ ہوں میرا طواف کر لو!

---

[1] بحار الانوار ۳۵۸/۳۶، ح ۲۲۶ اور اسی سے ملتی جلتی دوسری احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی امیر المومنین علیہ السلام کے لیے: گزشتہ حوالہ: ۴۸۳/۲۲۔ گزشتہ حوالہ: ۳۸۰/۳۳۔ گزشتہ حوالہ: ۳۸/۳۹، ۴۸۔ گزشتہ حوالہ: ۷۸/۴۰، گزشتہ حوالہ: ۱۵/۹۰۔ وسائل الشیعہ، حر عاملی ۴۰۲/۴، ح ۵۲۱۳۔ احتجاج، طبرسی ۱۸۹/۱۔

امام بھی مرجع ہے اور لوگ اس کی طرف رجوع کرنے کے پابند ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ امام کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کے پیچھے پیچھے جائے اور انھیں اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے مدعو کرے۔[1] لہٰذا، امامت کے منصب کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی اور ہدایت اور یہاں تک کہ امامت سے متعلق امور و معاملات کو سمجھانے، انھیں عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی اقدام کرے، جیسے: حکمرانی اور برسرِاقتدار آنے کے لیے اپنی طرف سے کوئی تحریک چلائے۔

اس کے نتیجے میں ہمارے پاس امام کے فرائض کا تعین کرنے کے لیے پہلے سے کوئی معیار موجود نہیں ہے۔ اس بنیاد پر ہم امام کے فرائض کی تفصیل پہلے سے ہی تیار نہیں کرسکتے ہیں اور ائمہ علیہم السلام کی کارکردگی کو اپنے معیار کے مطابق ناپنے کی کوشش تک نہیں کرسکتے یا ان کے سلوک اور ردعمل کا کوئی نامناسب جواز اپنے موجودہ طرزِ عمل کو معیار بناتے ہوئے پیش نہیں کرسکتے۔

مثال کے طور پر اگر کسی بھی سطح تک جاتے ہوئے خدا کے دین کی تبلیغ کرنا امام کے فرائض میں -اس کی امامت کے حصے میں سے نہیں- مان لیا جائے تو پھر امام کا یہ بیان کسی بھی طرح مناسب معلوم نہیں پڑتا:

«قَالَ عَلِيُّ بْنُ الْحُسَيْنِ (عليهما السلام) عَلَى الْأَئِمَّةِ مِنَ الْفَرْضِ مَا لَيْسَ عَلَى شِيعَتِهِمْ وَ عَلَى شِيعَتِنَا مَا لَيْسَ عَلَيْنَا أَمَرَهُمُ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ أَنْ يَسْأَلُونَا قَالَ: ﴿فَسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لا تَعْلَمُونَ﴾ فَأَمَرَهُمْ

---

[1] احتجاج ۱/۱۸۸ اور ۱۸۹، باب احتجاجہ علی الخوارج اور کتاب سلیم/۳۰۲، ح۲۵ اور بحار الانوار ۲۹/۴۳۵، زرارہ سے منقول، ۴۴۲ ہشام بن حکم سے منقول۔

أَنْ يَسْأَلُونَا وَ لَيْسَ عَلَيْنَا الْجَوَابُ إِنْ شِئْنَا أَجَبْنَا وَ إِنْ شِئْنَا أَمْسَكْنَا.»[1]

[حضرت امام رضا علیہ السلام نے بیان کیا کہ] حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا: "ائمہ پر کچھ ایسی چیزیں واجب ہیں جو ان کے ماننے والوں پر واجب نہیں ہیں اور ہمارے شیعوں پر کچھ ایسی چیزیں واجب ہیں جو ہم پر عائد نہیں ہوتیں، خدا نے انھیں حکم دیا ہے کہ ہم سے سوال کریں اور ارشاد فرمایا: « اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے دریافت کرو » اس بنا پر انھیں حکم ہے کہ وہ ہم سے دریافت کریں البتہ جواب دینا ہم پر واجب نہیں ہے اگر ہم چاہیں تو جواب دیں اور اگر نہ چاہیں تو جواب نہ دیں۔"

اس بیان سے واضح ہوجاتا ہے کہ امام علیہ السلام دینی امور میں لوگوں کے جوابات فراہم کرنے کو اپنی مرضی سے - جو ان کی خصوصی شان اور حق ہے - متعلق سمجھتے ہیں، وہ اپنی صوابدید کے تابع ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو سوال کرنے والوں کے جواب دیں یا اپنی کسی مصلحت کی بنیاد پر جواب نہ دیں یا ایک دوسری روایت کے مطابق لوگوں کی عقل و فہم کی سطح کے مطابق مختلف افراد کے مختلف جوابات دیتے ہیں۔

---

[1] کافی ۱/۲۱۲، کتاب الحجۃ، باب أنّ أھل الذکر ھم الائمۃ، ح۸ اور اسی سے مشابہ دوسری احادیث اسی باب میں اور بصائر الدرجات میں، صفار/۳۸، جزء اوّل، باب ۱۹۔

یہاں یہ بات واضح ہے کہ ہمارے پاس ایسی کوئی پیشگی دلیل نہیں ہے جس کے ذریعے امام پر جواب کے وجوب کو ثابت کیا جاسکے۔ لہذا ہماری روایتی نصوص میں، امام کی اس استثنائی اور انفرادی حیثیت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: لوگوں کے امور کا امام کو تفویض ہونا۔ (1)

اصولی طور پر، بغیر قید و شرط کے مکمل طور پر اطاعت کا فرض اور وجوب اور ساتھ ہی لوگوں کے تمام امور (اور دین) کا امام کے سپرد ہونے کا تقاضا اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اگر کسی کی اطاعت بغیر کسی قید و شرط کے واجب ہوجاتی ہے اور اگر لوگوں کے امور کسی شخص کے سپرد کردیے گئے ہیں تو اب اس کے ماتحت افراد کی جانب سے اس کے لیے اصول و ہدایات تیار کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔ جب کسی فرد کی ذاتی صوابدید قابل قبول ہوتی ہے، تو ہم اپنی طرف سے اس کے طرز عمل، اس کے بیانات اور اس کے کسی بھی کام کے لیے کوئی بھی معیار اور پیمانہ نہیں بنا سکتے بلکہ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس کی طرف رجوع کریں، جو بھی وہ حکم دے اس کی تعمیل کریں اور وہ جو کچھ بھی انجام دے اسے صحیح اور بجا سمجھیں۔

ہم پھر اس بات کی یاددہانی کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا سارا زور یہاں اس بات پر ہے کہ ہمارے پاس امام کے فرائض کو متعین کرنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کے طرزِ عمل اور بیانات کے وجوب یا حرمت کے تعین کا کوئی معیار ہے لیکن یہ ایک جدا معاملہ ہے خدا کے بندوں میں سے ایک ہونے کی حیثیت سے امام کے بھی کچھ فرائض ہیں۔ لہذا امام جو کچھ بھی کرتا ہے وہ ہمارے لیے قابل قبول بلکہ لازم القبول ہے۔ اگر امام یہ بیان کرتا ہے کہ یہ فعل یہاں پر میرے لیے واجب تھا یا میں نے اپنے اختیار سے یہ کام کیا ہے تو یہ خود امام کا کلام ہے جو اس کے عمل کا سبب بتارہا ہے اور اس کی تشخیص کے لیے ہمارے پاس پہلے سے طے شدہ کوئی معیار نہیں ہے۔

---

(1) کافی ۱/۲۶۵، کتاب الحجۃ، باب التفویض الی رسول اللہ والی الائمۃ فی أمر الدین اور بحار الانوار ۲۵/۳۶۱-۳۵۰۔

حکومت کے امور میں بھی یہی حال ہے۔ ہم پر یہ بات واضح نہیں ہے کہ امام اپنی ولایت کو کسی خاص علاقے میں حکومت کے عنوان سے تشکیل دینے پر مامور ہے یا نہیں؟ بلکہ امام چونکہ امام ہے اس لیے، لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں، اسے اپنا مقتدیٰ بنائیں اور اس کے احکامات کی تعمیل کریں۔ اس لیے ممکن ہے کہ امام پہلے ہی مرحلے میں حکومت تشکیل دے یا لوگوں کے عمومی استقبال کا منتظر رہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تشکیلِ حکومت کے لیے لوگوں کے خیر مقدم کے باوجود وہ حکومت تشکیل نہ دے۔ کبھی کسی مقام پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرکے آگے بڑھے اور کہیں کسی مقام پر اپنی جان کی حفاظت کو ضروری سمجھے۔

شیعوں کے نزدیک ائمۂ کرام علیہم السلام کا ہر قسم کا عمل خدا کی خوشنودی اور حکمت کے مطابق ہوتا ہے اور ہر امام اپنے اور اپنے خدا کے مابین کچھ ذمہ داریاں رکھتا ہے جنھیں وہ انجام دیتا ہے۔[1] عین ممکن ہے کہ امام ظاہر پر عمل کرنے کا پابند ہو یا دوسرے مسلمانوں کی ذمہ داری کے علاوہ، اسے کوئی خصوصی ذمہ داری تفویض کی گئی ہو۔ لہذا ہمارے پاس امام کے افعال کی حکمت کو سمجھنے کا کوئی راستہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ امام خود اپنے افعال کی تشریح بیان کرے۔ اگر امام نے اپنے عمل کی حکمت کا اظہار کر دیا تو ہمیں اسے من وعن قبول کر لینا چاہیے اور اگر اس نے ہم سے اپنے کسی کام کا جواز یا اس کے انجام دینے کی حکمت بیان نہیں کی تب بھی ہمارے پاس اس عمل کو قبول کرنے اور اس کی حقانیت پر یقین رکھنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔[2] ائمہ کی عصمت پر یقین اور ان کا الٰہی علم سے فیضیاب ہونا یہ ساری چیزیں وجہ بنتی ہیں کہ ہم ائمہ کے پوری طرح سے فرمانبردار اور ان کے سامنے

---

(1) علل الشرائع ۲۰۴/۱، باب ۱۳۵، ح ۱ اور کافی ۲۸۰/۱، باب أن الائمۃ لم یفعلوا... اور امالی، طوسی ۴۴۱/۱، المجلس الخامس عشر، ح ۴۷ اور غیبت، نعمانی/۵۲، باب فی أن الامامۃ تکون باختیار اللہ، ح ۳ اور بحار الانوار ۱۹۲/۳۶، ح ۱۔

(2) گزشتہ حوالہ ۲۴۹/۱، باب ۱۵۹، ح ۱ اور ۲ اور بحار الانوار ۴۴/۱، ح ۱ اور ۲۔

سر تسلیم خم رکھیں، ان کے طرزِ عمل اور ان کی باتوں پر پوری عقیدت کے ساتھ مکمل یقین رکھیں اور ان کے عمل کو صحیح اور درست سمجھیں اور اس میں خدا کی خوشنودی کو یقینی مانیں۔

اس اہم مقدمے پر دھیان رکھنا ہمیں ائمہ کرام علیہم السلام اور خصوصاً امیر المؤمنین علیہ السلام کے طرزِ عمل اور ان کے طرزِ حیات کو سمجھنے اور اس کی جانچ پڑتال میں بہت زیادہ مدد کرے گا۔ شیعوں کے عقائد کا بنیادی اصول اور ان کے عقائد کی سب سے پہلی اور بنیادی اینٹ معصوم امام کے قول و فعل کی حقانیت اور پوری طرح سے اس کی اطاعت پر ہی استوار ہے اور شیعہ عقائد کی سب سے بنیادی چیز یہی عقیدہ ہے کہ معصوم امام کا قول و فعل پوری طرح سے بغیر کسی شائبے کے حق ہے اور اس کا پوری طرح سے تابع دار رہنا واجب و ضروری ہے۔ اس لیے ائمہ علیہم السلام کی جانب سے انجام دیے گئے کاموں کی اگر کوئی وضاحت یا تشریح ان کی جانب سے ہم تک نہیں پہنچتی ہے تو ان کی طرف خطا یا غلطی کی نسبت دینا یا یہ کہنا کہ ان کا کام شریعت کے خلاف ہے، ناقابل معافی جرم ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہمارے ہاتھوں میں جس قدر بھی قطعی اور ٹھوس شواہد ہوں ان کو بروئے کار لاتے ہوئے اولیائے خدا کے عمل کو صحیح مقام پر رکھیں، کسی بھی قسم کی الزام تراشی سے پرہیز کریں، کسی بھی بلا جواز گمان پردازی اور ہوا میں تیر چلانے سے گریز کریں اور جس بات کا علم ہمیں نہ ہو، اسے خود اللہ رب العزت اور ولایت الٰہی کے مالکوں کی طرف پلٹا دیں۔

ہم نے جو کچھ بھی اس کتاب میں بیان کیا ہے وہ اس بات کی وضاحت ہے کہ تاریخی حقائق روشن کرتے ہیں کہ ائمہ کے ایسے سارے فرائض جن کا تعلق لوگوں سے تھا، وہ سارے کے سارے فرائض ائمہ علیہم السلام کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارثت میں حاصل ہوئے تھے، اہل بیت علیہم السلام کے دشمنوں سے جتنا ممکن ہو سکا، انھوں نے اس حق پر قبضہ کیا اور ان کا حق ان سے غصب کر لیا گیا۔ جیسا کہ اس کتاب کی پہلی جلد میں "تقابلی امامت" کی بحث کرتے ہوئے اس جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ ائمہ علیہم السلام کے حقوق غصب کرنے کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے میں ان کے کاموں پر پابندی لگائی

گئی، غاصبانِ حکومت ان کی مَسندِ حکومت پر خود بیٹھ گئے، امت کی ہدایت کا جو کام ائمہ علیہم السلام کے سپرد تھا اس مَسند کو انھیں دینے کے بجائے اس پر خود بیٹھے رہے اور ائمہ علیہم السلام اور لوگوں کے درمیان فاصلہ پیدا کر دیا کہ لوگ ان تک پہنچ ہی نہ پائیں اور مسند حکومت پر ناجائز قبضہ جمانے والوں نے لوگوں کی رسائی ان تک دشوار بنادی۔



پہلا باب

معرفت کا نور گمراہی کے اندھیرے میں

اس باب میں ہم ائمہ علیہم السلام کے عظیم علمی مقام و منزلت کے ذکر کے ساتھ ہی ان کے وارثِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کے علاوہ یہ بھی بیان کریں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امیر المؤمنین علیہ السلام کے الٰہی حق کو غصب اور اس پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں دشمنوں کا سب سے پہلا قدم یہ تھا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے ذریعے جمع کردہ قرآن کو قبول نہیں کیا گیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس کام کا ذمہ آپ کو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سونپا تھا اور اگر ایسا ہو جاتا اور امیر المؤمنین علیہ السلام کے جمع کردہ قرآن مجید کو قبول کر لیا جاتا تو اسلام کے صحیح معارف اور اس کی درست تعلیمات کے ساتھ ہی معلمِ قرآن کے ہاتھوں جمع ہوئے قرآن مجید تک امتِ مسلمہ کو رسائی مل جاتی۔

اگلے مرحلے میں احادیثِ نبوی کے بیان اور تحریر (نقل و کتابت) کی ممانعت کے حکم کو نافذ کرتے ہوئے اگلے قدم کے طور پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ کے حق کو ضائع کیا گیا اور پھر تیسرے مرحلے میں قصہ گویوں کے لیے فضا ہموار کر کے دین کو فروغ بخشنے والے اور اس کی صحیح ترویج و تبلیغ کرنے والے اکلوتے باصلاحیت شخص کو معاشرے سے ہٹا دیا گیا اور اسے خانہ نشینی پر مجبور کر دیا گیا۔

اس باب کے آخر میں ہم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ایسی صورتحال کے باوجود معاشرے کے مذہبی اور ثقافتی امور میں امیر المؤمنین علیہ السلام (اور دیگر ائمہ علیہم السلام) کی شمولیت نہ صرف معاشرے کے حکمرانوں سے راضی ہونے کی علامت نہیں ہے بلکہ اپنے حق کے کسی نہ کسی پہلو کو ثابت کرنے کے لیے ہے، ساتھ ہی مذہب کے تحفظ اور صحیح احکام و معارف کو پھیلانے کے لیے بھی اپنی طاقت بھر ایک کوشش ہے۔

سبق ۱

غصبِ خلافت اور تعلیماتِ دین کی تشریح-۱

ائمہ علیہم السلام کے فرائض میں شامل اس مقام و منزلت کے غصب کیے جانے کی بحث میں اترنے سے پہلے مقدمے کے طور پر ہم ائمۂ کرام علیہم السلام کے علمی مقام و منزلت اور بالخصوص امیرالمؤمنین علیہ السلام کے علمی مرتبے کا ایک مختصر جائزہ لیں گے اور ان عظیم ہستیوں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل علمی وراثت کی خصوصیات پر توجہ دیں گے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام علوم نبوی کے وارث

حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کی ایک سب سے اہم خوبی اور انھیں سے مخصوص خصوصیات میں سے ایک، ان کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم سے علوم الٰہی کا مالک ہونا ہے۔ امیرالمؤمنین علیہ السلام اور دیگر اماموں علیہم السلام کی علمی وراثت کو دو نقطۂ نظر سے دیکھا جاسکتا ہے: ایک یہ کہ ان عظیم ہستیوں نے خود دعویٰ کیا ہے کہ آیاتِ الٰہی کا جو کچھ علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھا وہ انھیں سونپ دیا گیا ہے۔

سارے کے سارے علوم انھیں ودیعت فرمادیے گئے ہیں جیسے: علم تاویل و تنزیل، ظاہر و باطن، محکم و متشابہ، ناسخ و منسوخ، حلال و حرام اور قرآن سے متعلق ہر چیز۔

«... فَقَالَ: [امیر المؤمنین (علیہ السلام)] وَيْلَهُمْ إِنِّي لَأَعْرِفُ نَاسِخَهُ وَ مَنْسُوخَهُ وَ مُحْكَمَهُ وَ مُتَشَابِهَهُ وَ فَصْلَهُ مِنْ وَصْلِهِ وَ حُرُوفَهُ مِنْ مَعَانِيهِ وَ اللَّهِ مَا حَرْفٌ نَزَلَ عَلَى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ إِلَّا وَ أَنَا أَعْرِفُ فِيمَنْ أُنْزِلَ وَ فِي أَيِّ يَوْمٍ نَزَلَ وَ فِي أَيِّ مَوْضِعٍ نَزَلَ وَيْلَهُمْ أَ مَا يَقْرَءُونَ ﴿إِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَ مُوسَىٰ﴾ وَ اللَّهِ عِنْدِي وَرِثْتُهَا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ......»[1]

....امیر المؤمنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ان پر افسوس! بلاشبہ میں قرآن کے ناسخ و منسوخ سے، اس کے محکم اور متشابہ سے، اس کے فصل اور وصل سے، اس کے حروف اور اس کی مراد سے سب سے زیادہ آگاہ ہوں اور انھیں بہتر ڈھنگ سے جانتا ہوں۔ خدا کی قسم! ایسا کوئی حرف نہیں جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوا ہو اور میں اسے اچھی طرح نہ جانتا ہوں کہ یہ کس کے بارے میں نازل ہوا؟ کس دن نازل ہوا؟ اور یہ کس مقام پر نازل ہوا؟ وائے ہو ان پر! کیا ان لوگوں نے نہیں پڑھا کہ «یقیناً یہ بات پہلے صحیفوں میں بھی ہے، یعنی ابراہیم (ع) اور موسیٰ (ع) کے صحیفوں میں» خدا کی قسم! [وہ] میرے پاس ہے اور میں نے اسے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وراثت میں پایا ہے...۔

---

[1] بصائر الدرجات/۱۵۵، الجزء الثالث، باب ۱۰، ح ۳ اور بحار الانوار ۸۹/۸۷، باب أنّ للقرآن ظهراً و بطناً، ح ۲۳ اور اس سے مشابہ مزید روایات اسی باب میں مذکور ہیں۔

دوسرے یہ کہ ائمہ علیہم السلام نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام علوم کو وراثت میں پایا ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبۂ غدیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

«مَعَاشِرَ النَّاسِ! مَا مِنْ عِلْمٍ إِلاَّ وَ قَدْ أَحْصَاهُ اَللَّهُ فِيَّ وَ كُلُّ عِلْمٍ عَلِمتُهُ [عُلِّمْتُهُ] فَقَدْ أَحْصَيْتُهُ فِي اَلْمُتَّقِينَ مِنْ وُلْدِهِ وَ مَا مِنْ عِلْمٍ إِلاَّ وَ قَدْ عَلَّمْتُهُ عَلِيّاً وَ هُوَ اَلْإِمَامُ اَلْمُبِينُ ...»[1]

اے لوگو! ایسا کوئی علم نہیں ہے جسے اللہ نے میرے وجود میں چُن چُن کر نہ رکھا ہو اور ہر وہ علم جسے میں جانتا ہوں، اسے میں نے علی کی پرہیزگار اولاد کو سونپ دیا ہے اور ایسا کوئی علم نہیں جس کی تعلیم میں نے علی کو نہ دی ہو اور وہ امام مبین ہے...۔

امیر المؤمنین علیہ السلام بھی کچھ اسی طرح کے جملے ارشاد فرماتے ہیں:

«... أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ (صلی الله علیه و آله) أَسَرَّ إِلَيَّ فِي مَرَضِهِ مِفْتَاحَ أَلْفِ بَابٍ فِي الْعِلْمِ يَفْتَحُ كُلُّ بَابٍ أَلْفَ بَابٍ وَ لَوْ أَنَّ الْأُمَّةَ بَعْدَ قَبْضِ رَسُولِ اللَّهِ (صلی الله علیه و آله) اتَّبَعُونِي وَ أَطَاعُونِي لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ.»[2]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی علالت کے دوران (جو آپ کی رحلت پر منتج ہوئی) مجھے علم کے ہزار دروازوں کی کلید عطا کی، جن میں سے ہر دروازہ، دوسرے ہزار دروازے کھولتا ہے۔ اگر امت کے لوگ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد میری اطاعت

---

(1) احتجاج ۱/۷۴، حدیث الغدیر، مزید حوالوں تک رسائی کے لیے رجوع کریں: اسرار غدیر، محمد باقر انصاری۔

(2) احتجاج ۱/۲۲۳/احتجاجہ علی المہاجرین والانصار۔ اور اسی سے مشابہ: خصال، صدوق ۲/۶۴۲، باب علّم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیاً علیہ السلام الف باب... اور بحار الانوار ۲۲/۳۶۱-۳۶۵۔ اور گزشتہ حوالہ ۴۰/۱۲۷-۲۰۰۔

کرتے تو (بے انتہا، مادّی و روحانی برکتیں) اپنے سروں اور پیروں کے نیچے سے حاصل کرتے۔

اسی طرح امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

«لَمْ يَتْرُكِ ٱلْأَرْضَ بِغَيْرِ عَالِمٍ يَحْتَاجُ ٱلنَّاسُ إِلَيْهِ وَ لاَ يَحْتَاجُ إِلَيْهِمْ يَعْلَمُ ٱلْحَلاَلَ وَ ٱلْحَرَامَ فَقُلْتُ جُعِلْتُ فِدَاكَ بِمَا ذَا يَعْلَمُ قَالَ وِرَاثَةٌ مِنْ رَسُولِ ٱللَّهِ وَ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ .»[1]

اللہ نے زمین کو بغیر عالم کے یونہی نہیں چھوڑ دیا ہے، ایک ایسا عالم جس کے لوگ محتاج ہیں اور وہ ان کا محتاج نہیں ہے جو حلال و حرام کا علم رکھتا ہے۔ (راوی کہتا ہے) میں نے کہا: میں آپ پر قربان جاؤں؛ کیسے اور کس طرح وہ اس علم کا مالک ہے؟ آپ نے فرمایا: اس علم کے ذریعہ جو اسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المؤمنین علیہ السلام سے وراثت میں ملا ہے۔

اللہ نے جو کچھ بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سکھایا تھا، وہ سب کا سب انھوں نے ابوالائمہ علی بن ابی طالب علیہم السلام کو سونپ دیا اور ائمہ بھی انھی کے توسط سے علم نبوی کے وارث ہوئے۔ اس طرح سے وہ تمام علوم جن کے لوگ ضرور تمند تھے، حاصل ہوئے، بالکل ویسے ہی جیسے امیر المؤمنین علیہ السلام نے فرمایا اگر لوگ اس علمِ الٰہی کے خزانے کی قدر کرتے اور اس کی حرمت و تقدس کا خیال رکھتے تو آسمان و زمین کی برکتیں ان کی جھولیوں میں آگرتیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ان کی قیمتی اور گراں بہا یادگار کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کیا گیا اور اصل منبع سے اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل نہیں کی گئیں اور خود کو تباہی و بربادی کے گڑھے میں گرا دیا گیا۔

---

[1] بحار الانوار ۲۶/ ۱۷۳، مزید اطلاع کے لیے رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۲۶/ ابواب علوم الائمۃ اور کافی / الکتاب الحجۃ، ابواب علوم الائمۃ اور بصائر الدرجات۔

امیر المؤمنین علیہ السلام اور قرآن مجید کی ترتیب و جمع آوری

امیرالمؤمنین علیہ السلام سے ان کی الٰہی خلافت کو غصب کرنے اور ان علیہ السلام کی علمی جانشینی پر غاصبانہ قبضے کے طور پر جو سب سے پہلا قدم اٹھایا گیا وہ قرآن مجید کی جمع آوری میں ان کے مقام و منزلت کو نظرانداز کرنا ہے۔ جب امیرالمؤمنین علیہ السلام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیکر مطہر کے غسل اور کفن دفن کا اپنا فرض پورا کر چکے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق قرآن مجید کو اکٹھا کرنے میں مصروف ہو گئے اور قسم کھائی کہ جب تک وہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا لیتے تب تک نماز کے علاوہ کسی اور کام کے لیے گھر سے باہر قدم نہیں رکھیں گے۔[1] وہ اپنے اس کام میں اس حد تک مشغول ہو گئے کہ ان کا الٰہی حق غصب کرنے والے مسلسل اصرار کرتے رہے اور گستاخیوں پر اتر آئے کہ کسی صورت امیرالمؤمنین علیہ السلام ابوبکر کی بیعت کر لیں لیکن آپؑ ان سب باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے قرآنِ مجید کی جمع آوری میں ہی مشغول رہے۔ جیسا کہ سلمان فارسیؓ کہتے ہیں:

«فَرَاسَلَهُمْ عَلِيٌّ أَنْ لَيْسَ إِلَى خُرُوجِي حِيلَةٌ لِأَنِّي فِي جَمْعِ كِتَابِ اللَّهِ الَّذِي قَدْ نَبَذْتُمُوهُ وَ أَلْهَتْكُمُ الدُّنْيَا عَنْهُ وَ قَدْ حَلَفْتُ أَنْ لاَ أَخْرُجَ مِنْ بَيْتِي وَ لاَ أَدَعَ رِدَائِي عَلَى عَاتِقِي حَتَّى أَجْمَعَ الْقُرْآنَ»[2]

پھر امیرالمؤمنین علیہ السلام نے ایک نامہ بَران کے پاس بھیج کر کہا کہ میں نہ نکلنے کے لیے کسی بہانے سے کام نہیں لے رہا ہوں کیونکہ میں قرآن کی جمع آوری میں مشغول ہوں جسے تم نے یونہی چھوڑ دیا ہے اور تمہاری دنیا نے تمھیں کہیں اور مشغول کر کے اس سے

---

[1] اس واقعے کی تفصیل اس کتاب کے مقصد سے جدا ہے اس لیے اس سلسلے میں مزید آگاہی کے لیے دیگر کتابوں کی جانب رجوع کیا جا سکتا ہے۔

[2] احتجاج ۱/۸۰، باب الانکار علی ابی بکر اور اسی سے مشابہ گزشتہ حوالہ ۱/۷۵، ۸۲، ۱۹۰ اور کتاب سلیم/۱۲۶، ح ۴۔

غافل کر دیا ہے۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک قرآن کو جمع نہ کر لوں گا، تب تک گھر سے باہر نہ نکلوں گا اور نہ ہی دوش پر عبا رکھوں گا۔

امیر المؤمنین علیہ السلام دوسرے مسلمانوں پر اپنی فوقیت کو بیان کرتے ہوئے اپنے فضائل میں ارشاد فرماتے ہیں:

«أَمَّا ٱلْخَامِسَةُ وَالْخَمْسُونَ: فَإِنَّ رَسُولَ ٱللَّهِ صلى الله عليه وآله قَالَ لِي سَيُفْتَتَنُ فِيكَ طَوَائِفُ مِنْ أُمَّتِي فَيَقُولُونَ إِنَّ رَسُولَ ٱللَّهِ صلى الله عليه وآله لَمْ يُخَلِّفْ شَيْئاً فَبِمَاذَا أَوْصَى عَلِيّاً؟ أَوَلَيْسَ كِتَابُ رَبِّي أَفْضَلَ الْأَشْيَاءِ بَعْدَ اللَّهِ عَزَّ وجَلَّ؟ والَّذِي بَعَثَنِي بِالْحَقِّ لَئِنْ لَمْ تَجْمَعْهُ بِإِتْقَانٍ لَمْ يُجمَعْ أَبَداً فَخَصَّنِي ٱللَّهُ عَزَّ وَجل بِذَٰلِكَ مِنْ دُونِ ٱلصَّحَابَةِ.»[1]

اور پچپنویں فضیلت یہ ہے کہ مجھ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جلد ہی میری امت کا ایک گروہ تمہارے بارے میں فتنے کا نشانہ بن جائے گا اور یہ دعویٰ کرے گا کہ خدا کے رسول نے تو اپنا کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے تو انھوں نے علی سے کس چیز کے بارے میں وصیت کر دی ہے؟ کیا میرے رب کی کتاب اللہ عزوجل کے بعد ہر چیز سے بالاتر نہیں ہے؟ اس خدا کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، اگر تم قرآن کو محکم طریقے سے جمع نہیں کرو گے تو وہ کبھی جمع نہیں ہوگا۔" اس عظیم اور سنگین معاملے کو خدا نے میرے سپرد فرمایا ہے نہ کہ دوسرے صحابہ کے۔

---

(۱) خصال ۲/۹، ابواب السبعین وما فوقہ، باب لامیر المؤمنین سبعون منقبۃ لم یشرکہ فیہا احد من الامۃ۔

امیر المؤمنین علیہ السلام کے جمع کردہ قرآن کو قبول نہ کیا جانا

امام علی علیہ السلام قرآن مجید مرتب کرنے کے بعد اسے مسجد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لے گئے اور مسلمانوں کے سامنے پیش کیا لیکن چھل کپٹ سے امیر المؤمنین علیہ السلام کی الٰہی مسند کو غصب کرنے والے افراد نے جب ایک ایسے قرآن کو دیکھا جس میں قرآنی آیات کی تفسیر و تاویل اور ہر آیت کی شان نزول درج تھی تو انھوں نے اپنی رسوائیں کو چھپانے کے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برحق خلیفہ کے اس عظیم کارنامے کو سراہنے اور قبول کرنے کے بجائے اس کا انکار کر دیا اور اسے جھٹلا دیا اور اس طرح امیر المؤمنین علیہ السلام کے مرتب کردہ قرآن کو قبول نہ کر کے اسلامی معاشرے کو کئی صدیوں تک کے لیے محرومیوں سے دوچار کر دیا۔[1]

«... فَجَمَعَهُ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ وخَتَمَهُ ثُمَّ خَرَجَ إِلَى النَّاسِ وَهُمْ مُجْتَمِعُونَ مَعَ أَبِي بَكْرٍ فِي مسْجِدِ رَسُولِ اَللّٰه فَنَادَى عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلاَمُ بِأَعْلَى صَوْتِهِ يَا أَيُّهَا اَلنَّاسُ إِنِّي لَمْ أَزَلْ مُنْذُ قُبِضَ رَسُولُ اَللّٰهِ صَلَّى الله عليه وآله مَشْغُولاً بِغُسْلِهِ ثُمَّ بِالْقُرْآنِ حَتَّى جَمَعْتُهُ كُلَّهُ فِي هَذَا اَلثَّوْبِ اَلْوَاحِدِ.»

---

[1] امیر المؤمنین علیہ السلام کے جمع اور مرتب کردہ قرآن مجید کی دو بنیادی خصوصیات تھیں: ایک یہ کہ اس کے سوروں کی ترتیب موجودہ قرآن سے مختلف تھی اور امیر المؤمنین علیہ السلام نے اسے ترتیب نزول کے لحاظ سے جمع فرمایا تھا۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید کی آیتوں کی تفسیر و تاویل اور ان کا مقصد و مراد بھی آیات کے ساتھ ہی ساتھ مندرج کر دیا گیا تھا، خاص طور پر وہ تمام توضیحات و تشریحات درج کر دی گئی تھیں جنھیں اللہ کی طرف سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمومی طور پر اور کھل کر بیان کرنے پر مامور نہیں تھے۔ رجوع فرمائیں: بیان در علوم و مسائل کلی قرآن۔ خوئی ۱/۳۵۵-۳۶۰۔

امیرالمومنین نے قرآن مجید کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور اس پر مہر لگادی۔ پھر مسجد النبی میں داخل ہوئے جہاں لوگ ابوبکر کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ تب امیرالمؤمنین علیہ السلام نے بلند آواز سے سب کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے لوگو! جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحلت فرمائی اور میں ان کے غسل سے فارغ ہوا تبھی سے قرآن کی جمع آوری میں مشغول ہوگیا یہاں تک کہ میں نے پورے قرآن کو جمع کرلیا جو اس غلاف میں موجود ہے۔

فَلَمْ يُنْزِلِ اللَّهُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ آيَةً إِلاَّ وَقَدْ جَمَعْتُهَا وَلَيْسَتْ مِنْهُ آيَةٌ إِلاَّ وَقَدْ جَمَعْتُهَا وَلَيْسَتْ مِنْهُ آيَةٌ إِلاَّ وَقَدْ أَقْرَأَنِيهَا رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وآله وَعَلَّمَنِي تَأْوِيلَهَا.

مجھ سے ایسی کوئی بھی آیت جمع کرنے سے نہیں بچی ہے جسے اللہ نے رسول اللہ پر نازل کیا ہو اور ایسی کوئی بھی آیت نہیں جسے میں نے جمع نہ کیا ہو اور ایسی کوئی آیت نہیں جس کی تلاوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے سامنے کی ہو اور اس کی تاویل سے مجھے آگاہ نہ کیا ہو۔

«ثُمَّ قَالَ لَهُمْ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلاَمُ لِئَلاَّ تَقُولُوا غَداً ﴿إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِينَ﴾ ثُمَّ قَالَ لَهُمْ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلاَمُ لِئَلاَّ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنِّي لَمْ أَدْعُكُمْ إِلَى نُصْرَتِي وَلَمْ أُذَكِّرْكُمْ حَقِّي وَلَمْ أَدْعُكُمْ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ مِنْ فَاتِحَتِهِ إِلَى خَاتِمَتِهِ. فَقَالَ عُمَرُ مَا

أَغْنَانَا مَا مَعَنَا مِنَ الْقُرْآنِ عَمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ ثُمَّ دَخَلَ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلاَمُ بَيْتَهُ.»[1]

پھر علی علیہ السلام نے ان سے کہا: تاکہ تم کل کو یہ نہ کہہ سکو کہ "ہم تو اس سے بے خبر تھے۔" پھر امیر المؤمنین نے ارشاد فرمایا: "تاکہ تم روزِ قیامت یہ نہ کہو کہ میں نے اپنی مدد کے لیے تمھیں نہیں پکارا اور اپنے حق کی تمھیں یاددہانی نہیں کرائی اور تمھیں کتابِ خدا کی طرف اس کی ابتدا سے لے کر اس کی انتہا تک دعوت نہ دی۔ یہ باتیں سن کر عمر نے آواز لگائی: ہمارے پاس جو قرآن موجود ہے، وہ تمہارے اس قرآن سے بے نیاز کرنے کے لیے کافی ہے جس کی طرف تم بلا رہے ہو! اس کے بعد امیر المؤمنین علیہ السلام اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔

اس حادثے کے بعد اور اس نقص کو دور کرنے کی اور اس خلاء کو پُر کرنے کی غرض سے حکومتی کارندوں نے مسلمانوں کے درمیان موجود قرآن مجید کے الگ الگ نسخوں کو اکٹھا کرنے کی ٹھانی تاکہ ایک مصحف کو چن لیا جائے اور مسلمانوں کے درمیان رائج الگ الگ قسم کے مصحفوں کا خاتمہ ہو جائے۔ خلافتِ عمر کے زمانے میں وہ لوگ امیر المؤمنین علیہ السلام کے پاس آئے تاکہ اس بہانے مصحفِ علوی کو ہتھیالیں لیکن اس بار امیر المؤمنین علیہ السلام نے نفی میں جواب دے کر انھیں واپس لوٹا دیا:

«فَلَمَّا اسْتَخْلَفَ عُمَرُ سَأَلَ عَلِيّاً عليه السلام أَنْ يَدْفَعَ إِلَيْهِمُ الْقُرْآنَ فَقَالَ: يَا أَبَا الْحَسَنِ إِنْ جِئْتَ بِالْقُرْآنِ الَّذِي كُنْتَ قَدْ جِئْتَ بِهِ إِلَى أَبِي بَكْرٍ حَتَّى نَجْتَمِعَ عَلَيْهِ.»

---

[1] کتاب سلیم /۱۴۶-۱۴۷، ح ۴، اسی کے مشابہ: احتجاج ۱/۸۲، باب الہجوم علی دار علی علیہ السلام اور گزشتہ حوالہ ۱/۱۵۵-۱۵۶، باب جمع القرآن و عرضہ علی القوم اور بحار الانوار ۸۹/۵۱-۵۳، اہل تسنّن کے مآخذ سے ماخوذ۔

توجب عمر خلیفہ بنے تو انھوں نے امیرالمؤمنین علیہ السلام سے چاہا کہ اس قرآن کو ان کے حوالے کردیں تاکہ اس میں تحریف کی جا سکے۔ اس لیے امیرالمؤمنین علیہ السلام سے کہا: اے علی! کتنا اچھا ہوتا اگر آپ وہ قرآن، جسے ابوبکر کے پاس لے کر آئے تھے، اسے لے آتے تاکہ ہم سب اس پر ہی اتفاق کرلیں۔

« فَقَالَ: هَيْهَاتَ لَيْسَ إِلَى ذٰلِكَ سَبِيلٌ إِنَّمَا جِئْتُ بِهِ إِلَى أَبِي بَكْرٍ لِتَقُومَ الْحُجَّةُ عَلَيْكُمْ وَلَا تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِينَ أَوْ تَقُولُوا مَا جِئْتَنَا بِهِ إِنَّ الْقُرْآنَ الَّذِي عِنْدِي لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ وَالْأَوْصِيَاءُ مِنْ وُلْدِي. »

آپ نے ارشاد فرمایا: کسی صورت بھی ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اسے میں ابوبکر کے پاس اس لیے لے کر آیا تھا تاکہ تم پر حجت تمام ہوجائے اور تم روز قیامت یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہیں تھی یا یہ نہ کہہ سکو کہ اسے تو ہمارے سامنے تم نے پیش ہی نہیں کیا۔ جو قرآن میرے پاس ہے اس تک رسائی سوائے پاکیزہ افراد کے اور میری اولاد میں سے اوصیاء کے، کسی کو بھی نہیں۔

«فَقَالَ عُمَرُ: فَهَلْ لِإِظْهَارِهِ وَقْتٌ مَعْلُومٌ؟ فَقَالَ عليه السلام: نَعَمْ إِذَا قَامَ الْقَائِمُ مِنْ وُلْدِي يُظْهِرُهُ وَيَحْمِلُ النَّاسَ عَلَيْهِ فَتَجْرِي السُّنَّةُ بِهِ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِ.»[1]

تو عمر نے کہا: کیا اس کے سامنے آنے کا کوئی معین وقت موجود ہے؟ آپ نے فرمایا: بالکل ہے! جب میری اولاد میں سے قائم قیام کرے گا تو اسے ظاہر کرے گا اور لوگوں کو اس قرآن پر متفق کرے گا پھر وہ اس کے ذریعے سنت (پیغمبر) کو نافذ کرے گا۔

---

[1] احتجاج ۱/۱۵۶، باب جمعہ للقرآن وعرضہ علی القوم۔

کچھ اس طرح سے امیرالمومنین علیہ السلام کے خصوصی حق کو اور کتابِ الٰہی کی جمع آوری میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی پر بے رحمی سے قبضہ کر کے اسے غصب کر لیا گیا اور قرآن مجید کی ترتیب میں آپ کی زحمتوں کو سراہا نہیں گیا اور نتیجتاً اسلامی امت امیرالمومنین علیہ السلام کے جمع کردہ قرآن سے محروم ہو گئی۔

سبق ۲

غصبِ خلافت اور تعلیماتِ دین کی تشریح-۲

ہم نے پچھلے سبق میں بتایا کہ امیرالمومنین علیہ السلام کی علمی خلافت و وراثت کو غصب کرنے کے لیے جو سب سے پہلا قدم اٹھایا گیا، وہ اس قرآن کو قبول نہ کرنا تھا، جو انھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے اکٹھا کیا تھا۔ اس بات مد نظر رکھتے ہوئے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام کی مقدس شخصیت، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کی حامل تھی اور قرآن مجید کا سارا علم انھیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وراثت میں ملا تھا، مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ وہ قرآن اور اس کی تعلیمات کو اس کے اصلی منبع و ماخذ سے حاصل کرتے لیکن نہ صرف اسلامی معاشرے نے اس اصل منبع کی طرف رجوع نہیں کیا، بلکہ اس دور کے قائدین نے بھی قرآن مجید پیش کرنے میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کے اقدامات کو درست نہیں مانا اور ان کے اس عمل پر پابندی عائد کردی۔

حدیث نبوی نقل کرنے پر پابندی

حقِ علوی کے غاصبوں کے ذریعے کی جانے والی دوسری کارروائی یہ تھی کہ حدیث نبوی کو نقل کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ اگرچہ نقل و کتابتِ احادیث نبوی کی ممانعت کا تاریخی مطالعہ ہماری تحریر کے دائرے سے باہر ہے[1] لیکن اس اقدام کا بھی نتیجہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برحق خلفاء کے خلاف ظلم و زیادتی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس اقدام کا بنیادی مقصد امیرالمؤمنین علیہ السلام کو رسول کی دو گرانبہا چیزوں میں سے (جن کا ذکر آپ نے حدیث ثقلین میں کیا تھا) ایک کے طور پر الگ تھلگ رکھنا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عترت کے خصائص و فضائل کے پھیلاؤ کو روکنا تھا تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل امیرالمؤمنین علیہ السلام کے فضائل و مناقب سے بے خبر اور امیرالمؤمنین علیہ السلام کے سلسلے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات سے ناآشنا رہے۔ یوں ناحق حکومت غصب کرنے والوں کے لیے اسلامی معاشرے پر حکمرانی کی راہ ہموار ہوجائے۔ لہٰذا انھوں نے اس چالاکی سے ائمہ علیہم السلام اور خصوصاً امیرالمؤمنین علیہ السلام کو سنت نبوی اور اسلامی احکام و تعلیمات پھیلانے سے روک دیا اور جب تک کہ ان کی حکومت کے مفادات کو نقصان سے بچانے کے لیے انھوں نے ان ہستیوں کو اپنی بات کہنے کی اجازت نہیں دی۔

دین کے جھوٹے مبلّغ و مروّج

اسلامی معاشرے میں اس عظیم خلاء کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی ثقافت کے پھیلاؤ کے جھوٹے ذرائع سامنے آنے لگے۔ اس بات کے مدِ نظر کہ چونکہ اُس وقت کے حکمراں اسلام اور خدا کے

---

[1] اس ضمن میں مزید مطالعے کے لیے رجوع فرمائیں: الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم، جعفر مرتضیٰ عاملی ۱/۷۵-۱۳۸ اور تدوین قرآن، علی کورانی اور منع تدوین الحدیث، سید علی شہرستانی اور تاریخ عمومی حدیث، مجید معارف۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ ہونے کے نام پر لوگوں پر حکومت کررہے تھے، لہٰذا انھیں لوگوں کی اسلامی تعلیمات اور قرآنی معارف سے واقف کرانے کی فطری ضرورت کو پورا کرنا پڑا۔ لہٰذا مذہب کے فروغ کے لیے موجود سرکاری مراکز و منبر حکمراں نظام کے قریبی لوگوں کے ہاتھوں میں آگئے اور اس طرح لوگ مذہب کے اصل سرچشمے سے دور ہوکر اس سے محروم رہ گئے۔

دین کے ان جھوٹے مبلغین و مروجین کی فہرست میں شامل ایسے تازہ مسلمان یہودی و عیسائی واضح طور پر مل جائیں گے جن کی خلفاء کے ذریعے حوصلہ افزائی کی گئی، جس کی بنا پر انھیں موقع مل گیا کہ وہ اپنے مسخ شدہ مذہب کے وہم و فریب کو اسلامی تعلیمات اور سنت نبوی کے ڈھانچے میں لوگوں کے درمیان رائج کردیں۔

یہ جاننا بھی دلچسپ ہے کہ دور جاہلیت میں اور جب بت پرست عربوں کا تمام تر علمی افتخار ان کے عاشقانہ اشعار اور علمِ انساب میں ہی سمٹا ہوا تھا، اہل کتاب، ایک متمدن تہذیب کے وارث ہونے کے سبب (حالانکہ ان کی آسمانی تعلیمات مسخ ہوچکی تھیں) علوم و ثقافت کے میدان میں بلند مرتبہ و مقام رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اسلام سے پہلے کے عربوں کے علمی اور یہاں تک کہ مذہبی منبع و مرجع تھے۔ یہ بات اس بات کا سبب بنی کہ جب علومِ نبوی کے حقیقی وارثوں کی آواز کو ان کے گلے میں ہی دبا کر رکھا گیا تو یہ تازہ مسلمان اور اہل کتاب کے مسلمان نما افراد اسلامی معاشرے کے دینی اور علمی منبع و مرجع بن گئے اور اُس وقت کے حکمراں بھی، جن دین اور اس کی بلند آسمانی تعلیمات کا کوئی ادراک نہیں تھا؛ ان افراد کو مضبوط بناکر معاشرے کی ثقافتی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرنے لگے تاکہ اس طرح وہ ایک تیر سے دو نشانے لگا سکیں؛ ایک تو اپنی فرومایگی و کم علمی کو چھپائیں اور دوسرے اسلام کی صحیح تعلیمات کے فروغ کو بھی روک دیں تاکہ ان کی سلطنت و حکومت کے لیے کسی بھی طرح کا خطرہ پیدا نہ ہوسکے۔ چنانچہ تازہ مسلمان یہودی و عیسائی علماء نے فتویٰ کی مسند سنبھال لی یا پھر اسلامی حکومت کے سرکاری ترجمان کی حیثیت سے نماز جمعہ کے خطبات سے

پہلے تقریر اور قرآنِ مجید کی تفسیر پیش کرنے لگے اور اس ضمن میں انھوں نے طلباء کی تربیت کی ذمہ داری بھی نبھائی۔

وہ پہلا شخص جو اس عہدے پر حکومت کے سرکاری ترجمان کی حیثیت سے نمازِ جمعہ کے خطبات سے پہلے تقریر کے لیے منصوب ہوا اس کا نام "تمیم داری" تھا جو در حقیقت قصے کہانیاں بیان کرنے والے گروہ (قصّاص) کا مؤسس اور بانی تھا۔[1] وہ اسلام سے پہلے کے دور میں یعنی دورِ جاہلیت میں فلسطین کا ایک عیسائی راہب اور ایک بہت بڑا سوداگر تھا، ہجرت کے نویں سال میں مسلمان ہوا، اسے خلیفۂ اوّل کے زمانے میں اجازت مل گئی کہ لوگوں کے سامنے قصے کہانیاں بیان کرے (توریت و انجیل کے مطابق انبیاء کے قصے اور پچھلے زمانے کے لوگوں کے حالات بیان کرنے کی اجازت مل گئی) ایک ایسا شخص جس نے ایک سال سے زیادہ عرصہ تک بھی نبوت کا زمانہ نہیں دیکھا تھا اسے عمر نے اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ ہر ہفتہ نمازِ جمعہ کے خطبوں سے پہلے مہاجرین و انصار کے سامنے تقریر کرے اور تیسرے خلیفہ کے دور میں تو اس کام کے لیے ہفتے میں دو بار اس کی تقریر کا اہتمام کیا گیا۔

اہلِ کتاب کے دیگر علماء میں، جنھوں نے اسلام قبول کیا اور پھر اسلامی معاشرے کا علمی منبع بن گئے؛ کعب الاحبار نام کا ایک یہودی تھا جس نے ابوبکر کے دور میں اسلام قبول کیا اور عمر کے زمانے میں ان کے اصرار پر یمن سے مدینۂ منورہ آیا اور وہیں مقیم ہو گیا اور عثمان کے دورِ حکومت تک اس شہر میں رچ بس گیا۔ کعب الاحبار عمر کی خاص توجہ کا مرکز رہا اور کئی بار انھوں نے اس سے قرآن کے بارے میں اپنے سوالات پوچھے۔[2]

---

(۱) قصّاص کی اصلاح کا تعلق علم الحدیث سے ہے جس سے مراد ایسے لوگوں کا گروہ ہے جو بغیر سند کا ذکر کیے انبیاء کی تاریخ اور پچھلے زمانے کے لوگوں کے حالات بیان کرتے تھے، اس اصطلاح کا تعلق اسلام کے ابتدائی دور سے ہے۔

(۲) جب امیر المومنین علیہ السلام کے ہاتھوں میں حکومت آئی تو انھوں نے ان قصہ گویوں کو مسجد سے نکال باہر کیا۔

اُس دَور کے اسلامی معاشرے کی ثقافت پر اِن نومسلم علماء کا بنیادی اور عمومی اثر یہ ہوا کہ ایک تو انھوں نے توریت و انجیل کی تحریف شدہ تعلیمات، جو اسرائیلیات کے نام سے مشہور ہیں، اسلامی معاشرے میں پھیلا دیں۔ دوسرے انھوں نے ابوہریرہ اور انس بن مالک جیسے شاگردوں کی پرورش کی جنھوں نے اپنی بیشتر احادیث کو تمیم داری اور کعب الاحبار سے نقل کیا اور انھیں سیرت و سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر اس وقت کے مسلمانوں کے سَر منڈھ دیا۔ ان نومسلم اہلِ کتاب یہودیوں اور عیسائیوں کے کام کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اہلسنت والجماعت کی احادیث کی کتابوں کا نصف سے زیادہ حصہ ابوہریرہ کی حدیثوں سے بھرا پڑا ہے جن میں ایسی احادیث شامل ہیں جو کعب الاحبار اور اس جیسے افراد سے نقل ہوئی ہیں یا ایسی من گھڑت روایات شامل ہیں جنھیں معاویہ کے دور میں راویوں کو لالچ دے کر گڑھا گیا ہے۔ [1]

قابل ذکر ہے کہ جس زمانے میں تمام مہاجرین وانصار پر حدیثِ نبوی کی نقل وکتابت پر پابندی تھی، تب کعب الاحبار اور اس جیسے افراد اور ابوہریرہ اور اس جیسے افراد نے بڑی تندہی اور بھرپور کوششوں اور اس وقت کے حکمرانوں کی اجازت سے اسلامی معاشرے کی ثقافت اور اس کے چہرے کو تبدیل کر کے رکھ دیا اور مسلم معاشرے میں نبوی تعلیمات کو کم رنگ یا بے رنگ بنا دیا۔

اس غصب کے مقابل ائمۂ کرام علیہم السلام کے اقدامات

صحیح نبوی سنّت کی نشر واشاعت پر پابندی اور ممانعت کے مقابلے میں ائمۂ کرام علیہم السلام اور خاص طور پر امیر المؤمنین علیہ السلام جب بھی کوئی موقع ہاتھ لگتا، اسلام کی صحیح تعلیمات کو اہل اور باصلاحیت

[1] مزید اطلاعات کے لیے رجوع فرمائیں: تاریخ سیاسی اسلام، رسول جعفریان، ج ۲، صفحات ۸۷–۹۸ اور صفحات ۷۴۴–۷۴۹۔

پہلے تقریر اور قرآنِ مجید کی تفسیر پیش کرنے لگے اور اس ضمن میں انھوں نے طلباء کی تربیت کی ذمہ داری بھی نبھائی۔

وہ پہلا شخص جو اس عہدے پر حکومت کے سرکاری ترجمان کی حیثیت سے نماز جمعہ کے خطبات سے پہلے تقریر کے لیے منصوب ہوا اس کا نام "تمیم داری" تھا جو در حقیقت قصّے کہانیاں بیان کرنے والے گروہ (قصّاص) کا مؤسس اور بانی تھا۔[1] وہ اسلام سے پہلے کے دور میں یعنی دورِ جاہلیت میں فلسطین کا ایک عیسائی راہب اور ایک بہت بڑا سوداگر تھا، ہجرت کے نویں سال میں مسلمان ہوا، اسے خلیفۂ اوّل کے زمانے مین اجازت مل گئی کہ لوگوں کے سامنے قصّے کہانیاں بیان کرے (توریت و انجیل کے مطابق انبیاء کے قصے اور پچھلے زمانے کے لوگوں کے حالات بیان کرنے کی اجازت مل گئی) ایک ایسا شخص جس نے ایک سال سے زیادہ عرصہ تک بھی نبوت کا زمانہ نہیں دیکھا تھا اسے عمر نے اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ ہر ہفتہ نماز جمعہ کے خطبوں سے پہلے مہاجرین و انصار کے سامنے تقریر کرے اور تیسرے خلیفہ کے دور میں تو اس کام کے لیے ہفتے میں دو بار اس کی تقریر کا اہتمام کیا گیا۔

اہل کتاب کے دیگر علماء میں، جنھوں نے اسلام قبول کیا اور پھر اسلامی معاشرے کا علمی منبع بن گئے؛ کعب الاحبار نام کا ایک یہودی تھا جس نے ابوبکر کے دور میں اسلام قبول کیا اور عمر کے زمانے میں ان کے اصرار پر یمن سے مدینۂ منورہ آیا اور وہیں مقیم ہو گیا اور عثمان کے دورِ حکومت تک اس شہر میں رچ بس گیا۔ کعب الاحبار عمر کی خاص توجہ کا مرکز رہا اور کئی بار انھوں نے اس سے قرآن کے بارے میں اپنے سوالات پوچھے۔[2]

---

[1] قصّاص کی اصلاح کا تعلق علم الحدیث سے ہے جس سے مراد ایسے لوگوں کا گروہ ہے جو بغیر سند کا ذکر کیے انبیاء کی تاریخ اور پچھلے زمانے کے لوگوں کے حالات بیان کرتے تھے، اس اصطلاح کا تعلق اسلام کے ابتدائی دور سے ہے۔

[2] جب امیر المؤمنین علیہ السلام کے ہاتھوں میں حکومت آئی تو انھوں نے ان قصہ گویوں کو مسجد سے نکال باہر کیا۔

اُس دَور کے اسلامی معاشرے کی ثقافت پر اِن نومسلم علماء کا بنیادی اور عمومی اثر یہ ہوا کہ ایک تو انھوں نے توریت و انجیل کی تحریف شدہ تعلیمات، جو اسرائیلیات کے نام سے مشہور ہیں، اسلامی معاشرے میں پھیلا دیں۔ دوسرے انھوں نے ابوہریرہ اور انس بن مالک جیسے شاگردوں کی پرورش کی جنھوں نے اپنی بیشتر احادیث کو تمیم دارمی اور کعب الاحبار سے نقل کیا اور انھیں سیرت و سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر اس وقت کے مسلمانوں کے سَر منڈھ دیا۔ ان نومسلم اہلِ کتاب یہودیوں اور عیسائیوں کے کام کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اہلسنت والجماعت کی احادیث کی کتابوں کا نصف سے زیادہ حصہ ابوہریرہ کی حدیثوں سے بھرا پڑا ہے جن میں ایسی احادیث شامل ہیں جو کعب الاحبار اور اس جیسے افراد سے نقل ہوئی ہیں یا ایسی من گھڑت روایات شامل ہیں جنھیں معاویہ کے دور میں راویوں کو لالچ دے کر گڑھا گیا ہے۔[1]

قابلِ ذکر ہے کہ جس زمانے میں تمام مہاجرین و انصار پر حدیثِ نبوی کی نقل و کتابت پر پابندی تھی، تب کعب الاحبار اور اس جیسے افراد اور ابوہریرہ اور اس جیسے افراد نے بڑی تندہی اور بھرپور کوششوں اور اس وقت کے حکمرانوں کی اجازت سے اسلامی معاشرے کی ثقافت اور اس کے چہرے کو تبدیل کر کے رکھ دیا اور مسلم معاشرے میں نبوی تعلیمات کو کم رنگ یا بے رنگ بنا دیا۔

اس غصب کے مقابل ائمۂ کرام علیہم السلام کے اقدامات

صحیح نبوی سنّت کی نشر و اشاعت پر پابندی اور ممانعت کے مقابلے میں ائمۂ کرام علیہم السلام اور خاص طور پر امیر المومنین علیہ السلام جب بھی کوئی موقع ہاتھ لگتا، اسلام کی صحیح تعلیمات کو اہل اور باصلاحیت

[1] مزید اطلاعات کے لیے رجوع فرمائیں: تاریخ سیاسی اسلام، رسول جعفریان، ج ۲، صفحات ۸۷-۹۸ اور صفحات ۲۴۴-۲۴۹۔

لوگوں کے سامنے بیان فرماتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد کے ابتدائی دنوں میں اور امیرالمؤمنین علیہ السلام کے شاندار ماضی اور ان کی ان گنت فضیلتوں کو دیکھتے ہوئے اور مہاجرین و انصار کی موجودگی کی وجہ سے اس وقت کے حکمرانوں کو اپنی بھلائی اس میں نہیں نظر آتی تھی کہ وہ امیرالمؤمنین کو معاشرے سے مکمل طور پر ہٹا دیں۔ اسی لیے امیرالمؤمنین علیہ السلام دینی تعلیمات کی وضاحت کرتے اور لوگوں کے سوالات کا جواب دیتے تھے اور احکام کی تصحیح اور حکمرانوں کے فیصلوں میں مداخلت کرتے ہوئے ان کی اصلاح کے لیے مناسب مواقع کا استعمال فرماتے تھے۔ دوسرے اماموں علیہم السلام نے بھی اپنے اپنے حساب سے اسی طریقۂ کار پر عمل کیا۔

اس سلسلے میں قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ یہ عمل خلافت کے غاصبوں سے راضی ہونے اور حمایت کرنے کی علامت نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے کہا، یہ دین کی وضاحت میں عائد ائمہ علیہم السلام پر ذمہ داریوں کا ایک حصہ ہے اور ساتھ ہی مسلم معاشرے پر حکمرانی کے لحاظ سے ائمہ کے فرائض منصبی کا ہی ایک حصہ تھا، لہٰذا، جب بھی انھیں موقع ملتا تو وہ وہی کرتے تھے جو انھیں کرنا چاہیے تھا اور جن کی ذمہ داری ان کے سر تھی جس پر دوسروں نے غاصبانہ طور پر قبضہ جما رکھا تھا اور معاشرے میں اس کے نفوذ کو روکتے تھے۔ بنابریں معاشرے کے موجودہ امور میں ائمہ علیہم السلام کی کوئی بھی اور کسی بھی طرح کی مداخلت اپنے ہی اس حق کے ایک گوشے کا حصول تھا جس کو خدا نے صرف انھیں ہی عطا کیا تھا۔ ائمہ علیہم السلام کے اس طرح کے اقدامات کو اس بات کی علامت سمجھ بیٹھنا کہ وہ حکومتِ وقت سے راضی اور اس سے تعاون کر رہے تھے۔ اسے خلافت کے غاصبوں سے ہم آہنگی کی علامت سمجھ بیٹھنا ایک ایسی فاش غلطی ہے جو اماموں کی صحیح معرفت اور ان کے الٰہی مقام کو نہ جاننے کا نتیجہ ہے۔

ایک اور اہم وجہ جس کی وجہ سے ائمہ کرام علیہم السلام معاشرے کے امور میں شریک ہوتے اور ان میں مداخلت فرماتے تھے، دینِ اسلام کا تحفظ تھا، جس کے بارے میں ہم اگلے اسباق میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

سبق۔ ۳

امیر المؤمنین علیہ السلام کے ذریعے دین اسلام کا تحفظ

پچھلے سبق میں ہم نے بیان کیا کہ قرآنی تعلیمات اور دین کے احکام کی توضیح و تشریح کی جو ذمہ داری اللہ کی طرف سے ائمہ علیہم السلام کو حاصل تھی اور جس پر حکومتِ وقت نے ناجائز قبضہ جما رکھا تھا، ائمہ علیہم السلام نے اس ناجائز قبضے اور اپنے حق کو غصب کیے جانے کے خلاف جو اقدامات انجام دیے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ جب بھی اور جہاں کہیں بھی کوئی موقع ملتا تھا، وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اس غصب شدہ حق کو بحال کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس ذمہ داری کو بھرپور طریقے سے ادا کرتے تھے جس کی ذمہ داری من جانب اللہ ان کے ہی سپرد تھی اور اہل افراد کے درمیان دینِ اسلام کی تبلیغ و توضیح میں مصروف رہتے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غاصب حکمرانوں کے درمیان رہتے ہوئے ائمہ علیہم السلام کا تبلیغ دینِ اسلام کرنا ان غاصب حکمرانوں کی حکومت پر مہرِ تائید ثبت کرنے جیسا ہے یا یہ کہ ائمہ علیہم السلام کے اس فعل کو غاصب حکومت کی حمایت و رضامندی کی دلیل سمجھ لیا جائے بلکہ ائمہ علیہم السلام کے یہ اقدامات من جانب اللہ سونپے گئے اپنے فرائض کا ایک حصہ اور اپنے الٰہی حق کو بحال کرنے کی کوشش تھی۔

اس طرزِ عمل کا ایک اور جواز، خاص طور پر امیر المؤمنین علیہ السلام کے زمانے میں، جب دین اسلام نوزائیدہ تھا اور اسلامی معاشرہ اپنے ابتدائی ایام سے گزر رہا تھا، یہ تھا کہ دین اسلام کا تحفظ کیا جائے اور اسے مضبوط بنایا جائے۔

ابو بکر کا دَور

عروجِ اسلام کے آغاز میں اور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد، جب اسلام جزیرہ نمائے عرب میں پوری طرح سے پھیل گیا تو عرب کی سرزمین کی پڑوسی اور بالخصوص ایسی قوموں نے، جو اپنے آپ کو یہودیت اور عیسائیت کی تہذیب سے مالامال سمجھتی تھیں، دینِ اسلام کے بارے میں جاننے کے لیے، جزیرہ نمائے عرب اور مدینے میں اپنے علماء اور دانشوروں کے متعدد گروہ بھیجے۔ وہ جو گزشتہ آسمانی کتاب کے ماہر علماء تھے، اپنے سوالوں کے جواب تلاش کرنے کے ساتھ ہی ساتھ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین و خلیفہ کی بھی تلاش میں تھے۔ لوگ بھی ان اہلِ کتاب علماء کو انہیں خلفاء کا پتہ بتا دیتے جو ناحق مسندِ خلافت پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے لیکن ہمیشہ کچھ ہی سوالات و جوابات کے تبادلے کے ساتھ ہی خلیفہ کی بے بسی نمودار ہو جاتی جس کے نتیجے میں اسلام کی حقانیت کو ایک بڑا دھچکا لگتا اور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت پر سوالیہ نشان لگ جاتا۔

ان تمام مُشکل اوقات میں، امیر المؤمنین علیہ السلام کی رہنمائی، آپ کی وضاحتیں اور سوالوں کے جواب مشکلات کی تمام گرہوں کو کھول دیتے اور اسلام اور مسلمانوں کی نجات کا سبب بنتے۔ ان کی ذات گرامی نے اسلام کے نونہال پودے کو مرجھانے کے خطرے سے بچایا۔ مثال کے طور پر سلمان فارسیؓ بیان کرتے ہیں: "جب روم کے بادشاہ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات اور آپ کے جانشین پر لوگوں کے اختلافات کے بارے میں خبر ملی تو اس نے جاثلیق کو ایک سو پادریوں اور عیسائی علماء کے ساتھ مسلمانوں کے ساتھ بحث و مناظرے کے لیے مدینے بھیجا۔ جب یہ گروہ مدینے پہنچا

اور مسجد نبوی میں داخل ہوگیا تو جاثلیق نے کہا: ہم عیسائی ہیں جو تمہارے نبی کی رحلت کی خبر سننے کے بعد تمہارے پاس آئے ہیں تاکہ تمہارے نبی کی حقانیت سے آگاہ ہو سکیں اور اگر ہم نے انھیں حق پہ پایا اور ان کی حقانیت ہم پر ثابت ہوگئی تو ہم انھیں قبول کرلیں گے اور ان کے پیرو بن جائیں گے لیکن اگر ہم نے انھیں گزشتہ انبیاء کی سنت کے برخلاف پایا تو ہمارا ایمان اپنے دین پر مزید مستحکم ہو جائے گا۔ پھر اس نے رسول اکرم ﷺ کے جانشین کے بارے میں پوچھا تو لوگوں نے ابوبکر کی طرف اشارہ کر دیا۔" جاثلیق اور ابوبکر کے مابین کچھ سوالات و جوابات کا تبادلہ ہوا جسے ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

جاثلیق نے کہا: کیا تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصی ہو اور تم ہی وہ عالم ہو جو پیغمبر کی تعلیم کی وجہ سے دوسروں سے بے نیاز ہو اور جس چیز کی بھی امت کو ضرورت ہو، تم جانتے ہو؟

ابوبکر نے کہا: نہیں، میں ان کا وصی نہیں ہوں۔

جاثلیق نے کہا: تو پھر تم کون ہو؟

عمر نے کہا: یہ رسول خدا کے خلیفہ ہیں۔

جاثلیق نے کہا: کیا اس قوم میں پیغمبر نے تمہیں خلیفہ بنایا ہے؟

ابوبکر نے کہا: نہیں۔

جاثلیق نے کہا: پھر یہ کیسا نام ہے جس کے تم پیغمبر کے بعد ناحق دعوے دار ہوگئے ہو؟ ہم نے گزشتہ انبیاء کی کتابوں میں پڑھا ہے کہ خلیفہ کا لقب انبیاء کے علاوہ کسی اور کے لیے مناسب نہیں ہے اس لیے تم نے کیسے اس نام کو اپنے لیے منتخب کرلیا؟ تم کو یہ نام کیسے ملا؟ کیا تمہارے پیغمبر نے تمہیں یہ نام دیا ہے؟

ابوبکر نے کہا: نہیں، بلکہ لوگوں نے مجھ پر اتفاق کیا اور مجھے اپنا ولی اور خلیفہ بنا دیا۔

جاثلیق نے کہا: تو پھر تم لوگوں کے خلیفہ ہوئے نہ کہ پیغمبر کے خلیفہ... پھر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: اے دوستو! یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد نبی نہیں تھے اور

انھوں نے طاقت اور اقتدار کے بل پر اپنا کام انجام دیا ہے، ورنہ دوسرے نبیوں کی طرح ان کے بھی وصی ہوتے اور وہ اپنے علم اور نبوت کی میراث کو کسی کے سپرد کر کے جاتے۔

پھر اس نے ابوبکر سے دوسرے سوالات پوچھے جن کے جوابات بھی ابوبکر سے بن نہ پڑے اور انھوں نے جواب دینے سے اپنے آپ کو عاجز پایا۔ وہ کبھی عمر کی طرف تو کبھی ابوعبیدہ کی طرف دیکھتے۔ ان دونوں کے پاس بھی کچھ کہنے کے لیے نہیں تھا۔ سلمانؓ کہتے ہیں: جب میں نے عیسائی عالم کے سامنے ان لوگوں کی لاچاری، ذلت اور رسوائی اور اسلام کا نام مٹی میں ملتا دیکھا تو میں نادانستہ طور پر امیر المومنین علیہ السلام کے گھر کے دروازے پر پہنچا اور دستک دی۔

«فَخَرَجَ وَ هُوَ يَقُولُ مَا دَهَاكَ يَا سَلْمَانُ قَالَ قُلْتُ هَلَكَ دِينُ اَللّٰهِ وَ هَلَكَ اَلْإِسْلاَمُ بَعْدَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اَللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ وَ ظَهَرَ أَهْلُ اَلْكُفْرِ عَلَى دِينِهِ وَ أَصْحَابِهِ بِالْحُجَّةِ فَأَدْرِكْ يَا أَمِيرَ اَلْمُؤْمِنِينَ دِينَ مُحَمَّدٍ وَ اَلْقَوْمُ قَدْ وَرَدَ عَلَيْهِمْ مَا لاَ طَاقَةَ لَهُمْ وَ لاَ بُدَّ وَ لاَ حِيلَةَ فَأَنْتَ اَلْيَوْمَ مُفَرِّجُ كَرْبِهَا وَ كَاشِفُ بَلْوِهَا وَ صَاحِبُ مِيسَمِهَا وَ تَاجُهَا وَ مِصْبَاحُ ظُلَمِهَا وَ مِفْتَاحُ مُبْهَمِهَا.»

امیر المومنین علیہ السلام باہر تشریف لائے اور پوچھا: اے سلمان، تمہیں کس چیز نے اتنا وحشت زدہ کر رکھا ہے؟ میں نے کہا: ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین پر آفت آپڑی ہے، اسلام تباہی کے دہانے پر ہے، دین پر کفر کا غلبہ ہو گیا ہے اور کافروں نے دین اور اس کے ساتھیوں کو اپنے دلائل سے کو زیر کر لیا ہے۔ اس لیے اے امیر المومنین علیہ السلام آپ کو اس کے راہِ حل کے بارے میں سوچنا چاہیے اور اس مسئلے کو حل کرنے کی کلید آپ کے ہی پاس ہے کیونکہ لوگوں پر ایسی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے جسے برداشت کرنے کی وہ طاقت نہیں رکھتے اور جس سے بچنے کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آتا۔ آج آپ ہی اس امت سے پریشانی کو دور کرنے والے ہیں اور امت سے اس مصیبت کو چھٹکارا دلانے

والے ہیں اور اسلام کی عزت و وقار کا تاج آپ ہی ہیں، اندھیرے میں نور اور امت کی نہ سلجھ پانے والی گتھیوں کو سلجھانے والے آپ ہی ہیں۔

امیرالمؤمنین علیہ السلام مسجد آئے اور عیسائی عالم کے سوالات کے جوابات دیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جاثلیق اور اس کے ساتھی سب کے سب مسلمان ہو گئے۔[1]

عمر کا دَور

خدا کے دین کو محفوظ رکھنے میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کا ایک اور کردار یہ رہا کہ وہ خلفاء کے دور میں ان کی جانب سے کیے گئے غلط فیصلوں کی تصحیح فرماتے تھے، خاص طور پر دوسرے خلیفہ کے غلط فیصلوں اور غلط احکام کو درست فرماتے رہے۔ اس کام کو امیرالمؤمنین علیہ السلام یا تو شروع سے ہی اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے یا جب دیکھتے تھے کہ یہ معاملہ اب ان کے بس کا نہیں رہ گیا تو پھر اس میں مداخلت فرماتے ہوئے سارے معاملات سلجھا دیتے تھے۔ یا پھر جب عمر خود یہ دیکھ لیتے کہ یہ معمّہ ان سے سلجھنے والا نہیں ہے تو وہ امیرالمؤمنین علیہ السلام سے رجوع کرتے تھے اور امیرالمؤمنین علیہ السلام اس موقع کو دین اسلام اور اس کے صحیح اصول بیان کرنے کے لیے استعمال فرماتے تھے۔

---

[1] بحار الانوار ۳۰/۵۳، ح ۱ اور اسی سے مشابہ اسی باب کی دوسری روایتیں، اسی طرح: فٹ نوٹ میں، صفحات ۱۱۵—۱۲۰، انہی مضامین پر مشتمل روایات کا ذکر اہل تسنّن کی کتابوں کے حوالے سے مذکور ہے، ساتھ ہی رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۱۰/کتاب الاحتجاج والمناظرۃ۔ ان یہودیوں اور عیسائیوں کے کچھ سوالات توحیدی مسائل سے متعلق تھے اور کچھ مذہبی پہیلیوں کی شکل میں تھے کہ وہ خود اپنی آسمانی کتابوں کے مطابق ان کا جواب جانتے تھے۔ کچھ سوالات ان کے اپنے ذہنی مسائل سے متعلق تھے جن کے بارے میں ان کا ماننا تھا کہ جس کے پاس الٰہی علم ہو گا وہی ایسے سوالوں کا جواب دے سکتا ہے۔ لہٰذا یہ سوالات پوچھ کر انھیں خاتم الانبیاء کی وراثت اور وصایت میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کے الٰہی علم کا اندازہ ہو گیا اور امیرالمؤمنین علیہ السلام کی حقانیت ان پر واضح ہو گئی۔

انھوں نے طاقت اور اقتدار کے بل پر اپنا کام انجام دیا ہے، ورنہ دوسرے نبیوں کی طرح ان کے بھی وصی ہوتے اور وہ اپنے علم اور نبوت کی میراث کو کسی کے سپرد کر کے جاتے۔

پھر اس نے ابوبکر سے دوسرے سوالات پوچھے جن کے جوابات بھی ابوبکر سے بن نہ پڑے اور انھوں نے جواب دینے سے اپنے آپ کو عاجز پایا۔ وہ کبھی عمر کی طرف تو کبھی ابوعبیدہ کی طرف دیکھتے۔ ان دونوں کے پاس بھی کچھ کہنے کے لیے نہیں تھا۔ سلمانؓ کہتے ہیں: جب میں نے عیسائی عالم کے سامنے ان لوگوں کی لاچاری، ذلت اور رسوائی اور اسلام کا نام مٹی میں ملتا دیکھا تو میں نادانستہ طور پر امیر المومنین علیہ السلام کے گھر کے دروازے پر پہنچا اور دستک دی۔

«فَخَرَجَ وَ هُوَ يَقُولُ مَا دَهَاكَ يَا سَلْمَانُ قَالَ قُلْتُ هَلَكَ دِينُ اَللَّهِ وَ هَلَكَ اَلْإِسْلاَمُ بَعْدَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اَللَّهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ وَ ظَهَرَ أَهْلُ اَلْكُفْرِ عَلَى دِينِهِ وَ أَصْحَابِهِ بِالْحُجَّةِ فَأَدْرِكْ يَا أَمِيرَ اَلْمُؤْمِنِينَ دِينَ مُحَمَّدٍ وَ اَلْقَوْمُ قَدْ وَرَدَ عَلَيْهِمْ مَا لاَ طَاقَةَ لَهُمْ وَ لاَ بُدَّ وَ لاَ حِيلَةَ فَأَنْتَ اَلْيَوْمَ مُفَرِّجُ كَرْبِهَا وَ كَاشِفُ بَلْوِهَا وَ صَاحِبُ مِيسَمِهَا وَ تَاجُهَا وَ مِصْبَاحُ ظُلَمِهَا وَ مِفْتَاحُ مُبْهَمِهَا.»

امیر المومنین علیہ السلام باہر تشریف لائے اور پوچھا: اے سلمان، تمہیں کس چیز نے اتنا وحشت زدہ کر رکھا ہے؟ میں نے کہا: ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین پر آفت آپڑی ہے، اسلام تباہی کے دہانے پر ہے، دین پر کفر کا غلبہ ہوگیا ہے اور کافروں نے دین اور اس کے ساتھیوں کو اپنے دلائل سے کوزیر کرلیا ہے۔ اس لیے اے امیر المومنین علیہ السلام آپ کو اس کے راہِ حل کے بارے میں سوچنا چاہیے اور اس مسئلے کو حل کرنے کی کلید آپ کے ہی پاس ہے کیونکہ لوگوں پر ایسی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے جسے برداشت کرنے کی وہ طاقت نہیں رکھتے اور جس سے بچنے کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آتا۔ آج آپ ہی اس امت سے پریشانی کو دور کرنے والے ہیں اور امت سے اس مصیبت کو چھٹکارا دلانے

والے ہیں اور اسلام کی عزت وو قار کا تاج آپ ہی ہیں، اندھیرے میں نور اور امت کی نہ سلجھ پانے والی گتھیوں کو سلجھانے والے آپ ہی ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام مسجد آئے اور عیسائی عالم کے سوالات کے جوابات دیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جاثلیق اور اس کے ساتھی سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ [1]

عمر کا دَور

خدا کے دین کو محفوظ رکھنے میں امیر المومنین علیہ السلام کا ایک اور کردار یہ رہا کہ وہ خلفاء کے دور میں ان کی جانب سے کیے گئے غلط فیصلوں کی تصحیح فرماتے تھے، خاص طور پر دوسرے خلیفہ کے غلط فیصلوں اور غلط احکام کو درست فرماتے رہے۔ اس کام کو امیر المومنین علیہ السلام یا تو شروع سے ہی اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے یا جب دیکھتے تھے کہ یہ معاملہ اب ان کے بس کا نہیں رہ گیا تو پھر اس میں مداخلت فرماتے ہوئے سارے معاملات سلجھا دیتے تھے۔ یا پھر جب عمر خود یہ دیکھ لیتے کہ یہ معمّہ ان سے سلجھنے والا نہیں ہے تو وہ امیر المومنین علیہ السلام سے رجوع کرتے تھے اور امیر المومنین علیہ السلام اس موقع کو دین اسلام اور اس کے صحیح اصول بیان کرنے کے لیے استعمال فرماتے تھے۔

---

[1] بحار الانوار ۳۰/۵۳، ج ۱۱ور اسی سے مشابہ اسی باب کی دوسری روایتیں، اسی طرح فٹ نوٹ میں، صفحات ۱۱۵-۱۲۰، انہی مضامین پر مشتمل روایات کا ذکر اہل تسنّن کی کتابوں کے حوالے سے مذکور ہے، ساتھ ہی رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۱۰/کتاب الاحتجاج والمناظرۃ۔ ان یہودیوں اور عیسائیوں کے کچھ سوالات توحیدی مسائل سے متعلق تھے اور کچھ مذہبی پہیلیوں کی شکل میں تھے کہ وہ خود اپنی آسمانی کتابوں کے مطابق ان کا جواب جانتے تھے۔ کچھ سوالات ان کے اپنے ذہنی مسائل سے متعلق تھے جن کے بارے میں ان کا ماننا تھا کہ جس کے پاس الٰہی علم ہو گا وہی ایسے سوالوں کا جواب دے سکتا ہے۔ لہٰذا یہ سوالات پوچھ کر انھیں خاتم الانبیاء کی وراثت اور وصایت میں امیر المومنین علیہ السلام کے الٰہی علم کا اندازہ ہو گیا اور امیر المومنین علیہ السلام کی حقانیت ان پر واضح ہو گئی۔

«لَوْلا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَر»، «لا عِشتُ فی اُمَّةٍ لَسْتَ فِيها يا أبَا الْحَسَنِ»

اور «لا أبقاني اللهُ فِي مَعْضِلَةٍ لَسْتَ فِيها يا أبَا الْحَسَنِ» جیسے عمر کے جملوں کی شہرت خاص وعام میں اس قدر ہے کہ ہمیں ان کے شواہد اور ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف نمونے کے طور پر ایک واقعے کا ذکر کیے دیتے ہیں: ایک بار عمر نے کعبے کے زیورات کو ہٹانے کا ارادہ کیا تو امیر المومنین علیہ السلام نے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلَى النَّبِيِّ (صلی الله علیه وآله) وَ الْأَمْوَالُ أَرْبَعَةٌ: أَمْوَالُ الْمُسْلِمِينَ، فَقَسَّمَهَا بَيْنَ الْوَرَثَةِ فِي الْفَرَائِضِ، وَ الْفَيْءُ فَقَسَّمَهُ عَلَى مُسْتَحِقِّيهِ، وَ الْخُمُسُ فَوَضَعَهُ اللَّهُ حَيْثُ وَضَعَهُ، وَ الصَّدَقَاتُ فَجَعَلَهَا اللَّهُ حَيْثُ جَعَلَهَا؛ وَكَانَ حَلْيُ الْكَعْبَةِ فِيهَا يَوْمَئِذٍ، فَتَرَكَهُ اللَّهُ عَلَى حَالِهِ وَلَمْ يَتْرُكْهُ نِسْيَاناً وَلَمْ يَخْفَ عَلَيْهِ [عَنْهُ] مَكَاناً؛ فَأَقِرَّهُ حَيْثُ أَقَرَّهُ اللَّهُ وَ رَسُولُهُ. فَقَالَ لَهُ عُمَرُ لَوْلَاكَ لَافْتَضَحْنَا. وَ تَرَكَ الْحَلْيَ بِحَالِهِ.»[1]

یہ قرآن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور آپ کے دور میں اموال کی چار قسمیں تھیں۔ ایک مسلمان کا ذاتی مال تھا جسے اللہ کے حکم کے مطابق ورثاء میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ ایک بیت المال کا مال تھا جسے مستحق افراد میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک خمس تھا جسے اس کے حقداروں کے حوالے کر دیتے تھے اور کچھ صدقات تھے جنھیں انھیں کے

---

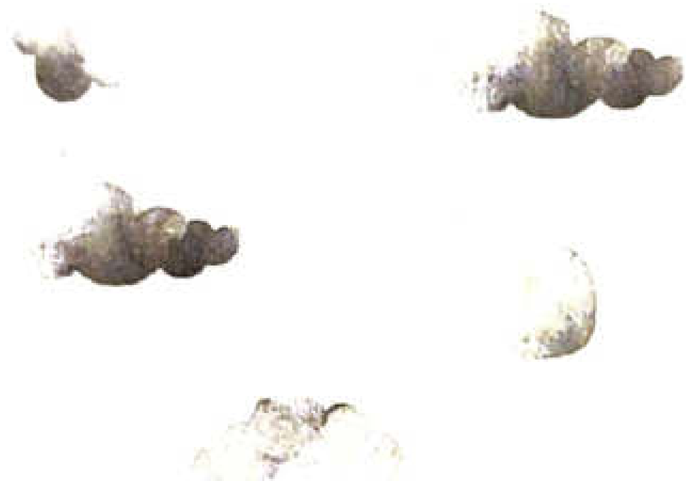
[1] بحار الانوار ۲۳۵/۴۰۔ یہ صورت حال بظاہر خانہ کعبہ سے مختص نہیں ہے بلکہ تمام مقدس مقامات کا یہی حال ہے کہ ان کے زینت و آرائش کے اسباب اگر ضروری ہیں تو ان کا تحفظ بھی ضروری ہے لیکن اگر ان کی کوئی افادیت نہیں ہے تو ان کے بارے میں ذمہ داران شریعت سے رجوع کر کے صحیح مصرف میں لگا دینا چاہیے۔ بقول شخصے بجلی کے دور میں موم بتی اور خوشبو کے دور میں اگر بتی کے تحفظ کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہی پیسہ اسی مقدس مقام کی دیگر ضروریات پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔

مقام پر خرچ کیا کرتے تھے۔ کعبے کے زیورات اس وقت بھی موجود تھے اور پروردگار نے انھیں اسی حالت میں چھوڑ رکھا تھا۔ نہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں بھولے تھے اور نہ ان کا وجود آپ سے پوشیدہ تھا۔ لہٰذا انھیں اسی حالت پر رہنے دو جس حالت پہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھا ہے۔ یہ سننا تھا کہ عمر نے کہا! آج اگر آپ نہ ہوتے تو میں رسوا ہو گیا ہوتا اور یہ کہہ کر زیورات کو ان کی جگہ چھوڑ دیا۔[1]

ان تمام واقعات سے جو چیز کھل کر سامنے آتی تھی وہ امیر المؤمنین علیہ السلام کا الٰہی علم، ان کی حقانیت اور ان کے الٰہی حق پر غاصبانہ قبضہ جمانے والوں کی ذلت و رسوائی تھی۔ امیر المؤمنین علیہ السلام بھی انہی معاملات میں مداخلت فرماتے تھے جو ان کا حق تھا جس پر دوسروں نے ناجائز طریقے سے قبضہ کر لیا تھا۔ دوسرے ائمہ علیہم السلام کا طرز عمل بھی، امیر المؤمنین کی ہی پیروی کرتے ہوئے پروردگار کے دین کے احیاء، صحیح احکام دین کی تعلیم اور اپنے جدّ عظیم الشان سرکار دوعالم خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت اور اس کے قوانین کے نفاذ سے عبارت تھا۔ معاشرے کے موجودہ حالات پر ائمہ علیہم السلام کی رضامندی کی بات کرنا، وہ بھی ان کے اس طرح کے طرز عمل کے پیش نظر، ائمہ علیہم السلام کے مقام و منزلت سے پوری طرح لاعلمی اور بے بنیاد توجیہات کے ساتھ اپنی خواہش نفس کی غلامی کی دلیل ہے۔

---

[1] مزید آگاہی کے لیے رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۴۰/۲۱۸-۳۱۸، باب فی قضایاہ و ماھدیٰ قومہ الیہ مما اشکل علیھم اور الغدیر، امینی ۶/۸۳-۳۳۳، نوادر الاثر فی علم عمر اور ارشاد، مفید ۱/۱۹۹-۲۱۲، قضاء علی علیہ السلام فی امارۃ ابی بکر و عمر و عثمان۔



دوسرا باب

حق کی فریاد، باطل کا ظلم وستم

ہم نے اس باب کو امیر المؤمنین علیہ السلام کی ہی زبانی آپ کی حقانیت کے اظہار سے مختص کیا ہے۔ البتہ آخری سبق میں ہم نے ائمۂ معصومین علیہم السلام اور کچھ صحابہ کے احتجاجات کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ واضح کرنے کے لیے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے نقطۂ نظر سے دوسروں کی حکومت پوری طرح سے ناحق اور باطل تھی اور آپ کسی بھی صورت میں ان غاصب حکمرانوں اور ان کی ناجائز حکمرانی سے راضی نہیں تھے۔

اس سلسلے میں، امیر المؤمنین علیہ السلام سے دو طرح کے بیانات نقل کیے گئے ہیں۔ ایک وہ بیانات جن میں امام کی حقانیت اور دوسروں کے باطل ہونے کا صراحت کے ساتھ اور واضح انداز میں ذکر ہے، وہ بھی آپ کی افضلیت یا برتری کی وجہ سے نہیں بلکہ مطلقاً۔ دوسرے وہ بیانات جن میں امیر المؤمنین علیہ السلام نے مجادلۂ احسن کے ذریعے، فریق مخالف کی باطل حکمرانی کو خود انھی کے اصولوں اور بنیادوں پر باطل ثابت کر دیا ہے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام کے ان بیانات کو پیش کرتے ہوئے ہمارے حوالوں کا بنیادی مرکز وہی شواہد اور کتابیں ہیں جنھیں مخالفین نے رضامندی کے تصور کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ لہٰذا اس باب میں ہم نے وہ سارے بیانات، جو شیعہ کتابوں میں تفصیل کے ساتھ مندرج ہیں، پیش نہیں کیے ہیں۔ اس بات پر بھی توجہ رہے کہ پیش کیے جانے والے شواہد و دستاویزات میں امام علیہ السلام کے وہ بیانات یا تحریریں بھی شامل ہیں جو خود ان کے دور حکومت سے متعلق اور اسی زمانے کی ہیں، جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی خلافت غصب کرنے والوں سے ناراضگی امیر المومنینؑ کے آخری ایام تک جاری رہی اور اس ناراضگی کا تعلق صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد کے ابتدائی دور سے نہیں ہے۔

سبق ۴

امیر المؤمنین علیہ السلام حکومت کو اپنا حق سمجھتے تھے-۱

پچھلے اسباق میں ہم نے مختصر طور پر قرآن مجید اور دین کے معارف و تعلیمات کے پہلو سے امیر المؤمنین علیہ السلام (اور دیگر ائمہ کرام علیہم السلام) کی خلافتِ الٰہی کو غصب کیے جانے کا جائزہ لیا اور بتایا کہ اس ظالمانہ رویے کے بالمقابل ائمہ علیہم السلام اور خاص طور پر امیر المؤمنین علیہ السلام نے ہر فراہم موقع سے استفادہ کرتے ہوئے پہلے تو دین اور خدا کے حقیقی احکام کو زندہ کیا اور دوسرے اپنے غصب کیے گئے حق کے کچھ حصے کو بیان کرتے ہوئے اسے حاصل کیا۔ لہٰذا ائمہ علیہم السلام کے ان اقدامات کو یہ سمجھ لینا کہ وہ معاشرے کی موجودہ حالت سے مطمئن اور خوش تھے اور ان کے اقدامات ناجائز حکمرانوں کی حکمرانی پر مہرِ تائید ہیں، ایک فضول اور بے بنیاد بات ہے۔ جب کہ اس کے برخلاف سوچ ائمہ علیہم السلام کی الٰہی حیثیت سے متعلق صحیح معلومات کے فقدان کو ظاہر کرتی ہے۔

اس کتاب میں آگے چل کر ہم اسلامی معاشرے کی حکمرانی میں امیر المؤمنین علیہ السلام کے خدائی حق پر غاصبانہ قبضے کے سلسلے میں مزید جامع طریقے سے اور تفصیل سے بات کریں گے جس کے

سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہی وہ بحث ہے جو شیعوں اور ان کی مخالفین کے درمیان سب سے زیادہ اختلافی اور بنیادی بحث ہے۔

اس کتاب میں اس موضوع پر ہماری بحث کا رویہ اثباتی نہیں ہے کہ ہم امامت کے سلسلے میں شیعہ نظریے کے دلائل و شواہد کی تحقیق کریں بلکہ ہم اپنے مخالفین کے شبہات کو دور کرتے ہوئے انھیں بتائیں گے کہ وہ حق سے کس قدر دور ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، ہم شیعہ نقطۂ نظر سے امامت کے دلائل کی جانچ نہیں کرتے ہیں بلکہ ہم نے مخالفین کے شکوک و شبہات کو دور کرنے پر توجہ دی ہے۔ شیعہ نقطۂ نظر کے مخالف افراد کا کہنا ہے کہ شیعوں کا یہ خیال کہ حکومت کا حق صرف اور صرف امیر المومنین علیہ السلام کو حاصل تھا، صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ عقیدہ خود امیر المومنین علیہ السلام کے طرز عمل اور ان کے بیانات سے متصادم ہے۔ لہٰذا اس تحریر کو آگے بڑھاتے ہوئے ہماری پوری توجہ اس نکتے پر مرکوز رہے گی کہ امیر المومنین علیہ السلام کا طرزِ عمل نہ صرف ان کے شیعوں کے حقیقی اور صحیح عقیدے پر سوالیہ نشان نہیں لگاتا بلکہ امیر المومنین علیہ السلام اور دیگر ائمۂ اطہار علیہم السلام کے بیانات اور طرز عمل ان کی مظلومیت کی دلیل اور شیعوں کے صحیح عقائد کی تصدیق کرتے ہیں جو ائمۂ اطہار کے طرز عمل اور ان کے بیانات سے ہی ماخوذ ہیں۔

بحث کے آغاز میں، ہم امیر المومنین علیہ السلام کے بیانات کا جائزہ لیں گے تاکہ یہ بات واضح کر سکیں کہ امام علیہ السلام کی نظر میں معاشرے پر حکمرانی، ان کا اور اہل بیت علیہم السلام کا خصوصی حق ہے جس پر دوسروں نے ناجائز قبضہ کر لیا۔

ایک نہایت اہم نکتے کی نشاندہی کرنا ضروری ہے کہ شیعہ عقیدے کے برخلاف، ایک رائے یہ ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام اپنے آپ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اسلامی معاشرے کی قیادت کا زیادہ اہل سمجھتے تھے اسی لیے بار بار اپنی خوبیوں اور فضیلتوں کی یاد دہانی کرایا کرتے تھے اور آپ کا ماننا تھا کہ لوگوں کو سب سے زیادہ قابل شخص کا انتخاب کرنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں امام علیہ السلام اور دوسروں

کے مابین اختلاف، اصولی اور بنیادی طور پر حکمراں کے انتخاب پر نہیں تھا اور آپ بھی شوریٰ اور عوام کے انتخاب کو قبول کرتے تھے بلکہ امیرالمؤمنین علیہ السلام اور دوسروں کے مابین اصل تنازعہ برتری اور افضلیت کا تھا اور امیرالمؤمنین علیہ السلام اپنے آپ کو افضل سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے اس طرز فکر کے حامل افراد امیرالمؤمنین علیہ السلام کے بیانات اور آپ کے شکوے شکایات کو اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح الیکشن میں کھڑے کچھ امیدواروں کے درمیان آپسی اختلاف ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "آخر میں امیرالمؤمنین علیہ السلام انتخابات کے نتائج سے مطمئن اور راضی ہوگئے اور اسے قبول کرلیا۔"[1]

اس وجہ سے ہم بھی امیرالمؤمنین علیہ السلام کے ایسے اقوال کا حوالہ پیش کریں گے جو واضح طور پر اس طرح کے نظریے کو مسترد کرتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ امام علیہ السلام حکومت کو اپنا حق سمجھتے تھے، جس کا تقرر خدا کی طرف سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے لوگوں کے سامنے اعلانیہ طور پر ہوا تھا۔

نہج البلاغہ کا خطبہ نمبر ۲

نہج البلاغہ کے دوسرے خطبے کے آخر میں امام علی علیہ السلام کا ایک بیان موجود ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ولایت اور حکمرانی کے معاملے میں امیرالمؤمنین علیہ السلام اور ائمہ علیہم السلام کے حق اور ان کی حقانیت کو ثابت کرنے کا بہترین ثبوت ہے:

«... لَا يُقَاسُ بِآلِ مُحَمَّدٍ صلی الله علیه وآله مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ أَحَدٌ. وَلَا يُسَوَّى بِهِمْ مَنْ جَرَتْ نِعْمَتُهُمْ عَلَيْهِ أَبَداً. هُمْ أَسَاسُ الدِّينِ

---

[1] بطور نمونہ رجوع فرمائیں: شرح ابن ابی الحدید اور حکومت در اسلام، حیدر علی قلمداران وراہی بہ سوی وحدت اسلامی، مصطفی طباطبائی۔

وعِمَادُ الْيَقِيْنِ. إِلَيْهِمْ يَفِيءُ الْغَالِي وبِهِمْ يُلْحَقُ التَّالِي. ولَهُمْ خَصَائِصُ حَقِّ الْوِلَايَةِ. وفِيهِمُ الْوَصِيَّةُ والْوِرَاثَةُ. الآنَ إِذْ رَجَعَ الْحَقُّ إِلَى أَهْلِهِ ونُقِلَ إِلَى مُنْتَقَلِهِ.»[1]

اس اُمت میں کسی کا موازنہ آلِ محمد علیہم السلام سے نہیں کیا جاسکتا۔ جن لوگوں پر ان کے احسانات ہمیشہ جاری رہے ہوں، وہ ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔ وہ دین کی بنیاد اور یقین کے ستون ہیں۔ (حق سے) آگے بڑھ جانے والے کو ان کی طرف پلٹ کر آنا ہے اور پیچھے رہ جانے والے کو ان سے آکر ملنا ہے۔ حق ولایت کی خصوصیات انھیں کے لیے ہیں اور انھیں کے درمیان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت اور ان کی وراثت ہے۔ اب یہ وقت وہ ہے کہ حق اپنے اہل کی طرف پلٹ آیا اور اپنی صحیح جگہ پر منتقل ہو گیا ہے۔[2]

[1] سید رضیؒ نے اس خطبے کو جنگ صفین کے بعد کا مانا ہے لیکن ابن ابی الحدید نے اسے امیرالمومنین علیہ السلام کے ابتدائی دورِ خلافت سے متعلق بتایا ہے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ابن ابی الحدید نے اس خطبے کو شیعوں کے دعوے کے مطابق قرار دیا ہے پھر بھی اس کی تاویل کرتے ہوئے اس کا رُخ افضلیت کے دعوے کی طرف موڑ دیا ہے۔

[2] وصیت و وراثت کے متعلق ابن ابی الحدید معتزلی نے لکھا ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام کی وصایت میں تو کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا، البتہ وراثت سے نیابت و جانشینی کی وراثت مراد نہیں ہے بلکہ وراثتِ علمی مراد ہے اگرچہ فرقۂ امامیہ اس سے خلافت و نیابت ہی مراد لیتا ہے۔ اگر بقول ابن ابی الحدید معتزلی کے وراثت سے وراثتِ علمی مراد لی جائے تب بھی ابن الحدید اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے کیونکہ اس معنی کی رُو سے بھی نیابت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق کسی دوسرے کو نہیں پہنچتا۔ جب کہ یہ امر مسلم ہے کہ خلافت کے لیے سب سے بڑی شرط اور ضرورت علم کی ہے۔ اس لیے کہ خلیفۃ الرسول کے اہم ترین فرائض میں مقدموں کا فیصلہ کرنا، شریعت کے مسائل حل کرنا، مشکل گتھیوں کو سلجھانا اور شرعی حدود کا اجرا کرنا ہے۔ اگر نائب رسول کے فرائض میں سے ان چیزوں کو الگ کر دیا جائے تو اس کی حیثیت صرف ایک دنیوی حکمراں کی رہ جاتی ہے اور اسے دینی اقتدار کا مرکز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لہٰذا یا تو حکومت کو خلافت سے الگ رکھیے یا جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کا وارث ہو اسے ہی خلافت کے منصب کا اہل سمجھیے۔ ابن ابی الحدید کی یہ تشریح اس صورت میں قابلِ لحاظ ہو بھی سکتی تھی کہ جب یہ فقرہ اکیلا آپ کی زبان پر آیا ہوتا لیکن اس موقع کو دیکھتے ہوئے کہ یہ جملہ خلافتِ ظاہری کے ان تک

اس خطبے میں کچھ نکات ہیں جن پر توجہ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اپنے اس بیان میں، امیرالمؤمنین علیہ السلام نہ صرف اہل بیت رسول علیہم السلام کی فضیلتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، بلکہ امت پر حقِ ولایت کو بھی اہل بیت علیہم السلام سے ہی مختص مانتے ہیں۔ وہ اپنے حق پر غاصبانہ قبضہ جمانے جیسے ماضی قریب میں رونما ہوئے واقعات کو باطل شمار کرتے ہیں۔

پہلا نکتہ: امیرالمؤمنین علیہ السلام کے مذکورہ بیان میں جو سب سے پہلا نکتہ موجود ہے، اس پر خاص توجہ کی ضرورت ہے جس میں آپؑ نے "حقّ الولایہ" لفظ استعمال کرتے ہوئے اس مقام پر دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اہل بیت علیہم السلام اور سب سے اوپر خود اپنے مقدس وجود کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ لوگوں پر اہل بیت علیہم السلام کو سرپرستی کا حق حاصل ہے اور اہل بیت علیہم السلام دوسروں پر حقِ ولایت رکھتے ہیں۔ یعنی جو چیز منتخب ہونے کی بنیاد ہے اور منتخب ہونے کے بعد اسے حاصل ہوتی ہے، وہ چیز امام علیہ السلام اپنے لیے پہلے سے ہی منتخب اور ثابت شدہ مانتے ہیں اور خود کو اور اپنے خاندان کو ان تمام خوبیوں اور حقِ ولایت کا اہل مانتے ہیں۔ امام علیہ السلام یہ نہیں فرماتے ہیں کہ انھیں عوام یا ماہرین کے کسی دوسرے گروہ کے ووٹ کو حاصل کرنے کا زیادہ حق حاصل ہے بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ صرف اور صرف اس خاندان کو ہی، جسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت و وراثت حاصل ہے، ولایت اور امارت کا حق حاصل ہے۔

لہٰذا بات الیکشن میں امیدواری کی نہیں ہے کہ مثال کے طور پر ہم کہیں کہ امام علیہ السلام کا شکوہ یہ تھا کہ کچھ لوگوں نے دھوکہ دہی کے ذریعے اور ایک ہوا بنا کے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ ہم

پہنچنے کے بعد کہا گیا ہے اور پھر اسی کے بعد: "اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰی اَھْلِہٖ" کا فقرہ موجود ہے، جس سے ابن ابی الحدید معتزلی کی یہ تاویل بالکل بے بنیاد معلوم ہوتی ہے، بلکہ وصایت سے بھی کوئی اور وصیت مراد نہیں، بلکہ وہ نیابت و خلافت ہی کی وصیت مراد معلوم ہوتی ہے اور وراثت بھی وراثت مالی اور وراثتِ علمی نہیں بلکہ حق امامت کی وراثت ہے جو صرف بربنائے قرابت نہیں بلکہ بربنائے اوصافِ کمال ان کے لیے منجانب اللہ ثابت تھی۔

اہلبیت جو دوسروں سے برتر تھے اور معاشرے کے امور کی ذمہ داری سنبھالنے کی ضروری اہلیت رکھتے تھے، عوام کا ووٹ حاصل کر کے ولایت کے حقدار قرار پاتے بلکہ امام علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ہی سے اپنے آپ کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کو حقِ ولایت کا مالک اور دوسروں کو ان کی طرف رجوع کرنے کا پابند سمجھتے تھے۔

خطبے میں موجود «لَهُمْ خَصَائِصُ حَقِّ الْوِلَايَةِ» کا جملہ علم نحو کے اعتبار سے جملۂ اسمیہ ہے جو گزشتہ بیان کو مزید مستند بناتا ہے کیونکہ جملۂ اسمیہ ثبوت پر دلالت کرتا ہے ساتھ ہی اس جملے میں خبر کا مبتدا پر مقدم ہونا علم نحو کے اعتبار سے حصر کو بیان کرتا ہے جو واضح کرتا ہے کہ ولایت کا حق صرف اور صرف اہل بیت علیہم السلام سے ہی مختص ہے۔

دوسرا نکتہ: مذکورہ خطبے میں ایک دوسرا نکتہ: «الْآنَ إِذْ رَجَعَ الْحَقُّ إِلَى أَهْلِهِ...» کا جملہ ہے جو واضح انداز میں اعلان کرتا ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ ہوا وہ ناجائز اور حقدار سے اس کے حق کو چھین کر زبردستی اس پر قبضہ جمانے جیسا تھا، یعنی اب جب کہ امیر المومنین علیہ السلام معاشرے کے حکمراں بن گئے ہیں تو ولایت کا حق اپنی جگہ لوٹ آیا ہے اور وہ وقت، جب معاشرہ امام علیہ السلام کی سرپرستی اور ولایت سے محروم تھا، وہ باطل کے تسلط اور باطل کی حکمرانی کا دور تھا۔

اس خطبے میں، امام علیہ السلام نے صرف اپنے حق کو بیان فرمایا ہے اور اس حق کے منبع کے تعین کے بارے میں خاموش رہے ہیں لیکن انتخاب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال کو امیر المومنین علیہ السلام کی طرف سے ناجائز اور ناحق قرار دینا صاف طور پر شوریٰ کی بنیاد کو مسترد کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ امام علیہ السلام یقینی طور پر اس شوریٰ کو کسی بھی طرح قبول نہیں کرتے تھے۔

ان ساری باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ خطبہ امیر المومنین علیہ السلام کی حکومت سے پہلے کی مدت کو واضح طور پر باطل اور ناجائز مانتا ہے اور اسی وجہ سے اس کی بنیاد، یعنی شوریٰ کے ذریعے خلافت کے انتخاب، کو بھی باطل قرار دیتا ہے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معزز کنبے کے

لیے ولایت کے حق کو طے شدہ قرار دیتا ہے اور اہل بیت علیہم السلام کے لیے اس حقِ الولایہ کو کسی کے مشورے یا انتخاب کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعہ جانتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ خطبہ واضح کرتا ہے کہ خدا کی طرف سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے اہل بیت علیہم السلام کو ولایت کا حق حاصل ہے نہ کہ کسی کے انتخاب کے ذریعے، ساتھ ہی یہ خطبہ امیر المؤمنین علیہ السلام کی الٰہی شخصیت کا ایک مختصر خاکہ بھی ہر انصاف پسند شخص کے سامنے آشکار کر دیتا ہے۔

سبق ۵

امیر المؤمنین علیہ السلام حکومت کو اپنا حق سمجھتے تھے -۲

پچھلے سبق میں، نہج البلاغہ کے دوسرے خطبہ کے ایک حصے کے مطابق، ہم نے بیان کیا: امیر المؤمنین علیہ السلام اپنے سے پہلے کے حکمرانوں کی حکمرانی کو باطل جانتے ہوئے ان کے انتخاب کی اساس کو بھی مسترد کرتے تھے جب کہ اس کے برخلاف اپنے اور اہلِ بیتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ولایت، اسلامی معاشرے کی سرپرستی اور رہنمائی کا حق مسلمہ اور محفوظ قرار دیتے تھے۔ اس سبق میں، ہم نہج البلاغہ کے ایک دوسرے خطبے کو پیش کریں گے جس میں امام علیہ السلام نے اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی بھی نشاندہی کی اور اپنے حق کو غصب کیا ہوا مانا ہے۔

نہج البلاغہ کا خطبہ نمبر ۶

اسلامی معاشرے پر حکومت اور اس کی حکمرانی کے حق پر ناجائز قبضہ سے متعلق امیر المؤمنین علیہ السلام بیانات کا ایک حصہ نہج البلاغہ کے چھٹے خطبے میں نظر آتا ہے۔ یہ خطبہ اس

قدر واضح ہے کہ اس کی شیعہ عقائد کے منافی کسی بھی طرح کی تفسیر و تاویل ہو ہی نہیں سکتی۔

امیر المؤمنین علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے جاری ہوئے اس خطبے کا سیاق و سباق یہ ہے کہ طلحہ اور زبیر کے فتنے کے دوران جب ان کی طرف سے امیر المؤمنین علیہ السلام کی بیعت توڑ دی گئی اور معاشرے میں انتشار پیدا کر دیا گیا تو حضرت امیر علیہ السلام نے فوج کو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا۔ اسی دوران انھیں مشورہ دیا گیا کہ طلحہ اور زبیر کے ساتھ جنگ نہ کریں اور چشم پوشی اختیار کریں۔

«وَ مِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمَّا اُشِيْرَ عَلَيْهِ بِاَنْ لَا يَتْبَعَ طَلْحَةَ وَ الزُّبَيْرَ وَلَا يَرْصُدَ لَهُمَا الْقِتَالَ: وَاللهِ! لَا اَكُوْنُ كَالضَّبُعِ: تَنَامُ عَلٰى طُوْلِ اللَّدْمِ حَتّٰى يَصِلَ اِلَيْهَا طَالِبُهَا وَ يَخْتِلَهَا رَاصِدُهَا. وَ لٰكِنِّيْ اَضْرِبُ بِالْمُقْبِلِ اِلَى الْحَقِّ الْمُدْبِرَ عَنْهُ. وَ بِالسَّامِعِ الْمُطِيْعِ الْعَاصِيَ الْمُرِيْبَ اَبَدًا. حَتّٰى يَاْتِيَ عَلَيَّ يَوْمِيْ. فَوَاللهِ! مَا زِلْتُ مَدْفُوْعًا عَنْ حَقِّيْ. مُسْتَاْثَرًا عَلَيَّ. مُنْذُ قَبَضَ اللهُ تَعَالٰى نَبِيَّهٗ حَتّٰى يَوْمِ النَّاسِ هٰذَا.»

جب آپ کو مشورہ دیا گیا کہ آپ طلحہ و زبیر کا پیچھا نہ کریں اور ان سے جنگ کی تیاری نہ کریں تو آپ نے فرمایا: خدا کی قسم! میں اس بجو کی طرح نہیں ہو سکتا جو لگاتار کھٹکھٹائے جانے سے سوتا ہوا بن جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا طلبگار (شکاری) اس تک پہنچ جاتا ہے اور گھات لگا کر بیٹھنے والا اس پر اچانک قابو پا لیتا ہے، بلکہ میں تو حق کی طرف بڑھنے والوں اور گوش بر آواز اطاعت شعاروں کو لے کر خطا و شک میں پڑنے والے گنہگاروں پر اپنی تلوار چلاتا رہوں گا، یہاں تک کہ میری موت کا دن آ جائے۔ خدا کی

قسم! جب سے اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو دنیا سے اٹھایا، برابر دوسروں کو مجھ پہ مقدم کیا گیا اور مجھے میرے حق سے محروم رکھا گیا۔[1]

امیرالمؤمنین علیہ السلام اس خطبے کے شروع میں، ایک ضرب المثل کی طرف اشارہ فرماتے ہیں جو کہ اس حقیقت کی طرف کنایہ ہے کہ طلحہ اور زبیر کی کارستانیوں پر ان کی پکڑ اور ان کا مواخذہ نہ کرنے کا مشورہ، بجو کے شکار کرنے کے طریقے کی طرح ہے۔ شکاری اس کے بھٹ یا سوراخ کے گرد گھیرا ڈال کر لکڑی سے یا پیر سے زمین کو تھپتھپاتا ہے اور وہ فریب کھا کر اپنے کو سویا ہوا ظاہر کرنے کے لیے پیر پھیلا دیتا ہے اور سوتا ہوا بن جاتا ہے اور شکاری اس کے پیروں میں پھندا ڈال کر اسے باہر کھینچ لیتا ہے۔ لہٰذا، امام علیہ السلام فرماتے ہیں: میں، بجو کی طرح اپنے آس پاس کے واقعات سے بے خبر نہیں ہوں کہ اچانک مجھے مخالفین کے حملے کا سامنا کرنا پڑے بلکہ میں ہمیشہ اپنے فرمانبرداروں کے ساتھ ان نافرمانوں کا مقابلہ کروں گا۔

امام علیہ السلام کے فرمان کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے خطبے میں استعمال ایک لفظ "مُسْتَأْثَرًا" کے معنی پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ لغت میں یہ بیان کیا گیا ہے: "اِسْتَأْثَرَ بِالشَّيءِ عَلىٰ غَيرِهِ أي خَصَّ بِهِ نَفسَهُ وَ استَبَدَّ بِهِ"[2] تمام چیزوں کو بس اپنے آپ کے لیے ہی

---

[1] جب امیرالمومنین علیہ السلام نے طلحہ و زبیر کے تعاقب کا ارادہ کیا تو آپ سے عرض کیا گیا کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے، ایسا نہ ہو کہ ان سے آپ کو کوئی گزند پہنچ جائے۔ اس کے جواب میں آپ نے یہ کلمات ارشاد فرمائے جن کا ماحصل یہ ہے کہ میں کب تک اپنا حق چھنتا ہوا دیکھتا رہوں گا اور خاموش بیٹھا رہوں گا۔ اب تو جب تک میرے دم میں دم ہے، میں ان سے لڑوں گا اور انھیں کیفر کردار تک پہنچا کر رہوں گا اور انھیں یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ میں بجو کی طرح بآسانی ان کے قابو میں آجاؤں گا۔ "ضبع" کے معنی بجو کے ہیں جو ایسا جانور ہے جسے بآسانی فریب دے کر شکار کر لیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں امیرالمومنین کو فریب دے کر فرائض کی ادائیگی سے نہیں روکا جا سکتا۔

[2] لسان العرب۔

مخصوص ماننا اور اس چیز کا تنہا مالک خود کو ہی سمجھنا۔ اس تمہید پر توجہ رکھتے ہوئے ہم امام علیہ السلام کے فرمان میں موجود نکات پر توجہ دیتے ہیں:

پہلا نکتہ: یہ خطبہ طلحہ اور زبیر کی نافرمانی اور ان سے نہ لڑنے کے مشورے کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا تھا، جب کہ ہمارے نظریے کے مخالفین کے عقائد کی رُو سے بھی فرمانروا کے حکم کی قطعی اطاعت کرنا اور اس کی بیعت کی خلاف ورزی نہ کرنا عوام پر لازم ہے اور لوگوں پر فرمانروا کا حق ہے کہ اس کے احکامات کو مانیں اور بیعت پر ثابت قدم رہیں۔ لہذا، یہ واضح ہے کہ اس حکم میں امام علیہ السلام کی شکایت آپ کی برتری وافضلیت کو تسلیم نہیں کیے جانے کے بارے میں نہیں ہے بلکہ ان کا حق ضائع کرنے کے بارے میں ہے۔

دوسرا نکتہ: اس خطبے میں، امام علیہ السلام اپنی شکایت کو طلحہ اور زبیر کی سرکشی تک ہی محدود نہیں کرتے بلکہ وہ اس صورتحال کا آغاز، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت سے قرار دیتے ہیں اور اس وقت سے لے کر اس خطبے کو بیان کرنے تک اپنے اوپر مسلسل ہو رہے ظلم و ناانصافی کو بیان فرماتے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ امام جس چیز کی شکایت کررہے ہیں وہ افضلیت و برتری کا لحاظ نہ کرنا نہیں ہے، کیوں کہ جو کچھ بھی پہلے ہوا وہ ختم ہو چکا ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے پہلے نکتے میں بیان کیا ہے، اب آپ کے حق میں جس چیز کا لحاظ نہیں کیا جارہا ہے وہ آپ کی مطلق اور قطعی اطاعت اور بیعت کا تسلسل ہے جسے آپ اپنی حکومت سے پہلے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات تک پھیلا ہوا مانتے ہیں۔

لہذا امام علیہ السلام اپنے اس بیان کے ذریعے یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سے ہی لوگوں پر یہ فرض تھا کہ وہ میری اطاعت کریں اور مجھے اپنا حکمراں بنائیں لیکن مجھ سے سرکشی اور نافرمانی کا سلسلہ رحلتِ پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہی شروع ہو گیا اور انھوں نے دوسروں کو مسندِ حکومت پر لا بٹھایا اور میرے سوا کسی اور کی اطاعت کی زنجیر اپنی گردن میں ڈال لی، لہذا انھوں نے میرے حق کو پامال کیا اور مجھے اپنے الٰہی منصب سے ہٹا دیا اور اب بھی جب وہ خود میرے پاس

آئے ہیں اور انھوں نے مجھے اپنا حاکم تسلیم کر لیا ہے، وہ میری بیعت کی خلاف ورزی کو جائز سمجھتے ہیں اور میری اطاعت نہیں کر رہے ہیں۔

ایک بار پھر یہ واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کا یہ بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حکمرانی کے لیے انتخاب کے طریقۂ کار کی درستگی سے مطابقت نہیں رکھتا اور کسی صورت اسے صحیح نہیں ٹھہراتا بلکہ امام علیہ السلام کا یہ خطبہ اپنے اس حق کے بارے میں ہے جو پہلے ہی سے آپ کے ہی لیے طے تھا کیونکہ اس خطبے کا محرک الیکشن یا ووٹنگ نہیں تھی۔ بنابریں جو کچھ بھی ابتدا سے اب تک پیش آیا وہ اس عظیم انسان کے حقوق کی پامالی اور ان پر ہوئے ظلم و ستم کے سوا کچھ نہیں ہے۔

نہج البلاغہ کا خطبہ نمبر ۱۴۴

ایک اور خطبہ جس کا ہم حوالہ یہاں پیش کریں گے نہج البلاغہ کا خطبہ نمبر ۱۴۴ ہے۔ اس میں بھی امیر المؤمنین علیہ السلام ولایت و امامت کو اپنے آپ سے ہی مختص بتاتے اور دوسروں کی حکمرانی کو باطل قرار دیتے ہیں:

«أَيْنَ الَّذِينَ زَعَمُوا أَنَّهُمُ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ دُونَنَا كَذِباً وَبَغْياً عَلَيْنَا أَنْ رَفَعَنَا اللهُ وَوَضَعَهُمْ وَأَعْطَانَا وَحَرَمَهُمْ وَأَدْخَلَنَا وَأَخْرَجَهُمْ بِنَا يُسْتَعْطَى الْهُدَى وَيُسْتَجْلَى الْعَمَى إِنَّ الأَئِمَّةَ مِنْ قُرَيْشٍ غُرِسُوا فِي هَذَا الْبَطْنِ مِنْ هَاشِمٍ لَا تَصْلُحُ عَلَى سِوَاهُمْ وَلَا تَصْلُحُ الْوُلَاةُ مِنْ غَيْرِهِمْ.»

کہاں ہیں وہ لوگ جو جھوٹ بولتے ہوئے اور ہم پر ستم روا رکھتے ہوئے یہ خیال کرتے ہیں کہ راسخون فی العلم ہم نہیں وہ ہیں؟ چونکہ اللہ نے ہم کو بلند کیا ہے اور انھیں گرایا ہے اور ہمیں (منصبِ امامت) دیا ہے اور انھیں محروم رکھا ہے اور ہمیں (منزلِ علم

میں) داخل کیا ہے اور انھیں دور کر دیا ہے۔ ہم ہی سے ہدایت کی طلب اور گمراہی کی تاریکیوں کو چھانٹنے کی خواہش کی جا سکتی ہے۔ بلا شبہ امام قریش میں سے ہوں گے جو اسی قبیلے کی ایک شاخ بنی ہاشم کی کشت زار سے ابھریں گے۔ نہ امامت کسی اور کو زیب دیتی ہے اور نہ ان کے علاوہ کوئی اس کا اہل ہو سکتا ہے۔

اس بیان کے آغاز میں، امیرالمؤمنین علیہ السلام اہل بیت علیہم السلام کی علمی حیثیت کی نشاندہی فرماتے ہیں اور علم قرآن مجید اور احکام دین کا علم رکھنے کا دعوی کرنے والے جھوٹوں کو باطل قرار دیتے ہیں۔ اس بنا پر کہ خدا نے اس خاندان کو علوم و معارف کا خزانہ عطا فرمایا ہے اور دوسروں کو اس سے محروم رکھا ہے، یہ لوگ خاندان وحی سے حسد اور بغاوت پر اتر آئے اور اس وجہ سے کچھ لوگوں نے جھوٹا دعوا کرتے ہوئے اپنے آپ کو صاحب فکر و نظر اور علم میں راسخ ہونے کے طور پر متعارف کرالیا۔

اس فضیلت کا ذکر کرنے کے بعد امیرالمؤمنین علیہ السلام اہل بیت علیہم السلام کی ایک اور فضیلت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اس خاندان کو ولایت و امارت کی شکل میں حاصل ہے۔ امام علیہ السلام کے تاثرات کو واضح کرنے کے لیے چند نکات پر غور کرنا ضروری ہے۔

پہلا نکتہ: امامت کے بارے میں صحابہ عام طور پر جو چیز سمجھتے تھے اس میں یقینا قیادت و حکمرانی کا مفہوم بھی شامل تھا کیونکہ امامت سے قیادت و حکمرانی کا مفہوم اُس ماجرے سے بالکل واضح ہو جاتا ہے جہاں مہاجرین نے سقیفہ میں انصار سے حکومت کا عہدہ حاصل کرنے کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث کا سہارا لیا تھا جس میں ارشاد ہے: "الائمة من قریش" یعنی سارے امام قریش سے ہوں گے۔ ہم آگے چل کر اس حدیث کے مزید مأخذ کا ذکر کریں گے۔

دوسرا نکتہ: عربی قواعد کی رو سے جب کبھی کوئی لفظ الف لام جنس کے ساتھ آکر مبتدا قرار پائے تو وہ اپنی خبر میں محصور ہوتا ہے، بنابریں مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مذکورہ حدیث میں

"الائمہ" مبتدا واقع ہوا ہے اس لیے یہ اپنی خبر میں محصور قرار پائے گا۔ یعنی اس حصے میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ائمہ صرف قریش قبیلے سے ہی ہوں گے، کسی دوسرے قبیلے سے نہیں۔

تیسرا نکتہ: خطبہ میں "**بطن**" لفظ خاص توجہ کا طالب ہے۔ یہاں حدیث نبوی بیان کرنے کے بعد، جس میں ائمہ کے قریش قبیلے سے ہی ہونے کی وضاحت کی گئی ہے، امیر المؤمنین علیہ السلام اس کی تشریح پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ائمہ کو قریش میں منحصر ماننا، اس قبیلے کے ایک خاص گروہ کے لیے ہے۔ اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ عرب کے قبائلی نظام میں داخلی تقسیمات موجود تھیں اور ہر طبقے اور گروہ کو ایک خاص لقب سے بلایا جاتا تھا۔

"قبیلہ، نَسبی رشتہ داری رکھنے والے بڑی آبادی کے گروہ کو کہا جاتا ہے جیسے: قبیلۂ ربیعہ اور مُضَر۔ اگلے مرحلے میں، اسے "عمارہ" کہا جاتا تھا۔ جیسے: مُضَر کے مقابلے میں قریش، اس کے بعد اسے "بطون" کہا جاتا تھا۔ بنی عبد مناف، بنی ہاشم اور دوسرے گروہ قریش کے بطون کہے جاتے تھے۔ اس کے بعد اس کو "فصیلہ" کہا جاتا تھا۔ جیسے: قریش کی بہ نسبت بنی ابی طالب، بنی العباس وغیرہ۔ یہ تقسیم غالباً زبیر بن بکار کی ہے۔ ابن کثیر نے فصیلہ کے بعد "عشیرہ" کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے: کوئی بھی عشیرے سے زیادہ انسان کے قریب نہیں ہوتا۔ کچھ افراد نے بہت سارے گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ ابن معاذ نے ۱۲ گروہوں تک شمار کیے ہیں۔"[1]

لہٰذا امیر المؤمنین علیہ السلام حدیث نبوی کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: امامت جو قریش میں منحصر ہے، وہ بنی ہاشم کے بطن سے تعلق رکھتی ہے اور قریش کے دوسرے گروہ اس سے محروم

---

[1] تاریخ سیاسی اسلام، سیرہ ی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱/۸۱، العقد الفرید سے منقول، السیرۃ الحلبیہ اور البدایۃ والنہایہ اور اسی طرح: بحار الانوار ۲۹/۶۱۳، النہایہ اور تاج العروس اور اہلسنت کے دیگر منابع و مآخذ سے منقول۔

ہیں۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں: دوسروں کی امامت باطل ہے کیونکہ بنی ہاشم کے علاوہ کسی میں بھی لوگوں کی ولایت اور امارت کی باگ ڈور سنبھالنے کی اہلیت ہی نہیں ہے۔

چوتھا نکتہ: امام علی علیہ السلام یہ نہیں فرماتے ہیں کہ امامت بنی ہاشم کے خاندان سے ہے بلکہ کہتے ہیں: ائمہ بنی ہاشم سے ہیں۔ امام علیہ السلام کے اس صریحی بیان کی اہمیت اس وقت واضح ہوجاتی ہے جب یہ سوچا جائے کہ ٹھیک ہے کہ امامت کی اصل اور جڑ بنی ہاشم کے ہی کشت زار میں لگائی گئی ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ اس کی شاخیں اور پتے قریش کے دوسرے بطون کے بھی نصیب میں آجائیں اور دوسرے قریش والے بھی اقتدار سنبھال لیں۔ امام علی علیہ السلام نے یہ کہہ کر کہ ائمہ بنی ہاشم سے ہی ہوں گے اور دوسروں میں اس منصب کی اہلیت نہیں ہے، ہر طرح کی بے جا تاویل و تفسیر کا منہ بند کردیا ہے۔

پانچواں نکتہ: امیرالمومنین علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جس حدیث کو مرکز قرار دیتے ہوئے خطبہ ارشاد فرمایا ہے وہ حدیث دونوں فرقوں کی مستند کتابوں میں مذکور ہے اور ہم نمونے کے طور پر یہاں پر صحیح بخاری سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں:

عَن عبدِ الملك عَن جَابِرِ بنَ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعتُ النَّبِي(ص). يقُولُ: يكونُ اِثْنى عَشَرَ اَميراً فَقَالَ كَلِمَةً لَمْ اَسْمَعْها. فَقَالَ اَبى اِنَّهُ قَالَ كُلُّهُم مِنْ قُرَيشٍ.[1]

راوی کہتا ہے: میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا: میرے بعد بارہ امیر ہوں گے۔ اس کے بعد کچھ ارشاد فرمایا جسے میں نے نہیں سنا تو میں نے اس بارے

---

[1] منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ، حبیب اللہ خوئی ۹/۳۰-۳۶، غایۃ المرام سے منقول، اسی طرح: عیون اخبار الرضا ۲/۱۱۱، باب فیما جاء عن الرضا من الاخبار المجموعۃ، ح ۲۷۳ اور بحار الانوار ۲۴/۱۵۷، ح ۱۷ اور گزشتہ حوالہ ۲۵/۱۰۴ اور گزشتہ حوالہ: ۳۱/۷۵ اور ۸۰، اہلسنت کے منابع و مآخذ سے اور الغدیر ۷/۲۳۱۔

میں اپنے والد سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا: پیغمبر اکرم نے فرمایا: یہ سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔

چھٹا نکتہ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کو سقیفہ میں جہاں امیر المؤمنین علیہ السلام سے ان کی خلافت کو غصب کیا جا رہا تھا، مہاجرین نے انصار کے سامنے پیش کیا تا کہ اس حدیث کے بہانے حکومت کا عہدہ خود سنبھالنے کے لیے انصار پر اپنی برتری کا اظہار کر سکیں اور اپنے لیے مسندِ خلافت کو حاصل کر لیں۔ اس سلسلے میں خود امیر المؤمنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

«.... قَالَ قَائِلُ قُرَيْشٍ: إِنَّ نَبِيَّ اَللّهِ(ص) قَالَ: اَلأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ. فَدَفَعُوا الأَنْصَارَ عَنْ دَعْوَتِهَا وَ مَنَعُونِي حَقِّي مِنْهَا.....»[1]

... تو پھر قریش کے کسی شخص (مہاجر) نے کہا: خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ائمہ قریش سے ہیں اور (اس طرح انھوں نے) اپنے دعوے سے انصار کو (حکومت و امارت) سے روک دیا اور مجھے بھی امامت میں جو حق حاصل تھا اس سے دور کر دیا...

قاضی عبد الجبلد معتزلی نے اپنی کتاب المغنی کے امامت والے حصے میں بھی اس حدیثِ نبویؐ کو ذکر کرنے کے بعد امامت کے شرائط میں اس حدیث کا حوالہ پیش کرتے ہوئے اسے اصحاب کے عمل کے موافق اور ان کی جانب سے عمل پیرا حدیث کے ضمن میں ذکر کیا ہے:

«وَ قَوَّوْا ذَالِكَ بِمَا كَانَ يَوْمَ اَلسَّقِيفَةِ مِنْ كَوْنِ ذَالِكَ سَبَباً لِصَرْفِ الأَنْصَارِ عَمَّا كَانُوا عَزَمُوا عَلَيْهِ لأَنَّهُمْ عِنْدَ هَذِهِ الرِّوَايَةِ انْصَرَفُوا عَنْ ذَالِكَ وَ تَرَكُوا اَلْخَوْضَ فِيهِ وَ قَوَّوْا ذَالِكَ بِأَنَّ أَحَداً

[1] بحار الانوار ۳۰/۱۰، محمد بن ابی بکر کی شہادت کے بعد حضرت امیر علیہ السلام کا خطبہ اور اسی سے مشابہ: کافی ۸/۳۴۳، ح ۵۴۱ اور ۳۱/۷۰۴، کتابِ سلیم سے منقول، ح ۱۴ اور ح ۱۱۔

لَمْ يُنْكِرْهُ فِي تِلْكَ الْحَالِ فَإِنَّ اَبَابَكْرٍ اسْتَشْهَدَ فِي ذَالِكَ بِالْحَاضِرِينَ فَشَهِدُوا بِهِ حَتّٰى صَارَ خَارِجاً عَنْ بَابِ خَبَرِ الْوَاحِدِ اِلَى الْاِسْتِفَاضَةِ»[1]

اصحاب نے اس حدیث کو تقویت بخشی اس چیز سے کہ جو سقیفہ میں پیش آئی اور اس حدیث کی وجہ سے انصار نے اپنے اس فیصلے سے پیچھے ہٹنا گوارا کر لیا جس کا وہ پورا ارادہ کر چکے تھے کیونکہ یہ روایت سن کر انھوں نے امارت کے عہدے کو حاصل کرنے کا فیصلہ ترک کر دیا اور اس حدیث پر چوں چرا نہیں کیا۔ اس حدیث کو اس حقیقت سے بھی تقویت ملی ہے کہ اس وقت کسی نے بھی اس کی تردید نہیں کی اور ابوبکر نے اس حدیث کی صداقت پر گواہوں سے گواہی طلب کی اور انھوں نے بھی اس حدیث کی صداقت پر گواہی دی یہاں تک کہ وہیں اسی مقام پر کہ جہاں صرف ابوبکر نے اس حدیث کو نقل کیا تھا یہ حدیث خبر واحد کے زمرے سے خارج ہو کر خبرِ مستفیض[2] میں تبدیل ہو گئی۔

---

(۱) بحار الانوار ۳۱/۸۱، المغنی سے منقول۔ ساتھ ہی رجوع کریں: شرح المواقف اور اسی کی طرح: شرح ابن ابی الحدید ۱۲/۸۹ اور الاحکام السلطانیہ، ماوردی /۷ اور مقدمۂ ابن خلدون ۱۳۲، الفصل السادس والعشرون اور الجامع لاحکام القرآن، قرطبی ۱/۲۶۴۔

(۲) خبرِ مستفیض یا حدیث مستفیض اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راویوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہو لیکن حدیث متواتر کے راویوں کی تعداد کے برابر نہ ہو۔ خبر مستفیض، خبر واحد اور خبر متواتر کی طرح حدیث کی تین قسموں میں سے ایک ہے۔ یہ تقسیم، راویان حدیث کی تعداد کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ علم درایہ کے ماہر بعض علماء اور نیز فقہاء، حدیث مستفیض کو مستقل طور پر حجت نہیں جانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس خبر میں، خبر واحد کی طرح راویوں کی چھان بین، حالات اور ان کے اعتبار و وثاقت کے سلسلے میں تحقیق ضروری ہے۔

سبق ۶

امیر المؤمنین علیہ السلام حکومت کو اپنا حق سمجھتے تھے - ۳

پچھلے سبق میں، امیر المؤمنین علیہ السلام کے خطبوں کے تناظر میں ہم سمجھ چکے کہ امام علیہ السلام نے، امامت کو اہل بیت علیہم السلام میں ہی منحصر کرتے ہوئے دوسروں کی ولایت و سرپرستی کو مسترد کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت سے لے کر آپؑ کے اقتدار میں آنے تک کے زمانے کو مسلسل اپنی مظلومیت اور اپنے حق پر دوسروں کے ناجائز قبضے کے جاری رہنے سے تعبیر فرمایا ہے۔

اس سبق میں ہم امیر المؤمنین علیہ السلام کے ایک اور بیان پر توجہ دیں گے۔

نہج البلاغہ کا خط نمبر ۲۸

امیر المؤمنین کے اقتدار میں آنے کے بعد، معاویہ نے آپ کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور عثمان کا خونبہا مانگنے کے بہانے شام کے عوام کو آپؑ کے خلاف اکسایا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جنگ صفّین جیسا واقعہ رونما ہوا۔ اس مدت میں رونما ہونے والے واقعات میں سے ایک خط و کتابت کا سلسلہ تھا جو امام علیہ السلام اور معاویہ کے درمیان پیش آیا۔ جہاں ایک طرف امیر المؤمنین علیہ السلام معاویہ کو

اپنی بیعت کی دعوت دیتے ہوئے اسے نافرمانی اور سرکشی سے دور رہنے کی دعوت دے رہے تھے تو وہیں معاویہ مختلف بہانوں سے۔حتیٰ کہ عثمان کے خونبہا کا مطالبہ کرتے ہوئے۔ امام علیہ السلام کی اطاعت سے انکار کر رہا تھا۔

ابن ابی الحدید نے اپنے استاد ابو جعفر یحیٰی بن ابی زید حسنی بصری النقیب (م ۶۱۳ ھ) کے حوالے سے نقل کیا ہے: معاویہ ان خطوط کے ذریعے چاہتا تھا کہ کسی صورت امام علیہ السلام کے بارے میں یہ ثابت کردے کہ حضرت اصحاب ثلاثہ کی فضیلت کے منکر اور ان سے دشمنی و عناد رکھتے ہیں اور سند میں آپ کی تحریر کو پیش کرے۔ اس طرح سے شام کے عوام کو بھی ورغلائے اور خود حضرت کے سپاہیوں میں بھی پھوٹ ڈالی جاسکے۔[1]

امام علیہ السلام اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے اور معاویہ کی چال سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اسی لیے آپؑ نے کھلے الفاظ میں گزشتہ خلفا کی مذمت اور تنقیص سے پرہیز کیا لیکن کسی صورت اپنی مظلومیت کو اور اپنے حق کے غصب کیے جانے کو بیان کرنے سے پیچھے نہیں ہٹے؛ انہی ساری باتوں کو سمیٹے نہج البلاغہ کا اٹھائیسواں خط ہے جو آپ نے معاویہ کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا ہے:[2]

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ۱۵/۱۸۴۔

[2] اس حصے میں ہم نے معاویہ کے خط کو شامل نہیں کیا ہے اور صرف امیر المومنین علیہ السلام کے جوابی خط کو نقل کیا ہے۔ ان شاء اللہ ایک مستقل حصے میں ہم امیر المومنین علیہ السلام اور معاویہ کے درمیان ہوئی خط و کتابت کے سلسلے کو مکمل طور پر نقد و نظر کی ترازو سے گزاریں گے۔ معاویہ نے یہ خط ابو امامہ باہلی کے ذریعے بھیجا تھا اور اس میں متعدد مسائل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ شیخین کے فضائل کا تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ اکثریت انھیں افراد کی تھی جو آپ کو چوتھا خلیفہ تسلیم کرتے تھے۔ اب اگر آپ ان کے بارے میں اپنی صحیح رائے کا اظہار کردیں تو قوم بدظن ہو جائے گی اور معاشرے میں ایک نیا فتنہ کھڑا ہو جائے گا اور اگر ان کے فضائل کا اقرار کرلیں تو گویا ان تمام کلمات کی تکذیب ہوگی جو کل تک اپنی فضیلت یا مظلومیت کے بارے میں بیان کرتے تھے۔ حضرت نے اس حساس صورت حال کا بخوبی اندازہ کرلیا اور واضح جواب دینے کے بجائے معاویہ

«... وَ زَعَمْتَ أَنِّي لِكُلِّ الْخُلَفَاءِ حَسَدْتُ، وَ عَلَى كُلِّهِمْ بَغَيْتُ. فَإِنْ يَكُنْ ذٰلِكَ كَذٰلِكَ فَلَيْسَ الْجِنَايَةُ عَلَيْكَ، فَيَكُونَ الْعُذْرُ إِلَيْكَ:

وَ تِلْكَ شَكَاةٌ ظَاهِرٌ عَنْكَ عَارُهَا

وَ قُلْتَ: إِنِّي كُنْتُ أُقَادُ كَمَا يُقَادُ الْجَمَلُ الْمَخْشُوشُ حَتّٰى أُبَايِعَ. وَ لَعَمْرُ اللّٰهِ! لَقَدْ أَرَدْتَ أَنْ تَذُمَّ فَمَدَحْتَ، وَ أَنْ تَفْضَحَ فَافْتَضَحْتَ! وَ مَا عَلَى الْمُسْلِمِ مِنْ غَضَاضَةٍ فِيْ أَنْ يَكُونَ مَظْلُومًا مَا لَمْ يَكُنْ شَاكًّا فِيْ دِيْنِهٖ، وَ لَا مُرْتَابًا بِيَقِيْنِهٖ! وَ هٰذِهٖ حُجَّتِيْ إِلٰى غَيْرِكَ قَصْدُهَا، وَ لٰكِنِّيْ أَطْلَقْتُ لَكَ مِنْهَا بِقَدْرِ مَا سَنَحَ مِنْ ذِكْرِهَا.»

اور تم نے یہ سوچا کہ میں نے سب خلفاء سے حسد کیا اور ان کے خلاف شورش کی۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس سے میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے کہ تم سے معذرت کروں، (بقول شاعر:) یہ وہ غلطی ہے جس سے تم پر کوئی حرف نہیں آتا۔

اور تم نے لکھا ہے کہ مجھے بیعت کے لیے یوں کھینچ کر لایا جا رہا تھا جس طرح نکیل پڑے اونٹ کو کھینچا جاتا ہے تو خالقِ ہستی کی قسم! تم اترے تو برائی کرنے پر تھے لیکن تعریف کرنے لگے، تم نے چاہا تو یہ تھا کہ مجھے رسوا کر دو لیکن خود ہی رسوا ہو گئے۔ بھلا مسلمان آدمی کے لیے اس میں کون سی عیب کی بات ہے کہ وہ مظلوم ہو جبکہ وہ نہ اپنے دین میں شک کرتا ہو، نہ اس کا یقین ڈانواڈول ہو۔ اگرچہ میری اس دلیل کا تعلق دوسروں سے ہے مگر جتنا مناسب تھا تم سے بھی بیان کر دیا۔

کو اس مسئلے سے الگ رہنے کی تلقین فرمائی اور اسے اس کی اوقات سے بھی باخبر کر دیا کہ یہ مسئلہ صدر اسلام کا ہے اور اس وقت تو تمہارا باپ بھی مسلمان نہیں تھا، تمہارا کیا ذکر ہے؟ لہٰذا ایسے مسائل میں تمہیں رائے دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ البتہ یہ بہرحال ثابت ہو جاتا ہے کہ ان فضائل میں تمہارے خاندان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس خط سے جو نکات موصول ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

پہلا نکتہ: اس بیان کے آغاز میں، امام علی علیہ السلام سابقہ خلفاء سے عدم رضایت اور مخالفت کو ضمنی طور پر قبول کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ وہ حقیقت ہے جس کا کوئی تعلق معاویہ سے نہیں ہے کہ اس کے لیے اس کے سامنے جوابدہ ہوا جائے یا اس سے معذرت کی جائے تاہم امام علیہ السلام کے اس بیان سے ماضی کے تلخ واقعات سے ان کا راضی نہ ہونا پوری طرح واضح ہے۔ بنابریں اس بات اور خلفاء کے عوامی انتخاب کو بنیاد بنانے کی بات میں سے کسی ایک کو ہی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے وہ نظریہ بنیادی طور پر ہی باطل ٹھہرتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ چونکہ امام علیہ السلام کو خلافت کے لیے نہیں چنا گیا اس لیے امام علیہ السلام ناراض تھے جب کہ امام علیہ السلام اس لیے ناراض نہیں تھے کہ انھیں چنا نہیں گیا بلکہ اس لیے ناراض تھا کہ ان کے الٰہی حق پر ناجائز قبضہ کیا گیا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے انھیں خلافت کے لیے منتخب کیے جانے کے باوجود ان کی خلافت اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کو ان سے غصب کیا گیا۔

یعنی اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ امام علیہ السلام شوریٰ اور لوگوں کی طرف سے انتخاب کو حاکم کی تقرری کی بنیاد سمجھتے تھے اور ساتھ ہی بہترین اور افضل شخص کو منتخب نہ کیے جانے کی شکایت بھی رکھتے تھے تو پھر شوریٰ یا لوگوں کے انتخاب کی وجہ سے جو بھی نتائج سامنے آئے ہیں اسے قبول نہ کرنا بے معنیٰ ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ امام علیہ السلام ایسے انتخاب کی مخالفت کریں اور اس سے راضی نہ ہوں جس کو وہ پہلے ہی قبول کرچکے ہوں۔ لہٰذا یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امام علیہ السلام حاکم کے انتخاب کی بنیاد شوریٰ یا لوگوں کی ووٹنگ کو قرار نہیں دیتے کیونکہ پچھلے تمام خلفاء سے آپؑ کی دائمی ناراضگی، اس صورتحال اور اس مفروضے کے ساتھ کہ امام علیہ السلام بھی خلیفہ اور حاکم کے انتخاب کو شورائی یا عوامی مانتے تھے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس لیے یہ نظریہ باطل ٹھہرتا ہے۔

دوسرا نکتہ: امام علیہ السلام کا ابوبکر سے بیعت کرنے کا انداز قابل توجہ ہے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام نے خط میں، معاویہ کے اس بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہ بیعت جبری تھی اور انھیں مجبور کرکے زبردستی بیعت لی گئی تھی، اس بیعت کو اپنے اوپر ہوئے ظلم کی علامت قرار دیا ہے۔ اس بیعت کو اہلسنت کے اس عقیدے کے تناظر میں دیکھنا چاہیے جس کے مطابق کسی کی حکومت اسی وقت مستند اور صحیح مانی جاسکتی ہے جب تمام اہل حلّ وعقد اس کی بیعت کرلیں۔ اس عقیدے کی رو سے اس بیعت کے بعد معاشرے کے باقی افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس فرد کی بیعت کرتے ہوئے اپنی وفاداری اور اطاعت کا مظاہرہ کریں اور اگر وہ اس کی بیعت کے بغیر مرجائیں تو ان کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔[1]

یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ امام علی علیہ السلام سقیفۂ بنی ساعدہ میں نہیں تھے اور ابوبکر کی خلافت کی بنیاد اس بیعت پر بنی تھی جو اس مقام پر کی گئی تھی۔ اسی لیے جب وہ لوگ سقیفہ سے مسجد نبوی آئے تو انھوں نے لوگوں کو اکٹھا ہوکر خلیفہ منتخب کرنے کی نہیں بلکہ براہ راست رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ سے بیعت کرنے کی دعوت دی۔ اسی طرح امیر المؤمنین علیہ السلام کو بھی بیعت کی جو دعوت دی گئی وہ «أَجِب خَلِيفَةَ رَسُولِ اللّه»[2] یعنی "رسول اللہ کے خلیفہ کی بیعت کیجیے" کے عنوان سے دی

---

[1] رجوع فرمائیں: امامت تطبیقی، عبدالعلی موحدی، اسی طرح رجوع فرمائیں: بحارالانوار ۲۸/ ۳۶۳-۳۶۸۔

[2] تفسیر عیاشی ۲/ ۶۶، ح ۷۶، سورۂ انفال کی آیت (۸)/ ۶۹ اور بصائرالدرجات/ ۲۹۵، الجزء السادس، باب ۵، ح ۶ اور کتاب سلیم/ ۱۳۸، ح ۴ اور الامامۃ والسیاسہ، ابن قتیبہ ۱/ ۱۳ اور بحارالانوار ۲۸/ الباب الرابع، ح ۱۱، ۱۳، ۳۵، ۶۹۔
کتاب سلیم، ح ۴ میں کچھ یوں آیا ہے: فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ ابُوبَكْر: أَجِبْ خَلِيفَةَ رَسُولِ اللهِ. فَأَتَاهُ الرَّسُولُ فَقَالَ ذَاكَ. فَقَالَ لَهُ عَلِيٌّ: سُبْحَانَ اللهِ! مَا أَسْرَعَ مَا كَذَبْتُمْ عَلَىٰ رَسُولِ اللهِ إِنَّهُ لَيَعْلَمُ وَيَعْلَمُ الَّذِينَ حَوْلَهُ أَنَّ اللهَ وَرَسُولَهُ لَمْ يَسْتَخْلِفَا غَيْرِي. وَذَهَبَ الرَّسُولُ فَأَخْبَرَهُ بِمَا قَالَ لَهُ. قَالَ: اِذْهَبْ فَقُلْ لَهُ: أَجِبْ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ أَبَابَكْرٍ. فَأَتَاهُ فَأَخْبَرَهُ بِمَا قَالَ. فَقَالَ عَلِيٌّ: سُبْحَانَ اللهِ! مَا وَاللهِ طَالَ الْعَهْدُ فَيَنْسَىٰ! وَاللهِ إِنَّهُ

گئی تھی اور امام ؑ نے ایسی بیعت سے صاف انکار کر دیا اور اس وقت تک اس کو قبول نہیں کیا جب تک زور زبردستی کر کے انھیں اس بیعت کرنے پر مجبور نہ کر دیا گیا۔

امام علی ؑ بیعت کے جبری ہونے کی معاویہ کی بات کی تائید کرتے ہوئے اسے خود پر ہونے والا ظلم بتاتے ہیں جس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ امام ؑ اس معیار کو ہی تسلیم نہیں کرتے جس کی بنیاد پر ابوبکر کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا کیونکہ اگر شوریٰ یا لوگوں کے ووٹوں سے ہی خلیفہ کو چننا الٰہی معیار ہوتا تو پھر علی ؑ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو خدا کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرتے، الیکشن اور شوریٰ کے سامنے حضرت علی ؑ کا سر نہ جھکانا اور اسے قبول نہ کرنا بتاتا ہے کہ امام علی ؑ سرے سے اس معیار کو ہی قبول نہیں کرتے تھے۔

ممکن ہے کہ اس بیان پر کچھ لوگ یہ اعتراض کریں کہ امام علی ؑ الیکشن یا شوریٰ کے معیار کو قبول تو کرتے تھے لیکن چونکہ اس میں سب سے افضل شخص کو منتخب نہیں کیا گیا تھا اس لیے انھوں نے اس کی مخالفت کی۔

اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ ہر وہ شخص جو شوریٰ یا الیکشن کو بنیادی طور خلیفہ کے انتخاب کے لیے معیار قرار دیتا اور اسے قبول کرتا ہے تو پھر اس کے ذریعے حاصل ہونے والے نتائج کو بھی شرعی طور سے قبول کرنا اس کے لیے ضروری ہے کیونکہ پھر اس کی مخالفت کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ جاتا۔ ہاں وہ شوریٰ اور ووٹنگ یا بیعت سے پہلے ہی اپنی افضلیت و صلاحیت کا پرچار اور ووٹ پانے کے لیے مقابلہ کر سکتا ہے لیکن جب نتیجہ سامنے آجائے تو پھر فیصلے اور نتیجے کی مخالفت کرنا، اس بات کو مانتے ہوئے بھی کہ شوریٰ اور الیکشن صحیح ہے، بے معنی ہے اور یہ مخالفت، شوریٰ کو قبول کرنے

لِيَعْلَمَ أَنَّ الاِسْمَ لاَ يَصْلُحُ إِلاَّ لِي وَلَقَدْ أَمَرَهُ رَسُولُ اللهِ وهُوَ سابِعُ سَبْعَةٍ. فَسَلَّمُوا عَلَيَّ بِإِمْرَةِ الْمُؤْمِنِينَ فاسْتَفْهَمَ هُوَ وَصَاحِبُهُ مِن بَيْنِ السَّبْعَةِ فَقَالاَ: أَمْرٌ مِنَ اللهِ وَرَسُولِهِ؟ فَقَالَ لَهُم رَسُولُ اللهِ: نَعَمْ حَقّاً مِنَ اللهِ وَرَسُولِهِ إِنَّهُ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ ....

کے معیار سے میل نہیں کھاتی کیونکہ اگر وہ شوریٰ کو قبول کرتا ہے تو پھر مخالفت سامنے نہیں آئے گی۔
بنابریں حضرت کی جانب سے شوریٰ کی مخالفت بتاتی ہے کہ بنیادی طور پر شوریٰ یا الیکشن ہی باطل ہے۔
دوسرے لفظوں میں اس طرح کے شورائی نظام میں کسی بھی مصلحت یا ضرورت کا انتخاب اس کے اصلی اراکین کرتے ہیں۔ اب اگر وہ بربنائے مصلحت کسی غیر افضل شخص کا بھی انتخاب کرلیں، تب بھی سبھی کے لیے ان کی بات قبول کرنا ضروری ہے کیونکہ اگر بنیاد اور ابتدا سے ہی شوریٰ کو قبول کرلیا ہے تو پھر شوریٰ کے اراکین کی باتوں کو بھی ماننا واجب ٹھہرے گا اور شوریٰ کی صوابدید ہر حال میں ذاتی صلاحیت پر مقدم رہے گی۔

بہر حال، امیر المؤمنین علیہ السلام کے اقدامات سے اور زور زبردستی کرکے آپ سے بیعت لیے جانے سے پتا چلتا ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام الٰہی انتخاب کے موجود ہونے کے بعد حاکم یا خلیفہ کے تقرر کے لیے کسی بھی طرح کی شوریٰ یا الیکشن پر یقین نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی اس کی پیروی کو ضروری سمجھتے تھے۔

تیسرا نکتہ امیر المؤمنین علیہ السلام اس بیعت کے انکار میں، اپنے آپ کو دین کی سچائی اور یقین کے صحیح ہونے کے طور پر متعارف کراتے ہیں اور فرماتے ہیں: جب میری گردن میں پھندہ ڈال کر مجھے زبردستی بیعت کے لیے مسجد النبی میں لایا گیا تو یہ میری مظلومیت کی علامت ہے کہ مجھ پہ ظلم ڈھایا گیا اور میں مظلوم تھا اور دوسرے حق کو غصب کر رہے تھے، جبکہ مجھے اپنے دین کے صحیح اور اپنے یقین کے سالم ہونے کے بارے میں ذرّہ بھی برابر شبہہ نہیں تھا۔ دوسرے الفاظ میں، امام علی علیہ السلام اپنی مخالفت کو عین دینداری مانتے تھے۔ یہ ایک اور ثبوت ہے کہ وہ شوریٰ کو یا لوگوں کے ذریعے اسلامی معاشرے کے حاکم و خلیفہ کی تقرری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

ابن ابی الحدید کا بیان

نہج البلاغہ میں امیر المؤمنین علیہ السلام کے خطبہ نمبر ۱۷۳[1] کے ضمن میں ابن ابی الحدید[2] کا ایک بیان ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے لیکن یہاں ہم سب سے پہلے خود خطبے کو پیش کریں گے تاکہ اسلامی معاشرے کی قیادت میں امیر المؤمنین علیہ السلام کی حقانیت کو بھی سامنے لاسکیں اور ساتھ ہی امیر المؤمنین علیہ السلام کے بیانات سے جو کچھ شیعہ سمجھتے اور بیان کرتے ہیں اس کی صحت پر مخالف گروہ کے ایک فرد کی جانب سے مہر تصدیق لگ جائے۔

«وَ قَدْ قَالَ قَائِلٌ: إِنَّكَ عَلَى هٰذَا الْأَمْرِ يَا بْنَ أَبِي طَالِبٍ لَحَرِيصٌ. فَقُلْتُ: بَلْ أَنْتُمْ وَاللّٰهِ! لَأَحْرَصُ وَ أَبْعَدُ، وَ أَنَا أَخَصُّ وَ أَقْرَبُ، وَ إِنَّمَا طَلَبْتُ حَقًّا لِي وَ أَنْتُمْ تَحُولُونَ بَيْنِي وَ بَيْنَهُ، وَ تَضْرِبُونَ وَجْهِي دُونَهُ. فَلَمَّا قَرَعْتُهُ بِالْحُجَّةِ فِي الْمَلَإِ الْحَاضِرِينَ هَبَّ، كَأَنَّهُ بُهِتَ لَا يَدْرِي مَا يُجِيبُنِي بِهِ! اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَعْدِيكَ عَلَى قُرَيْشٍ وَ مَنْ أَعَانَهُمْ! فَإِنَّهُمْ قَطَعُوا رَحِمِي، وَ صَغَّرُوا عَظِيمَ مَنْزِلَتِي، وَ أَجْمَعُوا عَلَى مُنَازَعَتِي أَمْرًا هُوَ لِي. ثُمَّ قَالُوا: أَلَا إِنَّ فِي الْحَقِّ أَنْ تَأْخُذَهُ، وَ فِي الْحَقِّ أَنْ تَتْرُكَهُ.»

---

(۱) یہ خطبہ مختلف نمبروں ۱۷۰-۱۷۲-۱۷۳ کے ساتھ نہج البلاغہ میں درج ہے۔

(۲) عزالدین ابو حامد عبد الحمید بن ہبۃ اللہ (۱۱۹۱-۱۲۵۳ عیسوی)، ابن ابی الحدید کے نام سے مشہور اپنے زمانے کے شاعر، ادیب اور نہج البلاغہ کے شارح تھے۔ وہ فقہی اعتبار سے شافعی اور کلامی اعتبار سے معتزلی تھے لیکن اس کے باوجود امام علی علیہ السلام کو تینوں خلفاء سے افضل سمجھتے ہوئے آپ کے خلاف قیام کرنے والوں کو باغی، فاسق اور اہل دوزخ سمجھتے تھے مگر یہ کہ وہ توبہ کرلیں۔

ایک شخص نے مجھ سے یہاں تک کہدیا کہ فرزند ابو طالب! آپ تو اس خلافت کے لیے للچائے ہوئے ہیں[1] تو میں نے کہا: خدا کی قسم! تم اس پر کہیں زیادہ حریص اور (اس منصب کی اہلیت سے) دور ہو اور میں اس کا اہل اور (پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے) نزدیک تر ہوں۔ میں نے تو اپنا حق طلب کیا ہے اور تم میرے اور میرے حق کے درمیان حائل ہو جاتے ہو اور جب میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں تو تم میرا رخ موڑ دیتے ہو۔ چنانچہ جب بھری محفل میں مَیں نے اس دلیل سے اس (کے کان کے پردوں) کو کھٹکھٹایا تو وہ چونکنا ہوا اور اس طرح مبہوت ہو کر رہ گیا کہ اسے کوئی جواب نہ سوجھتا تھا۔ خدایا! میں قریش اور ان کے مددگاروں کے خلاف تجھ سے مدد چاہتا ہوں کیونکہ انھوں نے قطع

---

[1] امیر المومنین علیہ السلام کے متعلق عمر نے اپنے آخری وقت میں جس خیال کا اظہار کیا تھا اسی کو سعد ابن ابی وقاص نے شوریٰ کے موقع پر دہراتے ہوئے حضرتؑ سے کہا کہ اے علیؑ! آپ اس منصب خلافت کے بہت حریص ہیں، جس کے جواب میں حضرتؑ نے فرمایا: جو اپنا حق طلب کرے اسے حریص نہیں کہا جا سکتا، بلکہ حریص وہ ہے جو اس حق تک پہنچنے میں مانع اور نااہلیت کے باوجود اسے حاصل کرنے کے درپے ہو۔ اس میں شک نہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام اپنے کو حق دار سمجھتے تھے اور اپنا حق طلب کرتے تھے لیکن اس حق طلبی سے حق ساقط نہیں ہو جاتا کہ اسے خلافت نہ دینے کے لیے وجہ جواز قرار دے لیا جائے اور اسے حرص سے تعبیر کیا جائے۔ اگر یہ حرص ہے تو پھر کون ایسا تھا جو حرص کے پھندوں میں جکڑا ہوا نہ تھا؟ کیا انصار کے مقابلے میں مہاجرین کی زور آزمائی، ارکانِ شوریٰ کی باہمی کشمکش اور طلحہ و زبیر کی ہنگامہ آرائی اسی حرص کا نتیجہ نہ تھی؟ اگر امیر المومنین علیہ السلام کو منصب کا لالچ ہوتا تو جب ابن عباس اور ابو سفیان نے بیعت قبول کرنے کے لیے زور دیا تھا تو آپ نتائج و عواقب سے آنکھیں بند کر کے ان کے کہنے پر اٹھ کھڑے ہوتے اور جب دور ثالث کے بعد لوگ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے تھے تو آپ بگڑے ہوئے حالات کا خیال کیے بغیر ان کی پیش کش کو فوراً قبول کر لیتے مگر آپ نے کسی بھی موقع پر ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے یہ ظاہر ہو کہ آپ منصب کو منصب کی حیثیت سے چاہتے ہیں بلکہ خلافت کی طلب تھی تو صرف اس لیے کہ شریعت کے خد و خال بگڑنے نہ پائیں اور دین دوسروں کی خواہشوں کی آماجگاہ نہ بنے، نہ یہ کہ دنیا کی کامرانیوں سے بہرہ اندوز ہوں کہ جسے حرص کہا جا سکے۔

رحمی کی اور میرے مرتبہ کی بلندی کو پست سمجھا اور اس (خلافت) کو، جو مجھ سے مخصوص تھی، ہتھیانے کے لیے اتحاد کر لیا۔ پھر کہتے یہ ہیں کہ حق تو یہی ہے کہ آپ اُسے لیں اور یہ بھی حق ہے کہ آپ اس سے دستبردار ہو جائیں۔

اس بیان میں امیر المؤمنین علیہ السلام واضح الفاظ میں جو کچھ بھی پیش آیا ہے اس کی جانب اشارہ فرماتے ہیں اور اس کا شکوہ کرتے ہیں خاص طور پر « اَمْرًا هُوَ لِیْ » والا حصہ صاف طور پر بیان کر رہا ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام خلافت کو اپنے لیے طے شدہ مانتے تھے اور اسے خود سے ہی مختص سمجھتے تھے۔ یہ بات اس جملے « امرا ھو لی » کے جملہ اسمیہ ہونے سے آشکار ہے اور پھر ساتھ ہی "لام" کا موجود ہونا، جو یہاں اختصاص کی علامت ہے، اس بات کو واضح کرتا ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام خلافت کو بس اپنا ہی حق سمجھتے تھے جس پر ناجائز قبضہ کر کے ان کے اس حق کو ان سے غصب کیا گیا۔

ابن ابی الحدید نے اس بیان کی تاویل کرتے ہوئے امام علی علیہ السلام کی شکایت کو ان کی افضلیت کا لحاظ نہ رکھے جانے کی طرف پلٹانے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ابن ابی الحدید نے کہا ہے: امام علیہ السلام کا حق یہ تھا کہ چونکہ وہ برتر تھے اس لیے انھیں کو شوریٰ کا ووٹ ملنا چاہیے تھا لیکن شوریٰ والوں نے اس افضلیت کا لحاظ نہیں کیا اور غیر افضل کا انتخاب مناسب سمجھا۔

اگرچہ ابن ابی الحدید کا یہی بیان خطبے کے سلسلے میں شیعہ تشریحات کے صحیح ہونے کو ظاہر کرتا ہے اور ان کی تاویل کی کمزوری کو واضح کرتا ہے لیکن اس خطبے کی تشریح کرتے ہوئے اپنی اس تاویل کی دلیل بھی ابن ابی الحدید نے پیش کی ہے جو اس بے جا تاویل کی کمزوری کو پہلے کے مقابلے میں اور بھی زیادہ نمایاں کرتی ہے:

« اِعْلَمْ اَنَّهُ قَدْ تَوَاتَرَتِ الْاَخْبَارُ عنه (ع) بِنَحْوٍ مِنْ هٰذَا الْقَوْلِ نَحْوُ قَوْلِهِ: »

آپ کے علم میں رہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے اس طرح کے بہت سارے بیانات تواتر کی حد تک موجود ہیں جیسے:

«مَا زِلْتُ مَظْلُوماً مُنْذُ قَبَضَ اَللّٰهُ رَسُولَهُ حَتّٰى يَوْمِ اَلنَّاسِ هٰذَا»

جب سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحلت فرمائی ہے، اس دن سے لے کر اب تک میں مظلوم رہا ہوں۔

«وَ قَوْلِه: اَللّٰهُمَّ أَخْزِ قُرَيْشاً فَإِنَّها مَنَعَتْنِي حَقِّي وَ غَصَبَتْنِي أَمْرِي.»

اور آپ کا یہ قول: اے خدا!، قریش کے لوگوں کو ذلیل فرمائیں کہ انھوں نے مجھے میرے حق تک پہنچنے نہیں دیا اور میری مسند پر غاصبانہ قبضہ جمالیا۔

«وَ قَوْلِه: فَجَزَى قُرَيْشاً عَنِّي اَلْجَوَازِيَ فَإِنَّهُمْ ظَلَمُونِي حَقِّي وَ اِغْتَصَبُونِي سُلْطَانَ اِبْنِ عَمِّي.»

اور آپ کا یہ فرمان: میری طرف سے اللہ ہی قریش کو ان کے کیے کا بدلہ دے کیونکہ انھوں نے مجھ پر ظلم ستم روا رکھا اور مجھ سے میرے چچازاد بھائی کی حکومت چھین لی۔

«وَ قَوْلِه: وَ قَدْ سَمِعَ صَارِخاً يُنَادِي أَنَا مَظْلُومٌ فَقَالَ هَلُمَّ فَلْنَصْرُخْ مَعاً فَإِنِّي مَا زِلْتُ مَظْلُوماً.»

اور آپ کا یہ قول: ایک فریاد کرنے والے کو یہ کہتے ہوئے سنا: "میں مظلوم ہوں" تو کہا، "آؤ، ایک ساتھ چل کر روئیں اور فریاد کریں کیوں کہ میں تو ہمیشہ ہی مظلوم رہا ہوں۔

«و قَوْلِه: وَ إِنَّهُ لَيَعْلَمُ أَنَّ مَحَلِّي مِنْهَا مَحَلُّ اَلْقُطْبِ مِنَ اَلرَّحَا.»

اور آپ کا یہ فرمان: حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ خلافت کی چکی کے لیے میری حیثیت مرکزی کیل کی ہے۔

«وَ قَوْلِهِ: أَرَى تُرَاثِي نَهْباً.»

اور آپ کا یہ قول: میں اپنی میراث کو لٹتے دیکھ رہا تھا۔

«وَ قَوْلِهِ: أَصْغَيَا بِإِنَائِنَا وَ حَمَلاَ اَلنَّاسَ عَلَى رِقَابِنَا.»

اور آپ کا یہ فرمان: ان دونوں نے ہمارے ظروف کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا اور لوگوں کو ہماری پشت پر سوار کر دیا۔

« وَ قَوْلِهِ: إِنَّ لَنَا حَقّاً إِنْ نُعْطَهُ نَأْخُذْهُ وَ إِنْ نُمْنَعْهُ نَرْكَبْ أَعْجَازَ اَلْإِبِلِ وَ إِنْ طَالَ اَلسُّرَى.»[1]

اور آپ کا یہ قول: ہمارا ایک حق ہے جو مل گیا تو خیر، ورنہ ہم اونٹ پر پیچھے ہی بیٹھنا گوارا کر لیں گے چاہے سفر کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو۔ (یعنی ہم حق سے دستبردار ہونے والے نہیں ہیں اور جب تک غاصبانہ دباؤ کا سامنا کرنا پڑے گا، کرتے رہیں گے۔)

«وَ قَوْلِهِ:ما زِلتُ مُسْتَأْثِراً عَلَيَّ مَدفوعاً عَمّا أَسْتَحِقُّهُ وَ أَسْتَوْجِبُهُ.»

---

(۱) معنی کا ما حصل یہ ہے کہ حضرت یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ اگر ہمارے حق کا، جو امام کے واجب الاطاعت ہونے کی حیثیت سے دوسروں پر واجب ہے، اقرار کر لیا گیا اور ہمیں ظاہری خلافت کا موقع دیا گیا تو بہتر، ورنہ ہمیں ہر طرح کی مشقتوں اور خواریوں کو برداشت کرنا پڑے گا اور ہم اس تحقیر و تذلیل کی حالت میں زندگی کا ایک طویل عرصہ گزارنے پر مجبور ہوں گے۔ بعض شارحین نے اس معنی کے علاوہ کچھ اور معنی بھی تحریر کئے ہیں اور وہ یہ کہ اگر ہمیں ہمارے مرتبہ سے گرا کر پیچھے ڈال دیا گیا اور دوسروں کو ہم پر مقدم کر دیا گیا تو ہم صبر سے کام لیتے ہوئے پیچھے ہٹنا گوارا کر لیں گے اور اونٹ کے پٹھے پر سوار ہونے سے یہی مراد ہے کیونکہ جو اونٹ کے پٹھے پر سوار ہوتا ہے وہ پیچھے ہوتا ہے اور جو پشت پر سوار ہوتا ہے وہ آگے ہوتا ہے۔ بعض نے یہ معنی بتائے ہیں کہ اگر ہمارا حق دے دیا گیا تو ہم اسے لے لیں گے اور اگر نہ دیا گیا تو ہم اس سوار کی مانند نہ ہوں گے جو اپنی سواری کی باگ دوسرے کے ہاتھ میں دے دیتا ہے کہ وہ جدھر اسے لے جانا چاہے لے جائے، بلکہ اپنے مطالبۂ حق پر برقرار رہیں گے چاہے لمبی مدت کیوں نہ گزر جائے اور ہم کبھی اپنے حق سے دستبردار ہو کر غصب کرنے والوں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں گے۔

اور آپ کا یہ فرمان: جب سے اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو دنیا سے اٹھایا، برابر دوسروں کو مجھ پر مقدم کیا گیا اور مجھے میرے حق سے محروم رکھا گیا۔

«وَ أَصْحَابُنَا يَحْمِلُونَ ذَلِكَ كُلَّهُ عَلَى ادِّعَائِهِ الْأَمْرَ بِالْأَفْضَلِيَّةِ وَ الْأَحِقِيَّةِ وَ هُوَ الْحَقُّ وَ الصَّوَابُ. فَإِنَّ حَمْلَهُ عَلَى الِاسْتِحْقَاقِ بِالنَّصِّ تَكْفِيرٌ أَوْ تَفْسِيقٌ لِوُجُوهِ الْمُهَاجِرِينَ وَ الْأَنْصَارِ.»

اور ہمارے ہم مسلک معتزلہ افراد نے ان تمام باتوں کو امیر المومنین کی برتری اور حقدار ہونے کے دعوے پر حمل کیا ہے اور یہی معنی صحیح بھی ہیں کیونکہ ان الفاظ کے ذریعے آپ کی برتری اور استحقاق کو کتاب خدا کے مطابق ثابت مان لیا جائے تو اس کا لازمہ یہ بنے گا کہ مہاجرین و انصار کی بڑی بڑی شخصیات کو کافر مانا جائے۔

«وَ لَكِنَّ الْإِمَامِيَّةَ وَ الزَّيْدِيَّةَ حَمَلُوا هَذِهِ الْأَقْوَالَ عَلَى ظَوَاهِرِهَا وَ ارْتَكَبُوا بِهَا مَرْكَباً صَعْباً. وَ لَعَمْرِي إِنَّ هَذِهِ الْأَلْفَاظَ مُوهِمَةٌ مُغَلِّبَةٌ عَلَى الظَّنِّ مَا يَقُولُهُ الْقَوْمُ. وَ لَكِنْ تَصَفُّحُ الْأَحْوَالِ يُبْطِلُ ذَلِكَ الظَّنَّ وَ يَدْرَأُ ذَلِكَ الْوَهْمَ فَوَجَبَ أَنْ يَجْرِيَ مَجْرَى الْآيَاتِ الْمُتَشَابِهَاتِ الْمُوهِمَةِ مَا لَا يَجُوزُ عَلَى الْبَارِي. فَإِنَّهُ لَا نَعْمَلُ بِهَا وَ لَا نُعَوِّلُ عَلَى ظَوَاهِرِهَا لِأَنَّا لَمَّا تَصَفَّحْنَا أَدِلَّةَ الْعُقُولِ اقْتَضَتِ الْعُدُولَ عَنْ ظَاهِرِ اللَّفْظِ وَ أَنْ تُحْمَلَ عَلَى التَّأْوِيلَاتِ الْمَذْكُورَةِ فِي الْكُتُبِ.»

لیکن امامیہ اور زیدیوں نے ان الفاظ کو ان کے ظاہری معنیٰ پر حمل کیا ہے اور اس طرح وہ ایک چابک دست مرکب پر سوار نظر آتے ہیں۔ (یہ مشکل اور پیچیدہ مسئلے میں گرفتار ہونے کا کنایہ ہے) اور میری جان کی قسم! یہ الفاظ تقریباً وہی معنیٰ ذہن میں آتے ہیں جنھیں امامیہ اور زیدی مسلک کے لوگ بیان کرتے ہیں لیکن حالات کو دیکھنے اور

پوری طرح سمجھنے کے بعد یہ شبہہ پوری طرح ختم ہوتا نظر آتا ہے اور یہ وہم دور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، متشابہ آیات کی ہی طرح، جو بظاہر کسی ایسی چیز کا گمان پیدا کرتی ہیں جو خدا کے لیے جائز نہیں ہیں، ان الفاظ کے ساتھ بھی سلوک رَوا رکھا جائے اس لیے کہ متشابہ آیات کے ظواہر پر عمل نہیں کیا جاتا کیونکہ جب ہم عقلی استدلال کا جائزہ لیں گے تو وہ ہم سے آیاتِ متشابہ کے ظاہر سے عدول کرنے کا تقاضا کریں گے اور کہیں گے کہ اس ضمن میں ان تاویلات کی طرف رجوع کیا جائے جن کا ذکر کتابوں میں موجود ہے۔

جیسا کہ دیکھا جا سکتا ہے کہ **سب سے پہلے تو:** ابن ابی الحدید نے امیر المومنین علیہ السلام کی جانب سے اس طرح کے بیانوں کو متواتر قرار دیا ہے، جس سے کم از کم جو بات سمجھ میں آسکتی ہے وہ یہ ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام موجودہ صورتحال سے کسی صورت راضی نہیں تھے۔ **دوسرے:** امیر المومنین علیہ السلام کے کلام کے ظاہری الفاظ کو ابن ابی الحدید نے امیر المومنین علیہ السلام کی حکمرانی کے لیے نصِ الٰہی اور ان کے اس الٰہی حق کو خلفاء کے ذریعے غصب کیے جانے کی دلیل مانا ہے لیکن وہ اپنی خام خیالی میں ان بیانات کی واضح ترجمانی کرنے والے الفاظ کو ان کے ظاہر سے تاویل کے مرحلے میں لے جاتے ہیں اور انھیں قرآنِ مجید کی آیاتِ متشابہات کی طرح قرار دیتے ہوئے عقلی استدلال کے مطابق کہتے ہیں کہ اس کے ظاہری معنیٰ کے برخلاف تشریح کی جانی چاہیے۔

لیکن اصل مسئلہ اسی قرینے اور عقلی دلیل کے بارے میں ہے جس کی وجہ سے امیر المومنین علیہ السلام کے کلام کے ظاہری معنی سے پلٹا جا رہا ہے اور اسے آیاتِ متشابہات کی طرح قرار دیا جا رہا ہے۔ **اول:** امام علیہ السلام کے کلام میں ایسا کوئی عقلی قرینہ ہے ہی نہیں جس کی وجہ سے ہم ان کے بیان کے ظاہری معنی کو چھوڑ دیں بلکہ جیسا کہ ہم نے پچھلے اسباق میں واضح کر دیا ہے کہ امام علیہ السلام کے ایسے واضح بیانات موجود ہیں جن سے روشن ہے کہ امام علیہ السلام اپنی افضلیت و برتری کی رعایت نہ کیے جانے کی شکایت نہیں کر رہے ہیں۔ **دوسرے:** ابن ابی الحدید نے جس قرینے کو اپنی تاویل کو پیش کرنے کے لیے استعمال کیا ہے وہ قطعی قرینہ اور دلیل ہے ہی نہیں کیوں کہ عدل صحابہ کا مسئلہ ایک

اختلافی مسئلہ ہے جس پر شیعوں اور سنیوں کے مابین تنازعہ پایا جاتا ہے اور شیعوں نے ٹھوس دلائل و براہین کی بنا پر عدالتِ صحابہ کے نظریے کو مسترد کر دیا ہے۔ اس لیے وہ معاملہ جو خود اختلافی ہو وہ کسی بھی صورت میں کسی دوسرے معاملے میں بطور دلیل پیش نہیں کیا جاسکتا لہٰذا اس اختلافی مسئلے کو بنیاد بنا کر امام علیہ السلام کے کلام کے ظاہر کو پلٹا نہیں جاسکتا اور اس کے ظاہر کی کوئی دوسری تاویل نہیں کی جاسکتی بلکہ معاملہ تو اس کے برخلاف ہے۔ امام علیہ السلام کے یہ الفاظ عدالتِ صحابہ کے نظریے کی بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں اور مہاجرین اور انصار کے بزرگوں کی پاکیزگی کے وہم کو پوری طرح نیست و نابود کر کے اس پر خطِ بطلان کھینچ دیتے ہیں!

سبق ۔ ۷

امیر المؤمنین علیہ السلام حکومت کو اپنا حق سمجھتے تھے ۔ ۴

پچھلے اسباق میں، نہج البلاغہ میں موجود امیر المؤمنین علیہ السلام کے بیانات کی روشنی میں ہم نے واضح کیا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اسلامی معاشرے کی حکمرانی کو اپنا حق اور خلفاء کی حکمرانی کو ظلم اور اپنے حق پر غاصبانہ قبضے کا مصداق بتاتے ہیں۔ چونکہ مخالف افراد بھی نہج البلاغہ کو قابل قبول مانتے ہیں، لہذا ہم نے نہج البلاغہ جیسی عظیم کتاب کے مطابق حکومت کے معاملے میں امیر المؤمنین علیہ السلام کے الٰہی عہدے کے غصب کیے جانے کی جانچ پڑتال شروع کی۔ ان اسباق کے تسلسل میں، ہم کچھ دیگر دستاویزات و شواہد کو مختصراً پیش کریں گے جن میں امیر المؤمنین علیہ السلام نے اپنے خدائی اور الٰہی حق کے بارے میں بھی بات کی ہے۔ یہ شواہد بھی بنیادی طور پر مخالفین کے ذریعے نقل کیے گئے ذرائع سے ہی ہیں اور خاص طور پر ان میں سے کچھ میں، انھوں نے روایت کے دیگر حصوں کی مخالفت شیعہ عقائد کی تردید کے حوالے سے کی ہے اور ہم "دریائے حقیقت پر شبہات کے بلبلے" نامی باب میں ان کی علمی خیانتوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے ان کے ذریعے پیش کیے گئے ثبوتوں کی غلط بیانی کو بے نقاب کریں گے۔

امیر المومنین علیہ السلام کا معاویہ کو خط

ابو اسحاق کی کتاب الغارات میں امیر المومنین علیہ السلام کا ایک خط موجود ہے جس کے کچھ حصوں کو ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

«مِنْ عَبْدِ اَللّٰهِ أَمِيرِ اَلْمُؤْمِنِينَ عَلَى بْنُ أَبِي طَالِبٍ إلى معاوِيةَ: انَّ اللّٰهَ تَبارَكَ وَتَعالىٰ خَلَقَ الخَلْقَ واخْتَارَ خِيَرَةً مِن خَلقِهِ واصطَفى صَفْوَةً مِنْ عِبادِهِ. يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ويَخْتارُ مَا كانَ لَهُمُ الخِيَرَةُ سُبْحَانَ اللّٰهِ وتَعَالَى عَمّا يُشرِكُونَ.»

خدا کے بندے امیر المومنین علیہ السلام علی ابن ابی طالب کی طرف سے معاویہ کے نام: بیشک پروردگار نے تمام مخلوقات کو زیورِ وجود سے نوازا اور پھر اپنی تمام مخلوقات میں سے کچھ کو منتخب فرمایا۔ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے پیدا اور جسے چاہتا ہے منتخب فرماتا ہے، اللہ پاک ہے اور بالاتر ہے ان (باطل معبودوں) سے جنھیں وہ (اللہ کا) شریک گردانتے ہیں۔

«.... أرسَلَ رَسولَهُ خِيَرَتَهُ وَصَفوَتَهُ بِالهُدى وَدينِ الحَقِّ وَأنزَلَ عَلَيهِ كِتابَهُ فيهِ تِبْيَانُ كُلِّ شَيءٍ مِن شَرائِعِ دينِهِ فَبَيَّنَهُ لِقَومٍ يَعْلَمُونَ.»

اپنے رسول کو جو، اس کا منتخب کردہ تھا، ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا اور اس پر کتاب نازل فرمائی جس میں دین کے تمام راستوں اور ہدایات کی تفصیل موجود ہے۔ پیغمبر نے بھی صاحبانِ فکر و نظر کے سامنے اس کے معانی و مطالب کی وضاحت فرمادی۔

«.... وَكانَت جُمْلَةُ تَبليغِهِ رِسالَةَ رَبِّهِ فيما أمَرَهُ وشَرَعَ وفَرَضَ وَقَسَّمَ جُمْلَةَ الدّينِ يَقُولُ اللهُ ﴿ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ﴾ هِيَ لَنا أهلَ البَيتِ لَيسَتْ لَكُمْ ثُمَّ نَهى عَنِ المُنازَعَةِ والفُرْقَةِ وأمَرَ بِالتَّسليمِ والجَماعَةِ فَكُنْتُمْ أنْتُمُ القَوْمَ الَّذينَ أقرَرْتُم لِلّهِ وَلِرَسولِهِ بِذلِكَ....»

آپ کی تبلیغ کا سارا سرمایہ خدا کے پیغام کو پہنچانا تھا؛ جو کچھ انھیں اللہ نے پہنچانے کا حکم دیا تھا، جو قوانین بیان کرنے لیے ان سے کہا تھا اور جو کچھ بھی ان پر واجب فرمایا تھا۔ اس طرح دین کے تمام کے تمام خلاصے کو بیان کرتے ہوئے اللہ نے ارشاد فرمایا «اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبانِ امر ہیں (فرمانروائی کے حقدار ہیں)» یہ شان ہم اہل بیت کی ہے تمہاری نہیں۔ پھر اللہ نے لڑائی جھگڑے اور تفرقہ بازی سے منع فرمایا ہے اور صلح و آشتی کا اور (حق پر) اکٹھے رہنے حکم فرمایا ہے اور تمھیں وہ تھے جنھوں نے (فتح مکہ کے موقع پر) خدا اور اس کے رسول کے سامنے اس کا وعدہ کیا تھا.....

«.... ألَم تَعْلَمْ يا مُعاوِيَةُ! أنَّ الائمةَ مِنّا لَيْسَتْ مِنْكُمْ.... وقال عزّوجل ﴿أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا﴾ وَقالَ لِلنّاسِ بَعْدَهُم فَمِنْهُم مَن آمَنَ ومِنْهُم مَن صَدَّ عَنهُ فَتَبَوَّأْ مقعدك من جَهَنَّمَ وَكَفَى بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا نَحنُ آلُ ابْراهِيمَ المَحْسُودُونَ وَأنْتَ الحاسِدُ لَنا.»

... اے معاویہ کیا تو نہیں جانتا! کہ ائمہ ہم (اہل بیت علیہم السلام) میں سے ہیں اور تم سے نہیں ہیں ... پروردگار ارشاد فرماتا ہے: «یا پھر وہ لوگوں سے اس لیے حسد کرتے ہیں

کہ اللہ نے ان کو اپنے فضل و کرم سے نوازا ہے۔ (اگر یہ بات ہے) تو ہم نے آلِ ابراہیم (ع) کو کتاب و حکمت عطا کی ہے اور ان کو بہت بڑی سلطنت عطا کی۔» ہم ہی آل ابراہیم ہیں جو محسود واقع ہوئے اور تو ہم سے حسد کرنے والا ہے۔

«.... نَحنُ أَهْلُ الْبَيْتِ اخْتَارَنَا اللهُ وَاصْطَفَانَا وَجَعَلَ النُّبُوَّةَ فِينَا وَالكِتَابَ لَنَا وَالحِكْمَةَ وَالعِلْمَ وَالايمَانَ وَبَيْتُ اللهِ وَمَسْكَنِ اسْمَاعِيلَ وَمَقَامُ ابْرَاهِيمَ فَالْمُلْكُ لَنَا. وَيْلَكَ يَا مُعَاوِيَةُ! وَنَحْنُ أَوْلى بِابْرَاهِيمَ وَنَحْنُ آلُه وَآل عِمْرَانَ وَأَوْلَى بِعِمْرَانَ وَآلِ لُوطٍ وَنَحْنُ أَوْلَى بِلُوطٍ وَآلِ يَعقوبَ وَنَحنُ أَولى بيعقوب وَآلِ مُوسَى وَآلِ هَارُونَ وَآلِ دَاوُدَ وَأَوْلَى بِهِمْ وَآلُ مُحَمَّدٍ وَأَوْلَى بِهِ وَنَحْنُ أَهْلَ البَيْتِ الَّذِينَ أَذهَبَ اللهُ عَنهُمُ الرِّجسَ وَطَهَّرَهُم تَطهِيراً.»[1]

---

[1] الغارات ۱/۱۹۵-۱۹۸۔ یہ خط تھوڑے اختلاف کے ساتھ بحار الانوار ۳۳/۱۳۳-۱۳۹ میں بھی مذکور ہے۔ الغارات عربی زبان میں ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن سعید بن ہلال ثقفی کوفی (متوفی ۲۸۳ھ) کی کتاب ہے۔ الغارات شیعہ تاریخ کے قدیمی مآخذ میں سے مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب امیر المؤمنین علیہ السلام کی زندگی کے منتخب خطبات، خطوط، نصائح اور خلافت کے زمانے اور بعد میں رونما ہونے والے واقعات جیسے جنگوں اور حالات کی دگرگونی کے بیان پر مشتمل ہے۔ امیر المؤمنین علیہ السلام کے زمانے میں معاویہ کی طرف سے ہونے والی غارتوں کے ذکر کی وجہ سے یہ کتاب الغارات کے نام سے مشہور ہوئی۔ مؤلف نے اس کتاب میں شیعہ و سنی راویوں سے استفادہ کیا ہے لہذا یہی وجہ ہے کہ یہ ایک مستغنی مصدر و ماخذ شمار ہوتی ہے۔ الغارات ہمیشہ سے شیعہ علما کی توجہ کا مرکز رہی اور وہ اس سے اپنی تالیفات کو مزین کرتے رہے ہیں۔ علامہ مجلسی اور ابن ابی الحدید کا اس کتاب کے زندہ رکھنے میں بنیادی کردار رہا۔ کتاب میں اصلی عنوان کے ساتھ ساتھ دیگر اہم موضوعات بھی ہیں، چنانچہ مؤلف نے امیر المؤمنین علیہ السلام کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ، انتظامی امور چلانے کی ان کی روش، مالی، سیاسی اور اخلاقی احوال نیز ان کے خطبات اور قیس بن سعد، محمد بن ابی بکر اور مالک اشتر جیسے مصر میں ان کے گورنروں کی روداد بھی ذکر کی ہے۔ اس کتاب سے قدیم زمانے سے شیعہ اور سنی استفادہ کرتے رہے ہیں۔ یہ کتاب

ہم ہیں اہل بیت! اللہ نے ہمیں منتخب فرمایا ہے، ہمیں خالص کرتے ہوئے نبوت کو ہمارے درمیان قرار دیا اور کتاب وحکمت، علم وایمان، بیت اللہ اور اسماعیل کا گھر اور مقامِ ابراہیم ہمارے لیے ہے اس لیے ملکیت وحکمرانی بھی ہمارے ہی لیے ہے۔ تجھ پر اللہ کی مار ہو اے معاویہ! ہم ابراہیم سے سب زیادہ قریب ہیں کیونکہ ہم ان کی آل ہیں، ہم آلِ عمران، آل لوط، آل یعقوب، آلِ موسیٰ وہارون اور داؤود ہیں اور ان سے سب زیادہ نزدیک ہم ہیں اور آلِ محمد ہم ہی ہیں، ہم وہ ہستیاں ہیں جن سے پروردگار نے ہر قسم کی ناپاکی کو دور رکھا ہے اور انھیں ایسا پاک رکھا ہے جو پاک رکھنے کا حق ہے۔

اس خط پر توجہ دینے سے چند نِکات کا پتہ چلتا ہے:

پہلا نکتہ: امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: جہاں خدا نے اپنے ارادہ واختیار سے مخلوقات کو خلق فرمایا ہے، وہیں اپنے بندوں میں سے کچھ کو منتخب کیا ہے۔ اس سلسلے میں دوسروں کے پاس کسی طرح کا کوئی اختیار نہیں ہے اور انھیں خدا کے انتخاب کے مقابلے میں انتخاب کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

تالیف، انداز تحریر، عناوین اور اسلوب کے لحاظ سے بہت اچھے طریقے سے مرتب ہوئی ہے اور نہایت ٹھوس سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب میں شیعہ ائمہ اور شیعہ راویوں سے بہت کم استفادہ کیا گیا ہے بلکہ اہل سنت کی صحاح ستہ اور مسانید کے مشہور راویوں سے خبریں منقول ہیں۔

خلاصۂ کلام اور نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ اس کتاب کے مؤلف ایک بڑے اور قابل اعتماد شیعہ عالم تھے لیکن ان کی کتاب کا ایک خطی نسخہ ہمارے پاس موجود ہے اور اس کے پیش نظر اسے اہل تشیع کی ایک معتبر کتاب کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اس خطی نسخے کا متن کتاب کی بہت سی جگہوں پر پڑھنا بہت مشکل ہے اور اس کی ترتیب بھی کافی بدلی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے مخالفین کا اس کتاب کو شیعہ عقائد کی ردّ کے لیے بطورِ حوالہ پیش کرنا علمی لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔ ہم نے صرف اس لیے اس کتاب سے شواہد پیش کردیے ہیں تاکہ واضح ہوجائے کہ جس کتاب سے ہمارے مخالفین قرائن وشواہد اور حوالہ پیش کرنے کی سعیٔ ناکام کررہے ہیں، اس میں بھی شیعہ نظریات کی تائید موجود ہے اس لیے سکے کا فقط ایک رُخ نہ دیکھا جائے اور دوسری طرف بھی نظر دوڑائی جائے تو بہتر ہے۔

دوسرا نکتہ: امام علیہ السلام واضح طور پر فرماتے ہیں: جس طرح خدا نے انبیاء کا انتخاب کیا اور کسی کو بھی حق نہیں ہے کہ وہ اس کے مقابلے میں پیغمبر کا انتخاب کرے، اسی طرح خدا نے ہم اہل بیت علیہم السلام کو امام، ولی امر اور لوگوں کا نگہبان بنایا ہے اور دوسروں کو اپنی طرف سے امام اور ولی امر منتخب کرنے کا حق نہیں ہے۔

تیسرا نکتہ: امام علی علیہ السلام قرآن کی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے، اپنے آپ کو آلِ ابراہیم کے طور پر متعارف کرواتے ہیں اور پھر اپنی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ملک بھی ہمیں ہی عطا کیا گیا ہے۔ لہذا، ہم پر اس الٰہی عطا کو دیکھتے ہوئے ہم سے حسد کیا گیا اور ہمیں اپنے حق سے محروم کر دیا گیا اور دوسروں نے اپنے لیے امام اور حکمراں کا انتخاب کرنا شروع کر دیا اور تم اے معاویہ! انھیں لوگوں میں سے ہو جو حسد کی آگ میں جل رہے ہیں۔

چوتھا نکتہ: اگرچہ اس خط کا مخاطب معاویہ ہے لیکن امام علیہ السلام اشارتاً فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے میری حکمرانی کو تسلیم نہیں کیا اور مجھے اپنا امام اور سرپرست نہیں مانا، انھوں نے مجھ سے حسد کیا اور خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتخاب پر اپنے انتخاب کو ترجیح دی ہے۔

لہذا امام کے اس خط سے واضح ہے کہ حکومت اور حکمرانی میں آپ کا حق من جانب اللہ تھا، ساتھ ہی آپ سے پہلے کی جو حکومتیں تھیں، وہ باطل، ناجائز اور غاصب حکومتیں تھی۔

معاویہ کے نام امیر المومنین علیہ السلام کا ایک اور خط

نہج البلاغہ میں خطوط کے باب میں نمبر ۱۰ کے تحت ایک خط موجود ہے جسے ابن ابی الحدید کے مطابق سید رضیؒ نے مکمل طور پر ذکر نہیں کیا اور اس کے ساتھ امام کے ایک اور بیان کے کچھ حصے کو ذکر کر دیا ہے کیونکہ اس کتاب سے سید رضیؒ کا اصل مقصد یہ تھا کہ امام علی علیہ السلام کے ان بیانات کو اکٹھا کر دیا جائے جو ان کی نظر میں فصیح و بلیغ تھے۔

بہر حال جب آپ اس خط کو مکمل طور پر ملاحظہ کریں گے تو پائیں گے کہ اس خط کے ایک حصے میں امیرالمؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی رہنمائی اور ان پر حکومت کا حق ہمیں اللہ کی جانب سے عطا کیا گیا ہے۔ وہ اسے اپنا الٰہی اور خدائی حق قرار دیتے ہیں:

«.... وَاعلَم أنَّ هذا الأمرَ لَو كَانَ إلَى النَّاسِ أو بِأَيدِيهِمْ لَحَسَدُونَا وَامْتَنُّوا بِهِ عَلَينا وَلَكِنَّهُ قَضاءٌ مِمَّنِ امتَنَّ بِهِ عَلَينا عَلَى لِسانِ نَبِيِّهِ الصَّادِقِ المُصَدَّقِ....»[1]

اے معاویہ! جان لے کہ اگر انتخاب کا حق لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ بلاشبہ ہم سے حسد کرتے اور اس کے ذریعے وہ ہم پر احسان جتاتے رہتے لیکن یہ تو خدا کا فیصلہ ٹھہرا جس نے ہمیں اپنے صادق و مصدّق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے اس منصب پر سرفراز فرمایا ہے۔

اس خط سے بھی واضح طور پر مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

پہلا نکتہ: امیرالمؤمنین علیہ السلام امام (اور حکمراں) کی تقرری کے معاملے کو لوگوں کے ہاتھوں سے خارج مانتے ہیں اور ساتھ ہی اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ بالفرض اگر یہ معاملہ ان کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ کسی صورت ہمیں یہ منصب نہ دیتے۔

دوسرا نکتہ: امیرالمؤمنین علیہ السلام کا کہنا ہے: ہمیں جو یہ منصب ملا ہے وہ لوگوں نہیں ملا ہے بلکہ ہمارے انتخاب میں الٰہی اور خدائی فیصلہ شامل حال ہے جس نے اپنے صادق و مصدّق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ہمارے انتخاب کا اعلان لوگوں کے درمیان کروایا۔

---

[1] نہج السعادہ فی مستدرک نہج البلاغہ، محمد باقر محمودی ۴/۲۳۶-۲۳۹، خط نمبر ۹۱، تاریخ دمشق سے منقول، ابن عساکر/۵۶ اور واقعہ صفین، نصر بن مزاحم/۱۰۸ اور ۱۰۹ اور شرح ابن ابی الحدید ۱۵/۸۶ اور ۸۷، رجوع فرمائیں، بحار الانوار ۳۲/۹۹-۱۰۱۔

لہٰذا اس بیان میں بھی امام علی علیہ السلام واضح طور پر اپنی حکمرانی کا معیار، الٰہی تقرر اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کو قرار دیتے ہیں اور حاکم کی تقرری کے لیے لوگوں کو موثر نہیں سمجھتے ہیں۔

معاویہ کے نام امیر المومنین علیہ السلام کا ایک اور خط

امیر المومنین علیہ السلام اور معاویہ کے مابین ہوئی خط وکتابت میں وہ خط اور اس کا جواب بھی شامل ہے جسے ابودرداء اور ابوہریرہ نے فریقین تک پہنچایا تھا۔[1] امیر المومنین علیہ السلام کے اس خط کا ایک حصہ ہمارے اس عقیدے کی مکمل تائید کرتا ہے جس کی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ حکومت کا عہدہ امیر المومنین علیہ السلام کو اللہ کی جانب سے حاصل تھا۔ امیر المومنین علیہ السلام سب پہلے فرماتے ہیں: اے معاویہ! اگر عوام کو حکمراں کا انتخاب کرنے کا حق ہے تو انھوں نے مجھے اپنا حکمراں بنالیا ہے اور پھر ایسی صورت میں تجھے بھی ان کے انتخاب کا احترام کرتے ہوئے سر جھکا دینا چاہیے۔ پھر امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

«...وَإِنْ كَانَ اَللّٰهُ هُوَ اَلَّذِي يَخْتَارُ وَلَهُ اَلْخِيَرَةُ فَقَدِ اخْتَارَنِي لِلْأُمَّةِ وَاسْتَخْلَفَنِي عَلَيْهِمْ وَأَمَرَهُمْ بِطَاعَتِي وَنُصْرَتِي فِي كِتَابِهِ الْمُنْزَلِ وَسُنَّةِ نَبِيِّهِ فَذَلِكَ أَقْوىٰ بِحُجَّتِي وَأَوْجَبَ بِحَقِّي.»[2]

...اور اگر خدا ہی (امام کا) انتخاب کرتا ہے اور اس کا اختیار اس کے ہی ہاتھوں میں ہے تو اس نے بلاشبہ مجھے اس امت کے لیے منتخب کیا ہے اور مجھے ان پر خلیفہ بنایا ہے۔ انھیں اس کتاب میں، جسے اس نے نازل فرمایا ہے اور اپنے نبی کی سنّت میں میری

---

[1] اس خط کے ایک حصے کو مخالفوں نے ہمارے غلط ہونے پر بطور دلیل پیش کیا ہے تاکہ وہ اپنی خام خیالی میں واضح کریں کہ امیر المومنین علیہ السلام معاشرے پر حکمرانی کے مسئلے کو الیکشن اور شوریٰ کے ذریعے حل کرنے کو صحیح مانتے تھے لیکن جب امام علیہ السلام کے بیان کو آخر تک پڑھیں تو ان کے بیان کی قلعی کھل جاتی ہے۔ اس مسئلے کی مکمل جانچ پڑتال ہم "دریائے حقیقت پر شبہات کے بلبلے" نامی باب میں کریں گے۔

[2] بحار الانوار ۳۳/۱۴۴، ح۴۲۱، کتاب سلیم سے منقول/۲۹۱-۲۹۲، ح۲۵۔

اطاعت کا حکم اور میری مدد کا فرمان دیا ہے اور یہ بات میری دلیل کو زیادہ مضبوط اور میرے حق کو اور زیادہ مستحکم کرتی ہے۔

اس بیان سے امیر المومنین علیہ السلام واضح فرمادیتے ہیں کہ خدا کی کتاب اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رُو سے لوگوں پر حکمرانی کا حق صرف اور صرف خود آپ کی ہی ذات گرامی کو حاصل ہے اور خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق آپؑ کی اطاعت اور مدد واجب ہے۔ لہذا معاویہ کو بھی خدا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے اور آپؑ کی مخالفت کرنا چھوڑ دینا چاہیے۔

سبق ۸

امیر المؤمنین علیہ السلام حکومت کو اپنا حق سمجھتے تھے-۵

پچھلے اسباق میں نہج البلاغہ کر حوالے سے امیر المؤمنین علیہ السلام کے بعض خطبات اور کچھ خطوط کے ذریعے ہم نے واضح کیا کہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جو کچھ بھی پیش آیا وہ امام علیہ السلام پر ظلم، آپ کے الٰہی حق پر ناجائز قبضے اور اسلامی معاشرے پر باطل حکمرانی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس سبق میں، ہم کچھ اور شواہد و دستاویزات پیش کریں گے۔

محمد ابن ابی بکر کی شہادت کے بعد امیر المؤمنین علیہ السلام کا خط

امیر المؤمنین علیہ السلام کا ایک اور خط وہ ہے جسے آپ نے جنگِ نہروان کے بعد اور معاویہ کے ذریعے مصر پر قبضے کے دوران اور مصر میں امام علیہ السلام کے گورنر محمد بن ابی بکر کی شہادت کے بعد لکھا تھا۔ اس خط کے لکھے جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کچھ لوگوں نے آپ سے ابو بکر، عمر اور عثمان کے بارے میں پوچھا اور امام علیہ السلام نے اس سوال کے بے موقع اٹھائے جانے پر ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے اپنے کاتب عبید اللہ بن ابی رافع کو حکم دیا کہ وہ امام علیہ السلام کے دس قابل بھروسہ افراد کو بطور گواہ جمع کریں

اور پھر یہ خط تحریر فرمایا اور حکم دیا کہ اسے ہر جمعے کو لوگوں کے سامنے پڑھیں۔[1] اس خط میں امیرالمومنین علیہ السلام کی حقانیت کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں:

«... فَمَضَىٰ لِسَبِيلِهِ(ص) وتَرَكَ كِتَابَ اللّٰهِ وَ أَهْلَ بَيْتِهِ إِمَامَيْنِ لاَيَخْتَلِفَانِ وَأَخَوَيْنِ لا يَتَخَاذَلاَنِ وَ مُجْتَمِعَيْنِ لاَ يَفْتَرِقَانِ وَلَقَدْ قَبَضَ اللّٰهُ نَبِيَّهُ وَلَأَنَا أَوْلَى بِالنَّاسِ مِنِّي بِقَمِيصِي هَذَا وَ مَا أُلْقِيَ فِي رَوعِي و لَاعُرِضَ فِي رَأْيِي أَنَّ وَجهَ النَّاسِ إِلَى غَيْرِهِ ... فَوَاللّٰهِ مَا أَدرِي إِلَى مَنْ أَشكُو فَإِمَّا أَنْ يَكُونَ الأَنْصَارُ ظُلِمَتْ حَقُّهَا وَ إِمَّا أَنْ يَكُونُوا ظَلَمُونِي حَقِّي بَلْ حَقِّي المَأْخُوذُ وَ أَنَا المَظْلُومُ.»

خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آوازِ حق پر لبیک کہی اور خدا سے جا ملے اور خدا کی کتاب اور اپنے اہل بیت علیہم السلام کو اپنے پیچھے چھوڑ گئے؛ دو ایسے اماموں کی حیثیت سے جو آپس میں جھگڑا نہیں کرتے اور دو بھائیوں کی طرح جو ایک دوسرے کو لاچار نہیں چھوڑتے اور ایک دوسرے سے کبھی نہ جدا ہونے والوں کی طرح؛ اور پھر اللہ نے اپنے نبی کی روح قبض فرمائی جبکہ میں دوسروں پر اپنی اس قمیص سے زیادہ حق رکھتا تھا اور نزدیک تھا۔ میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ لوگوں کا رجحان کسی اور جانب بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے خدا کی قسم! میں نہیں جانتا کہ مجھے کس سے شکایت کرنی چاہیے؟ یا انصار پر ظلم

---

[1] اس خط کے کچھ جملے الگ الگ جگہوں پر نہج البلاغہ میں آئے ہیں۔ سید ابن طاووسؒ نے اسے اپنی کتاب «کشف المحجۃ» میں شیخ کلینیؒ کی کتاب «رسائل» سے نقل کیا ہے۔ ہم نے اس خط کے کچھ حصے کو علامہ مجلسی کی کتاب بحارالانوار سے نقل کیا ہے۔ واضح رہے کہ اس خط کے بعض حصوں کو بنیاد بناتے ہوئے شیعوں کے مخالف افراد نے اسے شیعوں پر اعتراض جتاتے ہوئے حوالے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس اعتراض کی مکمل جانچ پڑتال ہم "دریائے حقیقت پر شبہات کے بلبلے" نامی باب میں کریں گے۔

کیا گیا ہے یا لوگوں نے مجھ پر ظلم کیا ہے بلکہ انصاف تو یہ ہے کہ میرا حق غصب کر لیا گیا، مجھ پر ظلم روا رکھا گیا اور میں مظلوم ہوں۔

«....وَلَولاً خَاصَّةٌ بَيْنَه وَ بَينَ عُمَرَ وَأمْرٌ كانَا رَضِياهُ بَينَهُما لَظَنَنتُ أنَّهُ لا يَعْدِلُهُ عَنِّي وقَدْ سَمِعَ قَوْلَ رَسُولِ اَللّهِ (ص) لِبُرَيْدَةَ آلأَسْلَمِيّ حِينَ بَعَثَنِي وَخَالِدُ بْنُ الوَلِيدِ إلى اَلْيَمَنِ وقَالَ: إذَا افْتَرَقْتُمَا فَكُلٌّ وَاحِدٍ مِنكُما على حِيَالِهِ وإذَا اجْتَمَعْتُمَا فَعَلِيٌّ عَلَيْكُمْ جَمِيعاً. فَأَغِزْنَا (فَغَزَوْنَا)وأَصَبْنَا سَبْيَاً فِيهِمْ خُوَيْلَةٌ [خُوْلَةٌ]بِنْتُ جَعْفَرٍ جَارِ الصَّفَا_وانَّما سُمِّيَ جَارَ الصَّفَا مِن حُسنِهِ_ فَأَخَذْتُ الْحَنَفِيَّةَ[الخَيْفَةَ]خُوْلَةَ واغْتَنَمَهَا خَالِدٌ مِنِّي وَبَعَثَ بُرَيْدَةَ إلَى رَسُولِ اَللّهِ(ص) مُحَرِّشاً عَلَيَّ فَأَخْبَرَهُ بِمَا كَانَ مِنْ أَخْذِي خُوْلَةَ. فَقَالَ: يَا بُرَيْدَةُ احَظُّهُ فِي الخُمُس أَكْثَرُ مِمَّا أَخَذَ إنَّهُ وَلِيُّكُم بَعدِي. سَمِعَها أَبُوبَكرٍ وَعُمَرُ وَهَذَا بُرَيْدَةُ حَيٌّ لَم يَمُتْ فَهَلْ بَعدَ هذا مَقَالٌ لِقائِلٍ!»

...(اور جب ابو بکر کی موت ہو گئی تو) اگر ابو بکر اور عمر کے درمیان ایک خاص قسم کا رشتہ نہ ہوتا جس پر وہ آپس میں پہلے ہی سے معاہدہ کر چکے تھے تو مجھے یقین تھا کہ دوبارہ سے وہ مجھ سے حکومت واپس نہیں لے گا کیونکہ اس نے بُریدہ سے کہے گئے رسول خدا ﷺ کے قول کو سنا تھا، جب اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے اور خالد بن ولید کو یمن بھیجا تھا اور ارشاد فرمایا تھا: اگر تم دونوں الگ ہو جاؤ تو پھر تم میں سے ہر ایک اپنے اپنے راستے پر چلنے کا اختیار رکھتا ہے اور اگر تم دونوں ساتھ رہو تو پھر علی تم سب پر حاکم ہے۔ چنانچہ ہم نے جنگ کی اور کچھ کو اسیر کیا جس میں جعفر کی بیٹی خولیہ

(خولہ) بھی شامل تھی، جسے اس کی خوبصورتی کی وجہ سے جار الصفا کا نام دیا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے خولہ کو مال غنیمت کے طور پر لے لیا لیکن خالد نے اسے مجھ سے لے کر اپنی تحویل میں لے لیا اور پھر بُریدہ کو میری شکایت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیج دیا اور آنحضرت کو صورتحال سے آگاہ کیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے بُریدہ! خمس میں علی کا حصہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو انھوں نے لیا ہے اور وہ میرے بعد تم سب کے سرپرست ہیں۔[1] ابوبکر اور عمر نے اسے سنا تھا اور تمہارے درمیان بریدہ بھی ابھی موجود ہے اور وہ دنیا سے رخصت نہیں ہوا ہے، کیا اس کے بعد بھی کسی کے پاس کچھ کہنے کو باقی ہے؟!

«... وإنَّما حُجَّتي أنّي وَلِيُّ هَذا الأَمْرِ مِنْ دُونِ قُرَيْشٍ أَنَّ نَبِيَّ اللَّهِ صَلَّى الله عليه وآله قَالَ الوَلاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ فَجَاءَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وآله يُعْتِقُ الرِّقَابَ مِنَ النَّارِ وأَعْتَقَهَا مِنَ الرِّقِّ فَكَانَ لِلنَّبِيِّ صلى الله عليه وآله وَلاءُ هَذِهِ الأُمَّةِ وَكَانَ لِي بَعْدَهُ مَا كَانَ لَهُ فَمَا جَازَ لِقُرَيْشٍ مِنْ فَضْلِهَا عَلَيْهَا بِالنَّبِيِّ صلى الله عليه وآله جَازَ لِبَنِي هَاشِمٍ عَلَى قُرَيْشٍ وَجَازَ لِي عَلَى بَنِي هَاشِمٍ يَقُولُ النَّبِيُّ صلى الله عليه وآله يَوْمَ غَدِيرِ خُمٍ مَنْ كُنْتُ مَوْلاهُ فَهَذَا عَلِيٌّ مَوْلاهُ إِلاَّ

---

[1] پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام اس وقت بھی صاحب ولایت تھے۔ اسی لیے آپ نے اپنی ولایت کا استعمال کیا کیونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امیر المومنین علیہ السلام کے اقدام کو ان کی موجودہ ولایت کی رو سے صحیح ٹھہراتے ہیں۔

أَنْ تدَّعي قُرَيْشٌ فَضْلَهَا عَلَى ٱلْعَرَبِ بِغَيْرِ ٱلنَّبِيِّ صلى ٱللّٰهُ عليه وَآلِه فَإِنْ شَاؤُوا فَلْيَقُولُوا ذَٰلِكَ...»[1]

اور اس بات پر میری حجت اور دلیل کہ ولیٔ امر اور امت کا حاکم، قریش نہیں بلکہ میں ہی ہوں، یہ ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: ولایت اور سرپرستی اسی کی ہے جو آزاد کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگ سے نجات دلانے والے عوامل کو فراہم کیا لہٰذا اس امت کی ولایت اور سرپرستی ان کے لیے تھی اور جو کچھ ان کا تھا؛ وہ ساری چیزیں آپؐ کے بعد میرے لیے طے اور ثابت شدہ ہیں۔ لہٰذا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض سے امت پر قریش کے لیے جو بھی فضیلت اور خوبی ثابت ہے، بنی ہاشم کو بھی اس طرح سے قریش پر بھی وہی فضیلت حاصل ہے اور میں بنی ہاشم پر بھی وہی فضیلت رکھتا ہوں۔ اس بنیاد اور اس دلیل کی وجہ سے جسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر کے دن ارشاد فرماتے ہوئے کہا تھا: جس کسی کا بھی میں آقا و مالک ہوں اس کے یہ علی بھی آقا و مالک ہیں۔ ہاں اگر قریش پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نظر انداز کر کے عربوں پر فوقیت کا دعویٰ کرنا چاہیں تو یہ الگ بات ہے۔

ان جملوں سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جو کچھ بھی پیش آیا، امیرالمؤمنین علیہ السلام اسے آنحضرت کے بیانات کے منافی مانتے ہیں۔ اپنے بیان کے آغاز میں وہ قرآن کے ساتھ اہل بیت علیہم السلام کی بقائے باہمی اور قرآن و اہل بیت علیہم السلام کے ایک ساتھ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد ہم اہل بیت علیہم السلام کو لوگوں کا امام بنایا اور سقیفہ میں جو کچھ ہوا وہ سوائے میرے مسلمہ حق کو غصب کیے جانے اور مجھ پر ظلم کیے جانے

[1] بحار الانوار ۳۰/۹-۱۴، ح ۱۔ اسی سے مشابہ: گزشتہ حوالہ ۲۹/۷، ۵۶، ح ۱۰ کا آخری حصہ۔

کے کچھ بھی نہیں تھا۔ دوسرے الفاظ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس بیان کو دلیل بناتے ہوئے جس میں انھوں نے امیر المومنین علیہ السلام کی خلافت کا علی الاعلان ذکر فرمایا تھا، امام علی علیہ السلام سقیفہ کے نتیجے کو اپنے اوپر ظلم اور اپنے حق پر ناجائز قبضہ سمجھتے ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ سقیفہ میں امیر المومنین علیہ السلام کا جو بھی حق غصب کیا گیا تھا وہ امت پر ان کی حکمرانی تھی جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کے فرمان سے خود ان کے سپرد کیا تھا۔

ساتھ ہی فتح یمن کے موقع پر رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے، امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت بھی اپنے بعد لوگوں کے سرپرست اور حکمراں کے طور پر انھیں کو متعارف کرایا ہے۔[1]

آخر میں امیر المومنین علیہ السلام لوگوں کے درمیان رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام اور آنحضرتؐ کی حیثیت بیان کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان کا جانشین بتاتے ہیں اور غدیر خم کی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے، اس جانشینی کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوتے ہوئے کوئی بھی مسلمان، امت کی حکمرانی کے لیے الیکشن اور شوریٰ کی بساط بچھانے کی جسارت نہیں کرے گا اور ایسا کرکے امت پر حکمرانی سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہٹانے اور انھیں اکثریت کے ووٹوں کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کرے

---

[1] یہ واقعہ اہلسنت کی کتابوں میں بھی کثرت کے ساتھ موجود ہے۔ بطور مثال: البدایہ والنہایہ، ابن کثیر ۷/ ۳۳۰-۳۳۲ اور سنن ترمذی ۵/ ۶۳۲، باب مناقب علی بن ابی طالب، ح ۳۸۱۲ اور المستدرک علی الصحیحین، حاکم نیشاپوری ۳/ ۳۹۷، ح ۳۶۳۵ اور ح ۳۶۳۶ اور گزشتہ حوالہ ۴/ ۷۲-۷۴، ح ۴۴۳۴ تا ۴۴۳۶ اور تاریخ دمشق، ابن عساکر ۴۵/ ۱۴۴-۱۵۴۔ (فٹ نوٹ سے منقول: صحیح بخاری، مسند احمد بن حنبل، کنز العمال، مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ۔

گا۔ ہاں اگر وہ جہالت کے راستے پر چلا جائے اور خدا اور اس کے رسول ﷺ کے دین سے منہ پھیر لے تو بے شک وہ ایسا کر سکتا ہے اور اس طرح کی بدبختی کے لیے راستہ کھلا ہوا ہے!

خطبۃ الوسیلہ

اس سبق کے آخر میں، ہم امیرالمؤمنین علیہ السلام کا ایک اور خطبہ پیش کریں گے جو خطبۃ الوسیلہ[1] کے نام سے مشہور ہے۔ جابر بن یزید کہتے ہیں: میں امام باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور شیعوں کے درمیان موجود اختلاف کے بارے میں شکایت کی۔ امام باقر علیہ السلام اس تنازعے کی اصل وجہ اور جڑ بیان کرتے ہوئے امیرالمؤمنین علیہ السلام کے اس خطبے کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے سات دن بعد اور قرآن جمع کر لینے کے بعد مدینے میں لوگوں کے سامنے ارشاد فرمایا تھا:

«... فَإِنَّ اللّٰهَ تَبَارَکَ اسْمُهُ امْتَحَنَ بِي عِبَادَهُ ... وَ اخْتَصَّنِي بِوَصِيَّتِهِ وَ اصْطَفَانِي بِخِلَافَتِهِ فِي أُمَّتِهِ فَقَالَ (ص) وَ قَدْ حَشَدَهُ الْمُهَاجِرُونَ وَ الْأَنْصَارُ وَ انْغَصَّتْ بِهِمُ الْمَحَافِلُ: أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ عَلِيّاً مِنِّي کَهَارُونَ مِنْ مُوسَى إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي.»

---

(1) خطبۂ وسیلہ، اللہ کی حمد و ثنا اور صفات خدا کے بیان سے شروع ہوتا ہے اور امام خطبے کے دوسرے حصے میں حدیث «إِنَّ عَلِيّاً مِنِّي کَهَارُونَ مِنْ مُوسَى إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي» اور واقعہ غدیر سے استناد کرتے ہوئے اپنی خلافت کو ثابت کرتے ہیں۔ آپ نے ابوبکر و عمر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان دونوں کی مذمت کی ہے۔ کچھ لوگوں کی نظر میں خطبۂ وسیلہ کے مضامین و مندرجات کے پیش نظر یہ خطبہ، شیعہ کتب کی عظمت اور اس کے تعارف کے لیے کافی ہے۔

بے شک اللہ نے میرے ذریعے اپنے بندوں کا امتحان لیا؛ رسول اللہ کی وصایت کو مجھ سے مخصوص کیا؛ ان کی امت میں ان کی خلافت کے لیے مجھے چنا؛ تو جب مہاجرین و انصار نے آپ کو گھیر رکھا تھا اور بزم میں جگہ بہت تنگ تھی اس وقت آپ نے فرمایا: اے لوگو! بے شک علی میرے لیے ویسے ہی ہیں جیسے موسیٰ کے لیے ہارون تھے، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

«فَعَقَلَ الْمُؤْمِنُونَ عَنِ الله نَطَقَ الرَّسُولُ إِذْ عَرَفُونِي أَنِّي لَسْتُ بِأَخِيهِ لِأَبِيهِ وَ أُمِّهِ كَمَا كَانَ هَارُونُ أَخَا مُوسَى لِأَبِيهِ وَ أُمِّهِ وَ لَا كُنْتُ نَبِيّاً فَاقْتَضَى نُبُوَّةً وَ لَكِنْ كَانَ ذَلِكَ مِنْهُ اسْتِخْلَافاً لِي كَمَا اسْتَخْلَفَ مُوسَى هَارُونَ حَيْثُ يَقُولُ: ﴿اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ﴾[1]»

چنانچہ مومنین خدا کے فرمان کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی اور ان کے الفاظ میں سمجھ گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میں ایک ہی والدین سے ان کا بھائی نہیں ہوں، بالکل اسی طرح جیسے ہارون، موسیٰ کے بھائی تھے اور اسی طرح میں نبی نہیں تھا (کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بیان) نبوت کا اقتضا کرے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بیان مجھے جانشین بنانے کے لیے تھا جیسا کہ موسیٰ نے ہارون کو امت میں اپنا جانشین بنایا تھا اور کہا تھا: «تم میری قوم میں میرے جانشین بن کر رہو۔ اور اصلاح کرتے رہو اور (خبردار) مفسدین کے راستہ پر نہ چلنا»۔

«وَ قَوْلُهُ (ص) حِينَ تَكَلَّمَتْ طَائِفَةٌ فَقَالَتْ نَحْنُ مَوَالِي رَسُولِ اللهِ(ص) فَخَرَجَ رَسُولُ اللهِ (ص) إِلَى حَجَّةِ الْوَدَاعِ ثُمَّ صَارَ إِلَى

---

[1] سورۃ الأعراف آیت ۱۴۲۔

غَدِيرِ خُمٍّ فَأَمَرَ فَأُصْلِحَ لَهُ شِبْهُ الْمِنْبَرِ ثُمَّ عَلَاهُ وَ أَخَذَ بِعَضُدِي حَتَّى رُئِيَ بَيَاضُ إِبْطَيْهِ رَافِعاً صَوْتَهُ قَائِلًا فِي مَحْفِلِهِ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ اللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالاهُ وَ عَادِ مَنْ عَادَاهُ.»

اور اسی طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور بیان جب کچھ لوگوں نے کہا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فدائی اور ان پر قربان ہونے والے ہیں۔ (رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے سرپرست ہیں) تو جب اللہ کے رسول نے حجۃ الوداع کا قصد کیا اور پھر غدیر خم پہنچے تو آپؐ کے حکم پر ایک منبر تیار کیا گیا، پھر آپ بالائے منبر تشریف لے گئے اور میرا بازو پکڑا اور اسے اٹھایا اور اس قدر اٹھایا کے میرے بغل کی سفیدی نمودار ہوگئی جبکہ آپؐ بلند اور اونچی آواز میں فرما رہے تھے: جس جس کا میں مولا ہوں اس اس کے یہ علی مولا ہیں، خدایا! تو بھی اسی کا دوستدار رہنا جو اسے دوست رکھے اور اس کا دشمن رہنا جو اس سے دشمنی کرے۔

«... وَ لَئِنْ تَقَمَّصَهَا دُونِيَ الْأَشْقَيَانِ وَ نَازَعَانِي فِيمَا لَيْسَ لَهُمَا بِحَقٍّ وَ رَكِبَاهَا ضَلَالَةً وَ اعْتَقَدَاهَا جَهَالَةً فَلَبِئْسَ مَا عَلَيْهِ وَرَدَا وَ لَبِئْسَ مَا لِأَنْفُسِهِمَا مَهَّدَا.»

اور وہ دونوں بدقسمتی کے مارے خلافت کی قمیص مجھ سے پہلے ہی اپنے بدن پر ڈال بیٹھے اور مجھ سے اس معاملے میں جھگڑا کرنے لگے جس پر ان کا کوئی حق تھا ہی نہیں اور گمراہی کی بنا پر اس (مرکبِ خلافت) پر سوار ہوگئے اور اسے جہالت کی بنا پر اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ بلاشبہ انھوں نے بہت ہی برے انجام کا انتخاب کیا اور اپنے لیے بہت ہی بدترین مقام کو تیار کر لیا۔

«... حَتَّى إِذَا دَعَا اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ نَبِيَّهُ (ص) وَ رَفَعَهُ إِلَيهِ ... إِلَى أَنْ رَجَعُوا عَلَى الْأَعْقَابِ.... وَ غَيَّرُوا آثَارَ رَسُولِ اللهِ ص.... وَ اسْتَبْدَلُوا بِمُسْتَخْلَفِهِ بَدِيلًا اتَّخَذُوهُ وَ كَانُوا ظَالِمِينَ وَ زَعَمُوا أَنَّ مَنِ اخْتَارُوا مِنْ آلِ أَبِي قُحَافَةَ أَوْلَى بِمَقَامِ رَسُولِ اللهِ (ص) مِمَّنِ اخْتَارَ رَسُولُ اللهِ (ص) لِمَقَامِهِ ... أَلَا وَ إِنَّ أَوَّلَ شَهَادَةِ زُورٍ وَقَعَتْ فِي الْإِسْلَامِ شَهَادَتُهُمْ أَنَّ صَاحِبَهُمْ مُسْتَخْلَفُ رَسُولِ اللهِ ص فَلَمَّا كَانَ مِنْ أَمْرِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَةَ مَا كَانَ رَجَعُوا عَنْ ذَلِكَ وَ قَالُوا إِنَّ رَسُولَ اللهِ ص مَضَى وَ لَمْ يَسْتَخْلِفْ فَكَانَ رَسُولُ اللهِ(ص) الطَّيِّبُ الْمُبَارَكُ أَوَّلَ مَشْهُودٍ عَلَيهِ بِالزُّورِ فِي الْإِسْلَامِ وَ عَنْ قَلِيلٍ يَجِدُونَ غِبَّ مَا [يَعْلَمُونَ وَ سَيَجِدُونَ التَّالُونَ غِبَّ مَا أَسَّسَهُ الْأَوَّلُونَ.»[1]

... یہاں تک کہ پروردگار نے اپنے رسول کو اپنی بارگاہ میں بلالیا اور انھیں اپنے پاس اوپر اٹھالیا... (امت) اپنے ماضی پر پلٹ گئی (مرتد ہوگئی)... اور رسول اللہ کے آثار کو بدل کر رکھ دیا... اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصلی جانشین کی جگہ ناجائز طریقے سے ایک ایسے شخص کو لا بٹھایا جسے انھوں نے خود چنا تھا۔ انھوں نے اپنے باطل خیال میں گمان کیا کہ وہ شخص جسے انھوں نے آل ابی قحافہ سے منتخب کیا ہے وہ رسول خدا کے مقام پر بیٹھنے کا اُس سے زیادہ حقدار ہے جسے خود رسول اللہ نے اپنی جانشینی کے لیے مقرر فرمایا ہے۔... جان لو کہ اسلام میں سب سے پہلی باطل اور ناجائز گواہی ان لوگوں کی تھی جنھوں نے اپنے ساتھی (ابوبکر) کے بارے میں گواہی دی کہ وہ رسول خدا کی طرف

(۱) کافی ۸/۲۶-۲۹۔

سے جانشین مقرر ہوا تھا، یہاں تک کہ جب سعد بن عبادہ والا واقعہ پیش آیا تو وہ اپنی بات سے پلٹ گئے اور کہنے لگے: رسول خدا نے اس حالت میں وفات فرمائی کہ انھوں کسی کو اپنی جانشینی کے لیے منتخب نہیں فرمایا تھا۔ اس طرح پاک وطیب رسول خدا، اسلام کی وہ پہلی شخصیت بن گئے جس پر جھوٹ باندھا گیا اور عنقریب ہی انھیں اس چیز کا نتیجہ بھگتنا ہوگا جس کی بنیاد انھوں نے رکھی تھی۔

اب آخر میں اس کے بعد کچھ کہنے کو باقی نہیں بچتا ہے سوائے امیرالمومنین علیہ السلام کے اس بیان کو دوہرانے کے جس میں آپ فرماتے ہیں:

«فَهَل بَعدَ هٰذَا مَقالٌ لِقائِلٍ!»

کیا اس کے بعد بھی کسی کہنے والے کے لیے کہنے کو کچھ رہ جاتا ہے؟

سبق ۹

امیر المؤمنین علیہ السلام کے مناظرے

پچھلے اسباق میں ہم نے اس بات کی وضاحت کی کہ مخالفین کے دعووں کے باوجود ہم پاتے ہیں کہ امیر المؤمنین علیہ السلام اپنے متعدد بیانات میں امت پر حکومت کرنے میں اپنی حقانیت اور حکومت کو غصب کرنے والوں کے باطل پر ہونے کو بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: حکومت کا عہدہ خداوند متعال کی طرف سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توسط سے انھیں اور ان کی معزز اولاد کو سونپا گیا ہے۔

ان اسباق کے تسلسل میں ہم امیر المؤمنین علیہ السلام کے ایک اور استدلال کو پیش کرتے ہیں جس میں آپ نے اپنی حقانیت کو ثابت کیا ہے اور غاصب حکمرانوں کی حکومت کو ناجائز اور باطل ٹھہرایا ہے۔ امیر المؤمنین علیہ السلام نے اس طرح کے بیان میں ایک ایسا طریقہ استعمال کیا ہے جس میں اپنے انتخاب کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتخاب سے قطع نظر کرتے ہوئے خود جن دعووں کی بنیاد پر غاصبانِ خلافت نے خلافت پر قبضہ جمایا تھا انھیں دعووں کی رو سے ان کی حکومت کے باطل اور ناجائز ہونے کو

برملا کیا ہے۔ اس دلیل میں امیر المؤمنین علیہ السلام بنیادی طور پر انصار کے خلاف مہاجرین کے اپنائے گئے دلائل کو ہی بطور دلیل پیش فرماتے ہیں۔

بیعت کے وقت امیر المؤمنین علیہ السلام کا احتجاج

ان مواقع میں سے ایک جہاں امیر المؤمنین علیہ السلام نے جدال الاحسن کے ذریعے غاصبانِ خلافت کے عمل کو باطل ٹھہرایا ہے ان کا وہ بیان بھی ہے جب غاصبوں نے آپؑ کے گھر پر حملہ کیا اور گھر کے سارے ہی افراد کو باہر نکال کر کے ان سے بیعت لی۔ یہاں تک کہ تمام بنی ہاشم سے زبردستی بیعت لے لی گئی اور امیر المؤمنین علیہ السلام تنہا بچ گئے:

«فَقَالُوا لَهُ: بَايِعْ أَبَا بَكْرٍ. فَقَالَ عَلِيٌّ(ع): أَنَا أَحَقُّ بِهَذَا الأَمْرِ مِنْهُ وَ أَنْتُمْ أَوْلَى بِالْبَيْعَةِ لِي. أَخَذْتُمْ هَذَا الأَمْرَ مِنَ الأَنْصَارِ وَ احْتَجَجْتُمْ عَلَيْهِمْ بِالْقَرَابَةِ مِنَ الرَّسُولِ وَ تَأْخُذُونَهُ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ غَصْباً! أَلَسْتُمْ زَعَمْتُمْ لِلأَنْصَارِ أَنَّكُمْ أَوْلَى بِهَذَا الأَمْرِ مِنْهُمْ لِمَكَانِكُمْ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ (ص) فَأَعْطَوْكُمُ الْمُقَادَةَ وَ سَلَّمُوا لَكُمُ الإِمَارَةَ وَ أَنَا أَحْتَجُّ عَلَيْكُمْ بِمِثْلِ مَا احْتَجَجْتُمْ عَلَى الأَنْصَارِ.»

پھر امیر المؤمنین علیہ السلام سے کہنے لگے: ابوبکر کی بیعت کرو تو انھوں نے فرمایا: اس مقامِ خلافت کا میں ابوبکر سے زیادہ حقدار ہوں، تم سب کو میری بیعت کرنی چاہیے نہ کہ میں بیعت کروں کیونکہ تم نے خود انصار کے سامنے اپنے لیے قرابتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثابت کی ہے اور اسی قرابت کے سبب اپنے کو خلافت کے لیے مقدم سمجھا ہے اور اسی کا حوالہ دے کر تم نے انصار سے خلافت کے عہدے کو لیا ہے اور ہم اہل بیت کا ذرا

خیال نہیں کیا اور اسے ہم سے غصب کر کے اس پر قبضہ جما بیٹھے۔ کیا تم نے اس منصب کے لیے یہی سوچ کر انصار پر اپنی فوقیت نہیں جتائی کہ قرابت کے لحاظ سے تم انصار کی نسبت رسول سے زیادہ نزدیک ہو اور انصار بھی تمہارے احتجاج کے سامنے خاموش ہو گئے اور خلافت کو تمہارا شرعی اور دینی حق سمجھا اور اسے تمہارے لیے چھوڑ دیا۔ میں بھی اسی دلیل واحتجاج کو اپنے لیے بیان کرتا ہوں جسے تم نے انصار کے سامنے پیش کیا تھا کہ میں اس کے لیے تم سب پر فوقیت رکھتا ہوں مجھ سے زیادہ اس کا کوئی اہل نہیں ہے۔

پھر، امیر المؤمنین علیہ السلام ان خصوصیات کا تذکرہ فرماتے ہیں جو انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت سے حاصل ہیں جیسے کہ آپؑ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصی اور وزیر تھے، سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے اور جنگوں میں سب سے بڑے مجاہد اور سب سے زیادہ کتاب وسنت کے جاننے والے تھے۔ پھر فرماتے ہیں:

«أَنْصِفُونَا إِنْ كُنْتُمْ تَخَافُونَ اللّٰهَ مِنْ أَنْفُسِكُمْ وَ اعْرِفُوا لَنَا الْأَمْرَ مِثْلَ مَا عَرَفَتْهُ لَكُمُ الْأَنْصَارُ وَ إِلَّا فَبَوءُوا بِالظُّلْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ.»

اگر اپنے بارے میں خدا سے ڈرتے ہو تو ہمارے ساتھ انصاف سے کام لو اور اس عہدے کے لیے ہماری قدر و منزلت کو پہچانو، جس طرح انصار تمہاری قدر و منزلت کو پہچانتے ہوئے اس عہدے سے تمہارے لیے دستبردار ہو گئے ورنہ ظلم و سرکشی میں گرفتار ہو جاؤ گے جب کہ تم سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہو۔

«.... فَقَالَ عُمَرُ إِنَّكَ لَسْتَ مَتْرُوكاً حَتَّى تُبَايِعَ طَوْعاً أَوْ كَرْهاً فَقَالَ عَلِيٌّ(ع) احْلِبْ حَلْباً لَكَ شَطْرُهُ اشْدُدْ لَهُ الْيَوْمَ لِيَرِدَ عَلَيْكَ غَداً إِذاً وَاللَّهِ لَا أَقْبَلُ قَوْلَكَ وَلَا أَحْفِلُ بِمَقَامِكَ وَلَا أُبَايِعُ.»

عمر نے کہا: جب تک آپ دوسروں کی طرح بیعت نہیں کرتے تب تک آپ کو چھوڑا نہیں جائے گا، چاہے بہ خوشی بیعت کریں یا زبردستی۔ علی ابن ابیطالبؑ نے فرمایا: اے عمر! تم ایسے پستان سے دودھ دوہ رہے ہو جس میں تمہارا بھی حصہ ہے، اس کام میں سختی وزبروستی اس وجہ سے کر رہے ہو کہ کل خود اس سے بہرہ مند ہو سکو۔ خدا کی قسم! میں نہ تو تمھاری بات قبول کروں گا، نہ تمھاری حیثیت پر توجہ دوں گا اور نہ ہی بیعت کروں گا۔

پھر امیر المومنین علیہ السلام اپنے حق کو من جانب اللہ انھیں عطا کیے جانے کی بات کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

«... فَوَاللَّهِ يَا مَعَاشِرَ الْجَمْعِ! إِنَّ اللَّهَ قَضَى وَحَكَمَ وَنَبِيُّهُ أَعْلَمُ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ بِأَنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ أَحَقُّ بِهَذَا الْأَمْرِ مِنْكُمْ أَمَا كَانَ الْقَارِئُ مِنْكُمْ[1] لِكِتَابِ اللَّهِ الْفَقِيهُ فِي دِينِ اللَّهِ الْمُضْطَلِعُ بِأَمْرِ الرَّعِيَّةِ؟ وَاللَّهِ إِنَّهُ لَفِينَا لَا فِيكُمْ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَى فَتَزْدَادُوا مِنَ الْحَقِّ بُعْداً وَتُفْسِدُوا قَدِيمَكُمْ بِشَرٍّ مِنْ حَدِيثِكُمْ.»

اے موجود لوگو! خدا کا فیصلہ اور اس کا حکم یہی ہے، پیغمبر نے بھی ایسے ہی اعلان کیا ہے اور تم بھی اچھی طرح واقف ہو کہ ہم اہل بیت اس امر (خلافت) کے تم سے زیادہ حقدار ہیں۔ کیا تمہارے درمیان کوئی ایسا نہیں جو کتابِ خدا کو پڑھے اور خدا کے دین

---

(۱) بعض کتابوں میں اس طرح آیا ہے: «ماكان القارىء منا لكتاب الله ...»

میں صاحبِ بصیرت ہو اور لوگوں کے حالات سے پوری طرح باخبر ہو؟ خدا کی قسم! یہ امرِ خلافت ہمارے لیے ہے نہ کہ تمہارے لیے۔ لہٰذا تم ہوئی وہوس کی پیروی نہ کرو کہ منزلِ حقیقت سے دور ہو جاؤ گے اور اپنی گزشتہ اچھائیوں کو موجودہ حوادث سے تباہ کر بیٹھو گے۔

یہ سن کر بشیر بن سعد انصاری نے، (جس نے ابو بکر کی خلافت کی راہ ہموار کی تھی) کہا: اے ابو الحسن! اگر لوگوں نے آپ کی بات ابو بکر کی بیعت کرنے سے پہلے سن لی ہوتی تو کوئی بھی آپ کی مخالفت نہ کرتا۔ امیر المؤمنین علیہ السلام نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

«يَا هَؤُلَاءِ! كُنْتُ أَدَعُ رَسُولَ اللّٰهِ مُسَجًّى لَا أُوَارِيهِ وَأَخْرُجُ أُنَازِعُ فِي سُلْطَانِهِ وَ اللّٰهِ مَا خِفْتُ أَحَداً يَسْمُو لَهُ وَيُنَازِعُنَا أَهْلَ الْبَيْتِ فِيهِ وَ يَسْتَحِلُّ مَا اسْتَحْلَلْتُمُوهُ وَ لَا عَلِمْتُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ص تَرَكَ يَوْمَ غَدِيرِ خُمٍّ لِأَحَدٍ حُجَّةً وَ لَا لِقَائِلٍ مَقَالًا فَأَنْشُدُ اللّٰهَ رَجُلًا سَمِعَ النَّبِيَّ يَوْمَ غَدِيرِ خُمٍّ يَقُولُ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهَذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ اللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالاهُ وَ عَادِ مَنْ عَادَاهُ وَ انْصُرْ مَنْ نَصَرَهُ وَ اخْذُلْ مَنْ خَذَلَهُ أَنْ يَشْهَدَ الْآنَ بِمَا سَمِعَ... فَقَالَ[عمر]: إِنَّ اللّٰهَ يُقَلِّبُ الْقُلُوبَ وَ لَا تَزَالُ يَا أَبَا الْحَسَنِ تَرْغَبُ عَنْ قَوْلِ الْجَمَاعَةِ فَانْصَرَفُوا يَوْمَهُمْ ذَلِكَ.»[1]

---

(۱) احتجاج ۱/۷۳-۷۵، باب ماجری بعد الرسول، مرحوم طبرسی نے اس روایت کو صحیح اور اس کے رجال کو ثقہ جانا ہے۔ یہ واقعہ کتاب الامامۃ والسیاسہ ۱/۱۱ اور ۱۲ میں بھی تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ موجود ہے۔ اسی طرح: شرح ابن ابی الحدید ۲/۵ میں جوہری کی کتاب السقیفہ کے حوالے سے نقل ہے۔

علی ابن ابیطالبؑ نے فرمایا: اے لوگو! کیا یہ صحیح ہوتا کہ میں جنازۂ رسولؐ کو زمین پر چھوڑ دیتا اور بغیر ان کے غسل وکفن اور نماز ودفن کا اہتمام کیے خلافت وحاکمیت کے بارے میں تم سے جھگڑا کرنے چلا آتا؟ خدا کی قسم! میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی اس خلافت کے بارے میں مجھ سے اختلاف کرے گا اور میرے ہاتھ سے اسے چھین لے گا کیونکہ رسول خدا نے روز غدیر تمام لوگوں پر حجت تمام کر دی تھی اور کوئی چھوٹی سی بات اور معمولی سا اعتراض بھی نہیں باقی رکھا تھا۔ میں تم کو خدا کی قسم دیتا ہوں کہ جو بھی روز غدیر حاضر رہا ہو اور رسول کے اس کلام کو "جس جس کا میں مولا ہوں یہ علی بھی اس کا مولا ہے، خدایا! جو بھی اسے دوست رکھے، تو اس کا دوستدار رہنا اور جو بھی اس سے دشمنی رکھے، تو اس سے دشمنی رکھنا، خدایا! جو بھی اس کی مدد کرے، تو اس کی مدد کرنا اور جو بھی اسے رسوا کرنے کی سوچے، اسے ذلیل وخوار کرنا...." میرے بارے میں سنا ہو، وہ یہیں جگہ سے کھڑا ہو اور گواہی دے ... عمر نے کہا: خدا داوں کو اوپر نیچے کرتا رہتا ہے۔ اے ابوالحسن! آپ مسلسل جماعت کی اطاعت سے کترا تے ہیں۔ تو اس روز سب لوگ چلے گئے اور علیؑ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

اس پورے واقعے سے جو نکات حاصل ہو سکتے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

پہلا نکتہ: امیر المؤمنین علیہ السلام اس واقعے میں، غاصبوں سے بحث و مجادلے کے ساتھ ہی غدیر خم کے واقعے کی یاددہانی کراتے ہوئے اپنے الٰہی حق کو بیان کرتے ہیں اور اس ضمن میں اپنی خلافت کے لیے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی بھی یاددہانی فرماتے ہیں۔

دوسرا نکتہ: اس ماجرے میں امام علی علیہ السلام ابوبکر کی بیعت کرنے سے انکار کرتے ہیں جس پر عمر کی طرف سے واضح طور پر دھمکی دی جاتی ہے کہ بہر حال آپ بیعت کرنے اور لوگوں کے انتخاب کا احترام کرنے پر مجبور ہیں۔ بقول عمر جماعت کی مخالفت کی جو عادت آپ میں ہے اس پرہیز

کریں۔ لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ امام علیہ السلام اس مقام پر جماعت کی پیروی کرنا اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتے۔

تیسرا نکتہ: امام علیہ السلام کا پیغمبر سے اپنی قرابت کو ذکر کرتے ہوئے دلیل قائم کرنا جدال احسن کا طریقہ ہے جسے آپؑ نے اپنایا اور ابوبکر اور ان کے ساتھیوں کو خود انہی کی دلیل سے لاجواب کر دیا۔ آپؑ ابوبکر کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تمہاری قربت اور رشتہ داری ہی نے تمہیں انصار پر برتری بخشی ہے۔ لہٰذا، اگر تم اسی کو اپنی حقانیت کا سبب سمجھتے ہو تو تمہیں اس معیار کے مطابق حکومت میرے حوالے کر دینا چاہیے اور اگر یہ معیار تمہاری حقانیت کا جواز فراہم نہیں کرتا تو پھر تم نے خود ہی اپنے باطل پر ہونے کی گواہی دے دی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہاں امیرالمؤمنین علیہ السلام نہ صرف انتخابی نتائج کو باطل گردانتے ہیں بلکہ الیکشن کے ذریعے حکمران کے تقرر کی فکری بنیاد کو ہی باطل ٹھہراتے ہیں۔ کیونکہ اولاً: اگر وہ شوریٰ کو مانتے تو پھر انھیں بیعت کرنی چاہیے تھی اور جماعت کے دونوں کو ترک کرنا درست نہیں سمجھنا چاہیے تھا۔ دوسرے: امام علیہ السلام ابوبکر کی حقانیت پر بھی سوالیہ نشان کھڑا کرتے ہیں کیونکہ جس معیار کے تحت ابوبکر نے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی، امیرالمؤمنین علیہ السلام اسے ہی باطل قرار دیتے ہیں۔

اس بیان کی رو سے اسلامی امت پر ناجائز قبضہ جما بیٹھی حکمرانی صاف طور پر مسترد ہوتی نظر آتی ہے اور اس کا باطل اور غاصب ہونا عیاں ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس بیان کو افضلیت والے دعوے پر حمل نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس مفروضے کی بنیاد پر امام علیہ السلام کو بیعت سے انکار نہیں کرنا چاہیے تھا، اس لیے کہ جو شخص، شوریٰ کی اساس کو قبول کرتا ہو وہ چاہے اپنی برتری کا دعویٰ کرتا ہو اور دوسروں کی صلاحیت کا انکار کرتا ہو تب بھی وہ الیکشن کا نتیجہ آنے کے بعد انتخابی نتیجے کو قبول اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے گا۔ لہٰذا اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے کہ امام علیہ السلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے بہت ہی قریبی تعلقات (اور دیگر فضائل) کی بنیاد پر بیعت اور الیکشن سے حاصل ہونے والے

نتیجے کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ انتخابات کی بنیاد کو ہی قبول نہیں کرتے ہیں اور اگر مخالفوں کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے، جس بنیاد پر خود مخالفوں کی نظر میں ان کا یہ اقدام صحیح تھا، تب بھی امیرالمؤمنین علیہ السلام ان کی اس بنیادی کج فکری کو باطل و مسترد کرتے ہوئے ان کے دلائل کا قلع قمع کرتے نظر آتے ہیں۔

معاویہ کے نام امیرالمؤمنین علیہ السلام کا خط

نہج البلاغہ کے خط نمبر ۲۸ کا، جس کا ایک حصہ ہم نے گذشتہ اسباق میں ذکر کیا ہے، ایک اور حصہ موجود ہے جس میں امیرالمؤمنین علیہ السلام ماضی کے حکمرانوں کی حکومت کو باطل ٹھہراتے ہوئے احتجاج و مجادلے کے طور پر فرماتے ہیں:

«وَ كِتَابُ اللهِ يَجْمَعُ لَنَا مَا شَذَّ عَنَّا. وَ هُوَ قَوْلُهُ سُبْحَانَهُ: ﴿وَ أُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتٰبِ اللهِ﴾. وَ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرٰهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَ هٰذَا النَّبِيُّ وَ الَّذِينَ اٰمَنُوا ۗ وَ اللهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ﴾. فَنَحْنُ مَرَّةً أَوْلَىٰ بِالْقَرَابَةِ. وَ تَارَةً أَوْلَىٰ بِالطَّاعَةِ. وَ لَمَّا احْتَجَّ الْمُهَاجِرُونَ عَلَى الْأَنْصَارِ يَوْمَ السَّقِيفَةِ بِرَسُولِ اللهِ (ص) فَلَجُوا عَلَيْهِمْ. فَإِنْ يَكُنِ الْفَلَجُ بِهِ فَالْحَقُّ لَنَا دُونَكُمْ. وَ إِنْ يَكُنْ بِغَيْرِهِ فَالْأَنْصَارُ عَلَىٰ دَعْوَاهُمْ.»[1]

اور کتاب خدا نے ہماری (حقانیت کے) منتشر اوصاف کو یہ کہہ کر اکٹھا کر دیا ہے کہ "کتاب خدا میں بعض قرابت دار، بعض سے اولیٰ ہیں۔" اور خداوند عالم کا یہ قول بھی

---

[1] اسی طرح کے دوسرے مجادلوں کو دیکھنے کے لیے رجوع فرمائیں: نہج البلاغہ خطبہ ۶۷ اور نہج البلاغہ حکمت نمبر ۱۹۰۔ (مختلف طباعتوں میں نمبر مختلف ہو سکتا ہے)۔

کہ "ابراہیم کے لیے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کا اتباع کیا ہے اور پیغمبر (ص)، صاحبان ایمان اور اللہ، صاحبان ایمان کا ولی ہے۔" تو ہمیں قرابت کی وجہ سے بھی دوسروں پر فوقیت حاصل ہے اور اطاعت کی وجہ سے بھی ہمارا حق مسلم ہے۔ سقیفہ کے دن جب مہاجرین نے رسول ﷺ کی قرابت کو استدلال میں پیش کیا تو انصار کے مقابلے میں کامیاب ہوئے۔ تو ان کی کامیابی اگر قرابت کی وجہ سے تھی تو پھر یہ خلافت ہمارا حق ہے نہ کہ ان کا اور اگر استحقاق کا کچھ اور معیار ہے تو انصار کا دعویٰ صحیح ہے۔

امیرالمؤمنین علیہ السلام اپنے اس بیان میں، قرآن کی ایک آیت کا حوالہ پیش کرتے ہیں جو وراثت سے متعلق ہے۔ اس آیت کے مطابق میراث میں کچھ طبقے پائے جاتے اس لیے ورثاء کے بھی کچھ طبقے ہیں جن میں سے کچھ مرنے والے سے سب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں اور دوسروں پر انھیں فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے طبقے کے ہوتے ہوئے دوسرے اور تیسرے طبقے کو وارثت میں سے کچھ بھی نہیں مل سکتا اور اس میں اولی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے طبقے کا دعویٰ موجود ہونے پر ان سے نیچے جتنے بھی طبقات ہیں ان کو وراثت کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس آیت کا حوالہ دیتے ہوئے، امیرالمؤمنین علیہ السلام نے واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ ہم سب سے پہلے خلافت کے حقدار ہیں اور ہمارا حق اولی ہے اور ہماری فوقیت کا نمونہ اور معیار صرف یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی فضلیت و برتری کا اظہار کریں اور اپنے حق کو شوریٰ کے فیصلے پر چھوڑ دیں بلکہ ہماری برتری اس طرح اور اس ترتیب سے ہے کہ ہمارے اور ہمارے مطالبات کے ہوتے ہوئے حکمرانی کے معاملے میں دوسروں کو خلافتِ رسول اللہ ﷺ کا کوئی حق ہی نہیں پہنچتا۔

اس دلیل سے قطع نظر امیرالمؤمنین علیہ السلام مہاجرین کے اقدامات پر بھی مجادلہ احسن پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے قرابتداری کی بنیاد پر امرِ خلافت کو انصار

سے لیتے ہوئے اسے اپنے حق میں کر لیا ہے اور اسے اپنا حق سمجھا ہے تو پھر اسی دلیل کی بنیاد پر انھیں یہ حق ہمیں دے دینا چاہیے اور اگر حکومت کو ہتھیانے کے لیے یہ انصار کے مقابلے میں مہاجرین کی محض ایک چال تھی تو پھر انصار کا دعویٰ ان کے خلاف مضبوطی سے باقی رہے گا۔

خط نمبر ۲۸ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ خط امیر المؤمنین علیہ السلام کی حکمرانی کے وقت اور جنگ صفین کے زمانے سے متعلق ہے اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام اس وقت بھی غاصبانِ خلافت کی حکمرانی سے راضی نہیں تھے، بصورت دیگر ایک دیرینہ مقدمے کو پھر سے اٹھانا بے معنی ہوگا۔

سبق ۱۰

معصومین علیہم السلام اور اصحاب کا احتجاج

پچھلے اسباق میں ہم نے نہج البلاغہ سے امیر المؤمنین علیہ السلام کے کچھ بیانات اور مجادلہ احسن کو ذکر کیا اور ساتھ ہی مخالفین کی طرف سے نقل کردہ کچھ کتابوں کے اقتباسات کی جانچ پڑتال کی اور واضح کیا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے نقطۂ نظر سے امت پر خلافت اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کا حق صرف اور صرف ان سے اور اہل بیت علیہم السلام سے مخصوص ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جو کچھ بھی پیش آیا، جس میں آپ کے الٰہی حق کو چھینا جانا بھی شامل ہے، وہ آپ کے الٰہی حق پر ڈاکہ ڈالنے اور اسے غصب کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس سبق میں اور اس بحث کو پوری طرح سے مکمل کرنے کے لیے ہم کچھ دیگر معصومین علیہم السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض اصحاب کے احتجاجات کو پیش کریں گے تاکہ اس کا

بھی کسی حد تک اندازہ ہوجائے کہ خلافت غصب کرنے والوں کے خلاف کس قدر احتجاجات ہوئے۔ ساتھ ہی حکومت کے معاملے میں امیر المؤمنین علیہ السلام کی حقانیت پر مزید تاکید و تائید بھی ہوجائے۔

حضرت زہرا علیہا السلام کا احتجاج

ان افراد میں، جنھوں نے خلافت نبوی کے غصب کیے جانے پر احتجاج کیا، صدیقۂ کبریٰ علیہا السلام کی ذات گرامی بھی ہے۔ جس وقت حملہ آوروں نے امیر المؤمنین علیہ السلام کے گھر پر حملہ کیا:

«وَ خَرَجَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُولِ اللهِ(ص) إِلَيْهِمْ فَوَقَفَتْ خَلْفَ الْبَابِ ثُمَّ قَالَتْ لَا عَهْدَ لِي بِقَوْمٍ أَسْوَأَ مَحْضَراً مِنْكُمْ تَرَكْتُمْ رَسُولَ اللهِ ص جَنَازَةً بَيْنَ أَيْدِينَا وَ قَطَعْتُمْ أَمْرَكُمْ فِيمَا بَيْنَكُمْ وَ لَمْ تُؤَمِّرُونَا وَ لَمْ تَرَوْا لَنَا حَقّاً كَأَنَّكُمْ لَمْ تَعْلَمُوا مَا قَالَ يَوْمَ غَدِيرِ خُمٍّ وَ اللهِ لَقَدْ عَقَدَ لَهُ يَوْمَئِذٍ الْوَلَاءَ لِيَقْطَعَ مِنْكُمْ بِذَلِكَ مِنْهَا الرَّجَاءَ وَ لَكِنَّكُمْ قَطَعْتُمُ الْأَسْبَابَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ نَبِيِّكُمْ وَ اللهُ حَسِيبٌ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ.»[1]

دخترِ رسولِ گرامی نکلیں اور دروازے کے پیچھے آکر فرمایا: میں نے تم سے زیادہ بے وفا و پست کسی قوم کو بھی نہیں دیکھا، رسول خدا کے جنازے کو ہمارے سامنے چھوڑ کر چلے گئے اور حصول خلافت میں لگ گئے اور اسے اپنے لیے یقینی بنالیا اور نہ تو ہمیں امیر بنایا، نہ ہی اس بارے میں ہمیں کوئی حق دیا۔ گویا تم کو علم ہی نہیں کہ روز غدیر رسول خدا نے کیا فرمایا تھا؟ خدا کی قسم انھوں نے اس دن امیر المومنین کے لیے امر خلافت کا

---

(۱) احتجاج ۱/۸، باب الانکار علی ابی بکر، اور الامامۃ والسیاسۃ ۱/۱۳۔ اور اسی طرح: بحار الانوار ۲۸/۲۳۲ ح ۱۸، امالی سے منقول، مفید/۱۴۹ مجلس السادس، ح ۹۔

عہد لیا تھا تاکہ تمھارے لیے اس کے حصول کی کوئی امید باقی نہ رہے لیکن تم لوگوں نے اپنے پیغمبر سے پوری طرح رابطہ توڑ لیا۔ یقیناً خداوند عالم ہمارے اور تمھارے درمیان دنیا وآخرت میں فیصلہ کرنے والا ہے۔

رسولؐ کی دختر گرامی جناب زہرا سلام اللہ علیہا کے دو تاریخی خطبوں سے، ایک جب باغ فدک کو غصب کیا گیا تھا اور دوسرے جب آپ مریض ہوئیں اور خواتین آپ کی عیادت کو آئیں،[1] امیر المؤمنین علیہ السلام کے حق کو غصب کرنے والوں کا ظلم وکفر واضح ہوجاتا ہے، جس کی تفصیل ہم اس سلسلے میں موجود کتابوں پر چھوڑتے ہیں۔

امام حسن علیہ السلام کا معاویہ سے احتجاج

روایت ہے کہ ایک دن معاویہ نے حسنین علیہما السلام، عبد اللہ ابن عباس، عبد اللہ ابن جعفر ابن ابی طالب اور کچھ دیگر افراد کو ایک نشست میں اکٹھا کیا۔ اس مجلس میں ان میں سے ہر ایک نے امیر المؤمنین علیہ السلام کی حقانیت پر موجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیانات کو نقل کیا۔ امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: امتِ اسلام، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد، توحید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، زنا کی حرمت، چوری اور اس طرح کے معاملات پر متحد ہوگئی لیکن وہ کچھ معاملات میں اختلافات کا بھی شکار ہوئی جن میں سے ایک کلمۂ ولایت ہے جس پر لوگ ایک دوسرے سے جنگ کرنے لگے اور مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگئے اور ایک دوسرے پر لعنت کرنے لگے۔ اس کے بعد امام حسن علیہ السلام اس سلسلے میں اہل بیت علیہم السلام کی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] رجوع فرمائیں: احتجاج ۱/۹۷-۱۰۶ اور ۱۰۸-۱۰۹، باب خطبۃ الزھراء البتول۔

«نَحْنُ نَقُولُ أَهْلَ الْبَيْتِ: إِنَّ الأَئِمَّةَ مِنَّا وَ إِنَّ الْخِلَافَةَ لَا تَصْلُحُ إِلَّا فِينَا وَ إِنَّ اللّٰهَ جَعَلَنَا أَهْلَهَا فِي كِتَابِهِ وَ سُنَّةِ نَبِيِّهِ.»(۱)

ہم اہل بیت کا نظریہ یہ ہے کہ بیشک تمام ائمہ ہم میں سے ہیں اور خلافت سوائے ہمارے خاندان کے کسی کے لائق ہی نہیں ہے اور بلاشبہ خداوند متعال نے کتاب و سنت میں ہمارے، خلافت کے اہل ہونے کی تصریح کی ہے۔

امام حسین علیہ السلام کا عمر سے احتجاج

منقول ہے کہ عمر اپنے زمانۂ حکومت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر پر بیٹھے تقریر میں مصروف تھے کہ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا: اے جھوٹے! میرے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر سے نیچے اتر! یہ تیرے باپ کا منبر نہیں ہے۔ عمر نے کہا: خدا کی قسم! یہ بات صحیح ہے۔ یہ منبر آپ کے باپ کا ہے، میرے باپ کا نہیں۔ یہ بتائیے کہ یہ باتیں آپ نے اپنے بابا علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے سیکھی ہیں؟ امام حسین علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

«إِنْ أُطِعْ أَبِي فِيمَا أَمَرَنِي فَلَعَمْرِي إِنَّهُ لَهَادٍ وَ أَنَا مُهْتَدٍ بِهِ وَ لَهُ فِي رِقَابِ النَّاسِ الْبَيْعَةُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ نَزَلَ بِهَا جَبْرَئِيلُ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ تَعَالَى لَا يُنْكِرُهَا إِلَّا جَاحِدٌ بِالْكِتَابِ قَدْ عَرَفَهَا النَّاسُ بِقُلُوبِهِمْ وَ أَنْكَرُوهَا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَ وَيْلٌ لِلْمُنْكِرِينَ حَقَّنَا أَهْلَ الْبَيْتِ مَاذَا يَلْقَاهُمْ بِهِ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ (ص) مِنْ إِدَامَةِ الْغَضَبِ وَ شِدَّةِ الْعَذَابِ!»

---

(۱) احتجاج ۲/۲۸۷۔

اگر میں اپنے بابا کے حکم کی اطاعت کروں تو میری جان کی قسم! وہ ہادی ہیں اور میں ان کا پیرو ہوں۔ عہد رسول میں لوگوں کی گردن پر صرف انھیں کی بیعت تھی جسے جبرئیل خدا کی جانب سے لے کر نازل ہوئے تھے اور منکر قرآن کے علاوہ کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ یقینی طور پر تمام لوگ اسے دل سے جانتے تھے لیکن انھوں نے زبان سے انکار کیا۔ تو ہم اہل بیت کے حق کے منکر پروائے ہو۔ ان کے خلاف شدت عذاب اور رسول اللہ کا غیظ و غضب مسلسل جاری رہے گا جب وہ پیغمبر سے ملاقات کریں گے۔

اصحاب کا ابوبکر و عمر سے احتجاج

جب سقیفہ کا واقعہ پیش آیا تو امیر المؤمنین علیہ السلام کے کچھ چاہنے والوں نے، جو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب تھے، امت کو درپیش معاملے پر ایک دوسرے سے مشورہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کی اجازت سے غاصبوں کے خلاف قیام کیا جائے۔ امام علیہ السلام نے انھیں سمجھاتے ہوئے ابوبکر اور عمر کے پاس جانے، ان دونوں سے احتجاج کرنے اور ان پر حجت تمام کرنے کا حکم دیا۔ ان لوگوں کی تعداد بارہ تھی۔ اگرچہ ان میں سے کچھ کے ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن ان کے بیعت نہ کرنے کا ذکر تمام شیعہ سنی کتابوں میں کثرت سے نقل کیا گیا ہے۔[1] ان میں سے بعض اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیانات ہم علامہ مجلسی کی کتاب بحار الانوار سے نقل کرتے ہیں جو انھوں نے شیخ صدوقؒ کی کتاب الخصال کے حوالے سے لکھے ہیں:

---

[1] بحار الانوار ۲۱۴/۲۸، سید بن طاؤس کی کتاب کشف الیقین سے منقول۔

۱۔ خالد بن سعید بن عاص

«يَا أَبَا بَكْرٍ اِتَّقِ ٱللَّهَ ... أَلَا تَعْلَمُ أَنَّ رَسُولَ ٱللَّهِ صَلَّى ٱللَّهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ قَالَ لَنَا وَ نَحْنُ مُحْتَوِشُوهُ فِي يَوْمِ بَنِي قُرَيْظَةَ وَ قَدْ أَقْبَلَ عَلَى رِجَالٍ مِنَّا ذَوِي قَدْرٍ فَقَالَ مَعَاشِرَ ٱلْمُهَاجِرِينَ وَ ٱلْأَنْصَارِ أُوصِيكُمْ بِوَصِيَّةٍ فَاحْفَظُوهَا وَ إِنِّي مُؤَدٍّ إِلَيْكُمْ أَمْراً فَاقْبَلُوهُ أَلَا إِنَّ عَلِيّاً عَلَيْهِ السَّلَامُ أَمِيرُكُمْ مِنْ بَعْدِي وَ خَلِيفَتِي فِيكُمْ أَوْصَانِي بِذَلِكَ رَبِّي وَ رَبُّكُمْ.»

اے ابوبکر! پروردگار سے ڈرو... کیا تمھیں یاد نہیں کہ غزوۂ بنی قریظہ میں رسول اللہ ﷺ نے ہم سے کیا کہا تھا؟ جب ہم سب رسول اکرمؐ کے گرد اکٹھا تھے تو انھوں نے ہم میں سے بعض کو، جو مقام و منزلت کے حامل تھے، مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا: اے گروہ مہاجرین و انصار! میں تم سے ایک وصیت کرتا ہوں تم اس پر ضرور عمل کرنا اور ایک امر تمھیں ودیعت کرتا ہوں کہ اس کی حفاظت کرنا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ میرے بعد علی ابن ابیطالب تمہارے امیر و حاکم اور میرے خلیفہ و جانشین ہیں۔ میرے اور تمہارے خدا نے مجھے اس کا حکم دیا ہے۔

۲۔ ابوذر غفاری

«أَمَّا بَعْدُ يَا مَعَاشِرَ ٱلْمُهَاجِرِينَ وَ ٱلْأَنْصَارِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ وَ عَلِمَ خِيَارُكُمْ أَنَّ رَسُولَ ٱللَّهِ صَلَّى ٱللَّهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ قَالَ ٱلْأَمْرُ لِعَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَعْدِي ثُمَّ لِلْحَسَنِ وَ ٱلْحُسَيْنِ ثُمَّ فِي أَهْلِ بَيْتِي مِنْ وُلْدِ

اَلْحُسَیْنِ عَلَیْهِمُ السَّلَامُ فَاطَّرَحْتُمْ قَوْلَ نَبِیِّکُمْ وَ تَنَاسَیْتُمْ مَا أَوْعَزَ إِلَیْکُمْ.»

اما بعد، اے مہاجرین و انصار! تم اور تمھارے صالح افراد جانتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ میرے بعد امر خلافت علی ابن ابیطالبؑ اوران کے بعد حسنؑ وحسینؑ کے لیے اور ان کے بعد حسینؑ سے میری اولاد طاہرہ کے لیے (مختص) ہوگا۔ تم لوگوں نے رسول کی باتوں کو پس پشت ڈال دیا اور انھوں نے تمھیں جو حکم دیا تھا اس کے بارے میں اپنے آپ کو بھولا ہوا بتانے لگے۔

۳۔ سلمان فارسی

«یَا أَبَا بَکْرٍ! إِلَی مَنْ تُسْنِدُ أَمْرَكَ إِذَا نَزَلَ بِكَ الْقَضَاءُ وَ إِلَی مَنْ تَفْزَعُ إِذَا سُئِلْتَ عَمَّا لَا تَعْلَمُ وَ فِي الْقَوْمِ مَنْ هُوَ أَعْلَمُ مِنْكَ وَ أَكْثَرُ فِي الْخَیْرِ أَعْلَاماً وَ مَنَاقِبَ مِنْكَ وَ أَقْرَبُ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ آلِهِ قَرَابَةً وَ قِدْمَةً فِي حَیَاتِهِ وَ قَدْ أَوْعَزَ إِلَیْکُمْ فَتَرَکْتُمْ قَوْلَهُ وَ تَنَاسَیْتُمْ وَصِیَّتَهُ...»

اے ابوبکر! جب قضائے الٰہی (موت) آئے گی تو تم اپنے کام کی کس سے نسبت دوگے؟ اور کس سے پناہ مانگوگے جب تم سے اس چیز کے بارے میں سوال ہوگا جس کا تم جواب نہیں دے سکتے؟ تم کیا عذر پیش کروگے اپنے کو اس شخص پر مقدم کرنے کے لیے جو تم سے زیادہ علم رکھنے والا اور رسول خدا سے سب سے زیادہ قریب اور کتاب خدا کی تاویل و معرفت اور سنت پیمبر کا سب سے زیادہ جاننے والا اور سمجھنے والا ہے؟ وہ وہی شخص ہے جسے رسول خدا نے اپنی زندگی میں مقدم رکھا تھا اور اپنی رحلت سے

قبل اس کے حق کی ادائیگی کی وصیت کی تھی۔ تم نے وصیت رسول کو ترک کر دیا ہے اور اپنے آپ کو فراموشی میں ڈال دیا ہے...۔

۴۔ مقداد

«... وَرُدَّ هَذَا ٱلْأَمْرَ إِلَى حَيْثُ جَعَلَهُ ٱللهُ عَزَّ وَجَلَّ وَرَسُولُهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَلَا تَرْكَنْ إِلَى ٱلدُّنْيَا ...»

...اے ابوبکر! اس امر کو اسی مقام پر لوٹا دو جہاں اسے اللہ اور اس کے رسول نے قرار دیا ہے اور دنیا کے فریب میں گرفتار نہ ہو...۔

۵۔ بریدہ اسلمی

«يَا أَبَا بَكْرٍ! نَسِيتَ أَمْ تَنَاسَيْتَ أَمْ خَادَعَتْكَ نَفْسُكَ أَمَا تَذْكُرُ إِذْ أَمَرَنَا رَسُولُ ٱللهِ صَلَّى ٱللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ فَسَلَّمْنَا عَلَى عَلِيٍّ بِإِمْرَةِ ٱلْمُؤْمِنِينَ وَنَبِيُّنَا بَيْنَ أَظْهُرِنَا؟!»

اے ابوبکر! گزشتہ باتیں تمھیں یاد نہیں رہیں یا تم نے انھیں خود بھلا دیا ہے؟ یا پھر تمھارے نفس کی خواہشوں نے تمھیں دھوکا دیا ہے؟ کیا تمھیں یاد نہیں کہ رسول اللہ کے حکم پر ہم نے علی کو امیر المؤمنین کے لقب سے سلام کیا تھا جب کہ پیغمبر ہمارے سامنے ہی تھے؟

۶۔ عمار یاسر

«يَا أَبَا بَكْرٍ! لاَ تَجْعَلْ لِنَفْسِكَ حَقّاً جَعَلَهُ اَللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ لِغَيْرِكَ وَ لاَ تَكُنْ أَوَّلَ مَنْ عَصَى رَسُولَ اَللَّهِ وَ خَالَفَهُ فِي أَهْلِ بَيْتِهِ وَ أُرْدُدِ اَلْحَقَّ إِلَى أَهْلِهِ.....»[1]

اے ابوبکر! جس حق کو پروردگار نے کسی اور کے لیے قرار دیا ہے، اسے اپنے لیے قرار مت دو اور ایسے پہلے شخص نہ بن جاؤ جو رسول اللہ کے حکم کو پس پشت ڈالتے ہوئے ان کے اہل بیت کی مخالفت کرتا ہو۔ حق کو اس کے حقدار کی طرف پلٹا دو۔۔۔۔

دوسرے صحابۂ کرام نے بھی امیرالمؤمنین علیہ السلام کی امامت و خلافت پر موجود نصوص و براہین سے ابوبکر سے احتجاج کیا جس سے گھبرا کر ابوبکر تین دن تک خانہ نشین رہے اور گھر سے باہر نہ نکلے۔ تیسرے دن عمر، طلحہ و عثمان اور کچھ دوسرے افراد کے ساتھ، جن میں سے ہر ایک کے ہمراہ اس کے قبیلے کے دس دس لوگ تھے، برہنہ شمشیر لیے جمع ہوئے اور ابوبکر کے گھر کے سامنے کھڑے ہو گئے اور ابوبکر کو گھر سے باہر بلا کر عمر نے کہا: اب جو کوئی بھی دوبارہ ان باتوں کی تکرار کرے گا اسے ان تلواروں سے جواب دیں گے اور اس طرح انھوں نے حق کی آواز کو گلوں میں ہی دبا دیا۔

---

[1] بحار الانوار ۲۰۸/۲۸-۲۲۰، شیعہ اور سنی منابع کے حوالے سے۔ یہ روایت بحارالانوار میں شیخ صدوق کی کتاب الخصال ۴۶۱/۲۱، ابوب الاثنیٰ عشر، ح۴ اور سید ابن طاؤس کی کتاب کشف الیقین سے ماخوذ ہے اور دونوں روایات کی نقل میں جو امتیازات ہیں اس کا بھی ذکر ہوا ہے۔

تیسرا باب

نبی کا وعدہ، وصی کا استحکام

معاشرے کی حکمرانی میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کی حقانیت کو بیان کرنے کے بعد اس باب میں ہم اپنے حقوق کی پامالی کے سلسلے میں امام علی علیہ السلام کے طرز عمل اور ان کے سلوک کا جواز پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس باب میں ہم واضح کریں گے کہ امام علیہ السلام، اپنے حق کو ثابت کرنے کے لیے سب سے پہلے تحریک چلاتے ہیں اور اپنے دوستوں اور مددگاروں کو اکٹھا کرتے ہیں لیکن عوام کی طرف سے ضروری مدد نہ ملنے سے مایوسی کے بعد اپنے اقدامات کو روک دیتے ہیں اور خاموشی کا تلخ گھونٹ پی لیتے ہیں۔

اس باب میں ہمارا بنیادی مقصد امام کی خاموشی کی وجہ اور اس کی حکمت کی وضاحت کرنا ہے اور اس ضمن میں پیش کردہ موضوعات کے علاوہ ہم مندرجہ ذیل نکات کی جانچ پڑتال کریں گے:

پہلا: امیرالمؤمنین علیہ السلام نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عہد کیا تھا کہ یار و مددگار نہ ملنے کی صورت میں وہ سکوت اختیار کریں گے۔

دوسرا: امیرالمؤمنین علیہ السلام اپنے خاموش ہو جانے اور اپنے اقدامات سے پیچھے ہٹ جانے کی حکمت کو گزشتہ انبیاء کی پیروی کرتے ہوئے دین کے تحفظ، اپنے اور اپنے معدود ساتھیوں کے خون کی حفاظت اور اسی جیسے دوسرے امور کو قرار دیتے ہیں۔

تیسرا: امیرالمؤمنین علیہ السلام اپنا حق غصب کرنے والوں اور حکومت پر ناجائز قبضہ جمانے والوں سے راضی نہیں تھے اور ہمیشہ مظلوم کی حیثیت سے خود کو متعارف کراتے تھے۔

سبق ۱۱

امیرالمؤمنین علیہ السلام کا غصبِ خلافت کے خلاف حکمرانی کے لیے تصادم

پچھلے اسباق میں اجمالی طور پر خود امیرالمؤمنین علیہ السلام کے بیانات کا جائزہ لیتے ہوئے ہم نے واضح کیا کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد حکومت اور قیادت کا حق صرف اور صرف امام علیہ السلام کو حاصل تھا اور ہم نے واضح کیا کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام اپنے آپ کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا برحق جانشین سمجھتے اور لوگوں پر ولایت و امارت کو اپنا الٰہی مانتے تھے۔ اس طرح ہم نے مخالفین کا یہ وہم و گمان دور کردیا کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام شوریٰ اور الیکشن کے معیار کو تسلیم کرتے تھے اور اس کے نتیجے میں اپنے سے پہلے کے خلفاء کی قانونی حیثیت کو قبول کرتے تھے۔

ہم آنے والے اسباق میں جس چیز کا جائزہ لیں گے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امیرالمؤمنین علیہ السلام کا طرز عمل ہے۔ جیساکہ ہم نے کتاب کی ابتدا میں ہی بیان کیا ہے، شیعوں کے مخالفین اس حقیقت کو ختم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اگرچہ امیرالمؤمنین علیہ السلام ابتدا میں معاشرے میں اچانک رونما ہونے والے ان واقعات سے ناراض تھے لیکن اس کے باوجود آپؑ نے

اپنی مخالفت سے ہاتھ کھینچ لیا اور حکومتِ وقت سے راضی ہو گئے۔ اس کے بعد وہ دیگر دوسرے افراد کی ہی طرح حکمرانوں سے تعاون کرنے لگے جو ان کی رضامندی کی دلیل ہے:

«ہمارے پاس مختلف کتابوں سے شواہد دستیاب ہیں جو یہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد علی علیہ السلام نے ایک مختصر وقت تک ابوبکر کی بیعت کرنے سے انکار کیا لیکن آخر کار ابوبکر سے راضی ہو گئے اور بیعت کر لی اور اس کے بعد دوسرے خلیفہ کے ساتھ بھی اسی طرح سلوک کیا۔» [1]

دوسرے لفظوں میں چاہے امام علیہ السلام اپنے آپ کو خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا خلیفہ مانتے ہوں، چاہے خود کو اکثریتی ووٹوں کے حصول کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتے ہوں، جو کچھ بھی ہو، آپؑ نے ان اختلافات کو پس پشت ڈال دیا اور معاشرے سے ہم آہنگ ہو گئے:

«یہاں اس نکتے پر توجہ ضروری ہے کہ حضرت خاتمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد خلافت پر قبضہ ایک کھلا ظلم تھا جو حق و حقیقت کے ساتھ رَوا رکھا گیا اور نفسِ پیغمبر امام علی علیہ السلام کو حکمرانی سے روک دیا گیا اور اسلام ان کی برکتوں سے محروم ہو گیا۔ خیر جو کچھ بھی تھا وہ گزر گیا اور اب اس حق کو اس کے حقدار کی طرف پلٹانا ممکن نہیں ہے اور اس پر بحث و گفتگو قیل و قال اور وقت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مولائے متقیان علیہ السلام نے بھی اپنی تمام تر حقانیت کے باوجود صرف اسلام کے استحکام کی خاطر اپنے مسلّمہ حق سے دستبردار ہو گئے اور اس وقت جو ماحول چل رہا تھا اس کے مطابق ہو گئے۔» [2]

---

[1] راہی بہ سوی وحدت اسلامی، مصطفیٰ طباطبائی/۱۶۳۔

[2] حکومت در اسلام، حیدر علی قلمداران/۱۴۱ اور سے مشابہ: شرح ابن ابی الحدید ۳/۹۹۔

اس طرح کے نقطۂ نظر کا حامل یہ گروہ اپنے دعوے کے ثبوت میں امیرالمومنین علیہ السلام کے طرزِ عمل اور ان کے بیانات سے ثبوت فراہم کرتا ہے، جس کا جائزہ ہم چوتھے باب میں لیں گے لیکن اس سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ امیرالمومنین علیہ السلام کا اپنے الٰہی عہدے کے غصب ہونے پر کیا ردِّعمل تھا اور وہ اپنے طرزِ عمل کو کس طرح جائز اور مدلّل قرار دیتے ہیں تاکہ ہم اس طرح سے اپنے مخالف افراد کے شکوک و شبہات کو آسانی سے دور کر سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہم ان اسباق میں تسلسل کے ساتھ اپنے الٰہی حق کو غصب کیے جانے کے خلاف امیرالمومنین علیہ السلام کے ردِ عمل اور اقدامات کی وضاحت کریں گے۔

امام علیہ السلام کا ابتدائی اقدام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوتے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کے مطابق امیرالمومنین علیہ السلام آپؐ کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہوگئے۔ اسی اثناء میں جو لوگ سقیفہ میں اکٹھا ہوئے تھے، انھوں نے اسلامی معاشرے کی تقدیر کا فیصلہ مختلف انداز میں کیا اور اس حقیقت کے باوجود کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر وہ سب امیرالمومنین علیہ السلام کی پہلے ہی بیعت کر چکے تھے، انھوں نے کسی دوسرے کی بیعت کر لی اور اسلامی امت کو اس کے الٰہی راستے سے ہٹا دیا۔ اس سلسلے میں خود امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

«فَخَلَّفُوا أَمِيرَهُمْ مُقِيماً فِي عَسْكَرِهِ وَ أَقْبَلُوا يَتَبَادَرُونَ عَلَى الْخَيْلِ رَكْضاً إِلَى حَلِّ عُقْدَةٍ عَقَدَهَا اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ لِي وَ رَسُولُهُ فِي أَعْنَاقِهِمْ فَحَلُّوهَا وَ عَهْدٍ عَاهَدُوا اللَّهَ وَ رَسُولَهُ فَنَكَثُوهُ وَ عَقَدُوا لِأَنْفُسِهِمْ عَقْداً ضَجَّتْ بِهِ أَصْوَاتُهُمْ وَ اخْتَصَّتْ بِهِ آرَاؤُهُمْ مِنْ غَيْرِ مُنَاظَرَةٍ لِأَحَدٍ مِنَّا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ أَوْ مُشَارَكَةٍ فِي رَأْيٍ أَوِ

اِسْتِقَالَةِ لِمَا فِي أَعْنَاقِهِمْ مِنْ بَيْعَتِي فَعَلُوا ذٰلِكَ وَ أَنَا بِرَسُولِ اللّٰهِ مَشْغُولٌ وَ بِتَجْهِيزِهِ عَنْ سَائِرِ الْأَشْيَاءِ مَصْدُودٌ.»[1]

چنانچہ (اسامہ کے لشکریوں میں سے کچھ نے) اپنے امیر کو میدان میں ہی چھوڑ دیا اور جلدی سے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے تا کہ اس عہد کو، جو خدا اور اس کے رسول نے میرے لیے ان سے لیا تھا اور جو ان کی گردنوں پر تھا، اس کو اپنی گردنوں سے نکال پھینکیں اور خدا اور اس کے رسول کے ساتھ جو عہد کیا تھا اسے توڑ دیں۔ لہٰذا انھوں نے ایسا ہی کیا بھی اور اپنے لیے ایک دوسرا معاہدہ کر لیا اور وہ سب آپس میں ہم رائے اور ہم صدا ہو گئے اور اسی پر ساتھ میں مل کر اَڑے رہے بغیر اس کے کہ ہم عبدالمطلب کی اولاد سے بھی مشورہ کرتے، ہمیں بھی شریک بناتے اور ہمارا بھی نظریہ جانتے اور کم از کم مجھ سے ہی اس کی خواہش کرتے کہ میں اپنی بیعت کو ان کی گردنوں سے اٹھا لوں۔ انھوں نے یہ کام اس وقت کیا جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تکفین کے کاموں میں مصروف تھا اور اس کام نے مجھے دوسرے کاموں سے روک رکھا تھا۔

ایک اور کام جو امیرالمؤمنین علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہونے کے بعد انجام دیا، وہ قرآن کی جمع آوری تھی۔ جیسا کہ ہم نے پہلے سبق میں ذکر کیا ہے، قرآن مجید کی جمع آوری کا عہدہ بھی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی امیرالمؤمنین علیہ السلام کے سپرد فرمایا تھا۔ امام علیہ السلام اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

---

[1] بحار الانوار ۳۸/۴/۱۷۲، باب فیما امتحن اللہ بہ امیرالمؤمنین اور خصال ۲/۳۶۴، باب السبعہ، ح ۵۸ اور اختصاص، مفید /۱۶۳، کتاب محنۃ امیرالمؤمنین علیہ السلام۔

«حَمَلْتُ نَفْسِي عَلَى ٱلصَّبْرِ عِنْدَ وَفَاتِهِ بِلُزُومِ ٱلصَّمْتِ وَ ٱلِاشْتِغَالِ بِمَا أَمَرَنِي بِهِ مِنْ تَجْهِيزِهِ وَ تَغْسِيلِهِ وَ تَحْنِيطِهِ وَ تَكْفِينِهِ وَ ٱلصَّلَاةِ عَلَيْهِ وَ وَضْعِهِ فِي حُفْرَتِهِ وَ جَمْعِ كِتَابِ ٱللهِ وَ عَهْدِهِ إِلَى خَلْقِهِ.»[1]

اور میں نے رسول اللہ کی رحلت کے موقع پر خود کو صبر کرنے پر مجبور کیا اور سختی کے ساتھ خاموشی اختیار کرلی اور خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غسل وکفن اور تجہیز وتکفین اور ان پر نماز پڑھنے اور انھیں دفن کرنے اور کتاب الٰہی کی جمع آوری اور لوگوں سے کیے ان کے وعدوں کو پورا کرنے جیسے کاموں میں مشغول کرلیا جس کا حکم مجھے اللہ کے رسول نے دیا تھا۔

تحریک کا اقدام

جب امیر المؤمنین علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز وتکفین اور قرآن کی جمع آوری سے فارغ ہوئے اور اس سے پہلے کہ آپؑ سے زبردستی اور مجبور کرکے بیعت لی جاتی، وہ اقدام جو آپ نے انجام دیا وہ تھا کہ رات کے وقت صدیقۂ کبریٰ فاطمۃ الزہرا علیہا السلام؛ اور حسنین علیہما السلام کے ساتھ آپؑ مہاجرین و انصار کے گھر گئے اور ان سے کہا کہ وہ آپؑ کی مدد کریں اور آپؑ کے الٰہی حق پر ناجائز قبضہ جمانے والے غاصبوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے میں آپؑ کی مدد کریں تاکہ آپؑ اپنے الٰہی حق کو بحال کریں۔ ان سے بیعت لیتے ہوئے امام علیہ السلام نے ان سے اگلی صبح سر منڈا کر آنے کا وعدہ لیا لیکن چار افراد کے علاوہ

---

[1] بحار الانوار ۳۸/۱۷۴/۱۰۱، اسی سے مشابہ گزشتہ حوالہ ۲۸/۲۲۷، ح ۱۴ اور ۲۳۰، ح ۱۶ اور تفسیر عیاشی ۲/۳۰۶ اور ۳۰۷، ح ۱۳۴، ذیل سورۂ اسراء (۱۷)/۷۷۔

کسی نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ ابان بن تغلب امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالے سے امیر المومنین علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں:

«فَلَمَّا تُوُفِّيَ رَسُولُ اللَّهِ (ص) اشْتَغَلْتُ بِغُسْلِهِ وَ تَكْفِينِهِ وَ الْفَرَاغِ مِنْ شَأْنِهِ ثُمَّ آلَيْتُ عَلَى نَفْسِي يَمِيناً أَنْ لَا أَرْتَدِيَ بِرِدَاءٍ إِلَّا لِلصَّلَاةِ حَتَّى أَجْمَعَ الْقُرْآنَ فَفَعَلْتُ ثُمَّ أَخَذْتُ بِيَدِ فَاطِمَةَ وَ ابْنَيَّ الْحَسَنِ وَ الْحُسَيْنِ فَدُرْتُ عَلَى أَهْلِ بَدْرٍ وَ أَهْلِ السَّابِقَةِ فَنَاشَدْتُهُمْ حَقِّي وَ دَعَوْتُهُمْ إِلَى نُصْرَتِي فَمَا أَجَابَنِي مِنْهُمْ إِلَّا أَرْبَعَةُ رَهْطٍ سَلْمَانُ وَ عَمَّارٌ وَ أَبُو ذَرٍّ وَ الْمِقْدَادُ.»

جب رسول خدا کا انتقال ہو گیا تو میں پہلے ان کے غسل و کفن میں اور ان کے ضروری کاموں میں مصروف رہا۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے قسم کھائی کہ نماز کے علاوہ اس وقت تک دوش پر عبا نہیں ڈالوں گا جب تک کہ قرآن مجید کو جمع نہ کر لوں۔ پھر میں نے اسے انجام دے لیا۔ پھر میں نے فاطمۃ الزہرا اور حسن و حسین کا ہاتھ پکڑا اور اہل بدر اور قابل ذکر افراد کے دروازوں پر گیا، انھیں اپنا حق یاد دلاتے ہوئے اپنی مدد کے لیے پکارا لیکن سلمان، عمار، ابوذر اور مقداد جیسے چار افراد کے علاوہ کسی نے بھی میرا ساتھ نہیں دیا۔

سلیم کے مطابق، امیر المومنین علیہ السلام نے یہ کام دو بار انجام دیا؛ ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دفن کرنے کے بعد، اسی رات اور تین راتوں تک مہاجرین و انصار میں سے جنگ بدر میں شامل تمام ساتھیوں کے دروازوں پر گئے اور انھیں اپنے حق کی یاد دہانی کرواتے ہوئے اپنی مدد کے لیے پکارا لیکن سوائے چوالیس افراد کے کسی نے بھی اس امام علیہ السلام کی مدد کی ہامی نہیں بھری۔ امام علیہ السلام نے انھیں چوالیس افراد سے اگلی صبح سر منڈا کر اور تلواریں ہاتھوں میں لیے لڑنے کے لیے تیار رہنے کا وعدہ لیا لیکن

ان میں سے چار افراد کے علاوہ کوئی بھی وعدہ گاہ پر نہیں پہنچا۔[1] پھر آپ گھر میں قرآن جمع کرنے میں مشغول ہو گئے اور اسے مکمل کر کے مسجد میں لائے جہاں لوگ ابوبکر کے پاس حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ امام نے اپنے ہاتھوں سے جمع کیے گئے قرآن کو سب کے سامنے پیش کیا لیکن انھوں نے اسے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کے بعد آپ گھر کو واپس پلٹ گئے۔

پھر عمر کے اکسانے پر ابوبکر نے کسی کو (قنفذ کو) امیر المؤمنین علیہ السلام کے گھر یہ کہلا بھیجا کہ "خلیفۂ رسول اللہ نے بلا بھیجا ہے" لیکن امیر المؤمنین علیہ السلام نے یہ کہتے ہوئے جانے سے انکار کر دیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے یہ لقب میرے لیے مقرر ہے۔ دوسری بار پھر رات کے وقت، اپنی شریک حیات فاطمۃ الزہرا علیہا السلام اور حسنین علیہما السلام کے ساتھ اصحابِ پیغمبر کے گھر گئے اور اپنے حقوق کی یاددہانی کراتے ہوئے مدد مانگی لیکن پھر چار افراد کے علاوہ کسی نے بھی مثبت جواب نہیں دیا۔[2]

لیکن دوسری روایتوں میں یہ ذکر ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کے بعد مہاجرین و انصار کے گھروں پر گئے۔[3] بہرحال، جو بات یقینی ہے وہ یہ ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام، اصحابِ کساء کے ساتھ اصحابِ پیغمبر کے دروازں پر حق کا ساتھ دینے کی درخواست لے کر گئے لیکن صرف چار افراد نے امام علیہ السلام کی دعوت کا مثبت جواب دیا۔

کتابِ کافی میں مدینے میں ارشاد فرمائے گئے امام علیہ السلام کے ایک خطبے کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس خطبے میں بھی مذکورہ حوادث سے مشابہ واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس خطبے میں، جسے خطبۂ طالوطیہ کہا جاتا ہے، امیر المؤمنین علیہ السلام بہترین انداز میں، توحید کے معارف کو بیان کرتے ہوئے

---

(1) اس روایت میں عمار کے بجائے زبیر بن عوام کا نام لیا گیا ہے۔

(2) کتاب سلیم/۱۴۷-۱۴۸، ح۴۔

(3) رجوع فرمائیں: ۲۱۶/، ح۱۲ اور احتجاج/۱/۷۵، باب الانکار علی ابی بکر اور گزشتہ حوالہ/۱۹۰، باب احتجاجات امیر المؤمنین علیہ السلام اور اسی سے مشابہ: کتاب سلیم/۳۰۲، ح۲۵ اور گزشتہ حوالہ/۴۳۸، ح۹۷۔

رسول اللہ صلى الله عليه وآله وسلم کی رحلت کے بعد امت کے طرز عمل پر اس کی لعنت ملامت کرتے ہیں اور پھر حکومت کے معاملے میں اپنی قانونی حیثیت و حقانیت اور غاصبوں کے جبر و ظلم اور معاشرے کے حق میں ان کے جفاو جرائم کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

«أَمَا وَ اللهِ لَوْ كَانَ لِي عِدَّةُ أَصْحَابِ طَالُوتَ أَوْ عِدَّةُ أَهْلِ بَدْرٍ وَ هُمْ أَعْدَادُكُمْ لَضَرَبْتُكُمْ بِالسَّيْفِ حَتَّى تَئُولُوا إِلَى الْحَقِّ.»

خدا کی قسم! اگر میرے اتنے ہی ساتھ دینے والے ہوتے جتنے طالوت کے تھے یا اہل بدر کی تعداد کے برابر ہی ناصر و مددگار ہوتے جو تمہاری تعداد کے برابر ہیں تو ان کی مدد سے تمہیں تلوار کا وہ مزہ چکھاتا کہ تم حق کی جانب پھر سے لوٹ آتے۔

«... ثُمَّ خَرَجَ مِنَ الْمَسْجِدِ فَمَرَّ بِصِيرَةٍ فِيهَا نَحْوٌ مِنْ ثَلَاثِينَ شَاةً فَقَالَ: وَ اللهِ لَوْ أَنَّ لِي رِجَالًا يَنْصَحُونَ لِلهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ لِرَسُولِهِ بِعَدَدِ هَذِهِ الشِّيَاهِ لَأَزَلْتُ ابْنَ آكِلَةِ الذِّبَّانِ[1] عَنْ مُلْكِهِ.»

راوی کہتا ہے کہ پھر آپؑ مسجد سے نکلے حتیٰ کہ مویشیوں کے ایک باڑے کے قریب سے گزرے جس میں تیس کے قریب بکریاں تھیں تو آپؑ نے فرمایا: اللہ کی قسم! ان بکریوں کی تعداد کے برابر ہی اگر میرے پاس چند آدمی ہوتے جو خیر خواہ اور اللہ عزوجل اور اس کے رسولؐ کے لیے مخلص ہوتے تو میں غلاظت کھانے والے کے بیٹے کو اقتدار سے بے دخل کر دیتا۔

«... فَلَمَّا أَمْسَى بَايَعَهُ ثَلَاثُمِائَةٍ وَ سِتُّونَ رَجُلًا عَلَى الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمْ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ (ع) اغْدُوا بِنَا إِلَى أَحْجَارِ الزَّيْتِ مُحَلِّقِينَ وَ

---

[1] سلطانِ وقت کے لیے کنایہ ہے، ان افراد (ابوبکر) کے لیے کنایہ ہے جو ایام جاہلیت میں جو بھی گندی چیز پالیتے تھے اسے کھا جاتے تھے۔ علامہ مجلسی کے بیان کے مطابق، یہ ذلالت کے لیے کنایہ ہے۔

حَلَقَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ (ع) فَمَا وَافَى مِنَ الْقَوْمِ مُحَلِّقاً إِلَّا أَبُو ذَرٍّ وَ الْمِقْدَادُ وَ حُذَيْفَةُ بْنُ الْيَمَانِ وَ عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ وَ جَاءَ سَلْمَانُ فِي آخِرِ الْقَوْمِ.»[1]

روای کہتا ہے کہ جب رات ہوئی تو آپؑ سے تین سو ساٹھ لوگوں نے موت پر بیعت کرلی۔ ان سے امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ کل صبح سب سر منڈا کر حجاز الزیت کے مقام پر اکٹھا ہوں گے۔ امیر المومنینؑ خود سر منڈا کر اس مقام پر حاضر ہوئے لیکن سوائے پانچ افراد؛ ابوذر، مقداد، حذیفہ یمانی، عمار بن یاسر اور سلمان کے جو آخر میں پہنچے کسی نے امیر المؤمنین علیہ السلام کے ساتھ وفا نہ کی۔

ان روایات سے جن چیزوں کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام نے ابتداء ہی میں اور اپنی خلافت الٰہی غصب کیے جانے کے موقع پہ ہی ایک تحریک شروع کی اور مددگار جمع کیے لیکن لوگوں کی وعدہ خلافی کے بعد امام علیہ السلام نے جب خود کو بے بس پایا تو پھر غاصبوں کے خلاف عملی کارروائی ترک کردی اور گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ تاہم اس دور کے حکمرانوں سے امیر المؤمنین علیہ السلام کی یہ گوشہ نشینی بھی برداشت نہ ہوئی اور انھوں نے ان کے گھر پر حملہ کر کے اور تکلیف دہ واقعات کے ساتھ امیر المؤمنین علیہ السلام کو بیعت کرنے پر مجبور کیا اور زبردستی ان سے بیعت لے لی۔ البتہ ان واقعات و حادثات کا تفصیلی جائزہ، جو رحلتِ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ہفتے سے دس دن کے اندر ہی رونما ہوگئے، ان اسباق میں ہماری بحث کا موضوع نہیں ہے۔ ان شاء اللہ خدا کی مدد شامل حال رہی تو اس موضوع کا تفصیلی جائزہ بھی کسی اور کتاب میں پیش کیا جائے گا۔

---

[1] کافی ۸/۳۱-۳۳، ح ۵، خطبۃ امیر المؤمنین علیہ السلام فی معاتبۃ اصحابہ۔

سبق ۱۲

تحریک پر لگام اور اس کی حکمتیں-۱

پچھلے اسباق میں ہم نے واضح کیا کہ اس معاملے کے آغاز میں، امیرالمؤمنین علیہ السلام، نے خلافت کے غاصبوں کے خلاف قیام کے لیے اعوان و انصار اکٹھا کرنے کی کوشش کی لیکن جب لوگوں نے اپنے وعدے کو پورا نہیں کیا تو امام علیہ السلام نے بھی مسندِ حکومت کے غاصبوں کے خلاف عملی اقدام ترک کر دیا اور خاموش ہو گئے۔

یہ بات یقینی ہے کہ امام علیہ السلام کی خاموشی موت کے خوف یا دنیا کی خواہش کی وجہ سے نہیں تھی اور امیرالمؤمنین علیہ السلام بار بار اس اہم نکتے کو ثابت اور اس کی یاددہانی کر چکے تھے۔[1] یہاں جو اہم سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام جن کی شجاعت زبان زدِ خاص و عام ہے، صرف مددگاروں کے نہ ہونے کی وجہ سے خاموش بیٹھ جائیں اور غاصبوں کو اس بات کی

---

[1] بطور نمونہ: نہج البلاغہ / خطبات ۱۳ اور ۱۹۷ اور ۲۲۴ اور قصار الحکم ۲۳۶۔

اجازت دے دیں کہ وہ جو چاہے کریں اور آپ کی اور اہل بیتِ پیغمبر علیہم السلام کی شان میں مسلسل گستاخیاں کرتے رہیں؟

ان اسباق میں ہم اس سوال اور اسی طرح کے دوسرے سوالات کا جائزہ لیں گے اور امام علیہ السلام کی خاموشی کی وجوہات اور حکمت کو خود آپ ہی کی زبانی پیش کرنے کی کوشش کریں گے اور یہ ثابت کریں گے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام کے اس سلوک اور طرز عمل کو خلفاء سے ان کے راضی ہونے کی علامت تصور کرنا اور اس کے نتیجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ہونے والے واقعات کا جواز فراہم کرنا ایک بے بنیاد بات اور خام خیالی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وعدہ

امیرالمؤمنین علیہ السلام کے بیانات پر غور کرنے کے بعد ہم پاتے ہیں کہ اپنے اقدامات پر امام علیہ السلام کے لگام لگانے اور غاصبوں کے ظلم و ستم کے خلاف مزید عملی اقدام نہ کرنے کی بنیادی وجہ وہ عہد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے لیا تھا۔ امیرالمؤمنین علیہ السلام نے متعدد مواقع پر اس عہد کا حوالہ دیا ہے:

«فَقَالَ امیرُ اَلْمُومِنِینَ عَلَیْهِ السَّلاَمُ: یَا عَبْدَ اَلرَّحْمَنِ! انَّ اَللّهَ تَعالَي قُبَضَ نَبِيَّهُ صَلَّي اَللّهُ عَلَیْهِ وَ آلِهِ وَ اَنَا یَوْمَ قَبْضِهِ أَوْلي بِالنَّاسِ مِنِّي بِقَمِیصِي هَذَا وَ قَدْ كَانَ مِنْ نَبِيِّ اللّهِ اليَّ عَهْدٌ لَوْ خَزَمْتُمُونِي بِاَنْفِي لَأَقْرَرْتُ سَمْعاً لِلّهِ وَ طاعَةً.»[1]

---

[1] امالی، مفید/۲۲۳، المجلس السادس والعشرون، ح۱، بحار الانوار ۲۹/۵۸۲ ح۱۶ اور اسی سے مشابہ: بحار الانوار ۳۰/۱۰، سید ابن طاوؤس کی کتاب کشف المحجہ سے منقول۔

امیر المومنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اے عبد الرحمان! اللہ نے اپنے نبی کی روح ایسے عالم میں قبض فرمائی جب میں لوگوں کی سرپرستی کے لیے دوسروں پر اپنی اس قمیص سے زیادہ حق رکھتا تھا اور رسول اللہ کی جانب سے میری گردن پر ایک عہد تھا کہ اگر اس اونٹ کی طرح جس کی ناک میں نکیل کس دی جاتی ہے تم مجھے بھی رسی سے باندھ دیتے تو میں خدا کے حکم کی تعمیل کرتا۔

«أَمَا وَ الْبَيْتِ وَ الْمُفْضِي إِلَى الْبَيْتِ [وَ فِي نُسْخَةٍ وَ الْمُزْدَلِفَةِ] وَ الْخِفَافِ إِلَى التَّجْمِيرِ لَوْ لَا عَهْدٌ عَهِدَهُ إِلَيَّ النَّبِيُّ الْأُمِّيُّ (ص) لَأَوْرَدْتُ الْمُخَالِفِينَ خَلِيجَ الْمَنِيَّةِ وَ لَأَرْسَلْتُ عَلَيْهِمْ شَآبِيبَ صَوَاعِقِ الْمَوْتِ وَ عَنْ قَلِيلٍ سَيَعْلَمُونَ.»[1]

مگر قسم ہے خانۂ خدا کی اور اس تک پہنچنے والے راستے کی! اور قسم ہے رمی جمرات کے لیے تیزی سے بڑھنے کی! اگر وہ عہد نہ ہوتا جو مجھ سے رسول اللہ نے لیا تھا تو میں مخالفین کو موت کی وادیوں میں اتار دیتا اور میں ان پر موت بن کر ٹوٹ پڑتا اور عنقریب ہی وہ سب جان لیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے عہد کے مندرجات

یہ عہد، جس کی پابندی کو امیر المومنین علیہ السلام اس قدر اہم مانتے ہیں اور اس کا لحاظ کرتے ہوئے مزید اقدام سے گریز کا خود کو پابند سمجھتے ہیں، کیا تھا؟ خود امام علیہ السلام اس کے مندرجات بیان کرتے ہیں۔ سلیم کی کتاب سے ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے: امیر المومنین علیہ السلام کی بابرکت زندگی کے آخری سال میں آپ پر اعتراض ہوا کہ کیوں آپ لوگوں کو جنگ کی دعوت نہیں دیتے؟ اس وقت امیر المومنین علیہ السلام خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے لوگوں کی تساہلی اور ان کے ایمان کی کمزوری کی شکایت کرتے ہیں۔ اسی اثناء میں اشعث بن قیس نے امام علیہ السلام سے کچھ سوالات پوچھے۔ اس نے اعتراض

---

[1] کافی ۸/۳۲، ح ۵، خطبۃ الطالوتیہ۔

کرتے ہوئے کہا: اے ابوطالب کے بیٹے! آخر آپ کو ہو کیا گیا تھا جب ابوبکر و عمر اور بعد میں امویوں نے حکومت سنبھال لی تھی، آپ نے ان کا مقابلہ تلوار سے کیوں نہیں کیا؟ جبکہ آپ جب سے عراق تشریف لائے ہیں، آپ نے ایسا کوئی خطبہ نہیں پڑھا جس میں یہ نہ کہا ہو کہ خدا کی قسم! میں دوسروں سے زیادہ حکومت کا مستحق تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سے ہی میں مظلوم رہا اور مجھ پر ظلم وستم ہوتا رہا؛ تو پھر آپ نے ان سے جنگ کیوں نہیں کی؟

«فَقَالَ لَهُ عَلِيٌّ (عليه السلام) يَا ابْنَ قَيْسٍ [قُلْتَ فَاسْمَعِ الْجَوَابَ] لَمْ يَمْنَعْنِي مِنْ ذَلِكَ الْجُبْنُ وَلَا كَرَاهِيَةٌ لِلِقَاءِ رَبِّي وَأَنْ لَا أَكُونَ أَعْلَمُ أَنَّ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِي مِنَ الدُّنْيَا وَالْبَقَاءِ فِيهَا وَلَكِنْ مَنَعَنِي مِنْ ذَلِكَ أَمْرُ رَسُولِ اللَّهِ (صلي الله عليه وآله) وَعَهْدُهُ إِلَيَّ.»

علی علیہ السلام نے اس سے کہا: اے فرزند قیس! تم کہہ چکے تو اب جواب سنو: نہ ہی ڈر اور خوف اور نہ ہی موت سے فرار نے مجھے اس سے روکا اور نہ ہی یہ بات تھی کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ چیز جو میرے لیے خدا کے پاس ہے وہ اس دنیا اور اس دنیا میں رہنے سے زیادہ بہتر ہے بلکہ جس چیز نے مجھے تلوار کھینچنے سے روکا تھا وہ مجھ سے خدا کے رسول کا عہد تھا۔

«أَخْبَرَنِي رَسُولُ اللَّهِ (صلي الله عليه وآله) بِمَا الْأُمَّةُ صَانِعَةٌ بِي بَعْدَهُ فَلَمْ أَكُ بِمَا صَنَعُوا حِينَ عَايَنْتُهُ بِأَعْلَمَ مِنِّي وَلَا أَشَدَّ يَقِيناً مِنِّي بِهِ قَبْلَ ذَلِكَ بَلْ أَنَا بِقَوْلِ رَسُولِ اللَّهِ (صلي الله عليه وآله) أَشَدُّ يَقِيناً مِنِّي بِمَا عَايَنْتُ وَشَهِدْتُ.»

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بتادیا تھا کہ امت آپ کے بعد میرے ساتھ کیا کرے گی۔ لہذا جب میں نے اپنے ساتھ امت کے برتاؤ کو دیکھ لیا تو امت کے اس طرز عمل سے پہلے کی نسبت نہ ہی کسی طرح کے علم کا اضافہ ہوا بلکہ مجھے تو رسول اللہ کے

بیان پر محکم یقین تھا کہ ایسا ہو کر رہے گا یہاں تک کہ میں نے ایسا ہی ہوتے ہوئے دیکھ بھی لیا۔

«فَقُلْتُ :يَا رَسُولَ اللهِ! فَمَا تَعْهَدُ إِلَيَّ إِذَا كَانَ ذَلِكَ؟ قَالَ: إِنْ وَجَدْتَ أَعْوَاناً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ وَجَاهِدْهُمْ وَإِنْ لَمْ تَجِدْ أَعْوَاناً فَاكْفُفْ يَدَكَ وَاحْقِنْ دَمَكَ حَتَّي تَجِدَ عَلَي إِقَامَةِ الدِّينِ وَكِتَابِ اللهِ وَسُنَّتِي أَعْوَاناً.»[1]

میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر ایسا ہوا تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اگر تم کو مدد مل جاتی ہے تو ان کے ساتھ جنگ کرنا اور اگر مدد نہ ملے تو اپنا ہاتھ کھینچ رکھنا اور اپنے خون کی حفاظت کرنا یہاں تک کہ دین اور خدا کی کتاب اور میری سنت کو قائم کرنے میں مدد کرنے والے تمھیں مل جائیں۔

جیسا کہ دیکھا جا سکتا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کی دو شقیں ہیں۔ **اوّل**: اگر مددگار مل جائیں تو اپنے مخالفوں سے جنگ کریں۔ **دوّم**: اگر کافی تعداد میں مددگار نہیں ملتے ہیں تو اپنی جان (سُلیم سے منقول روایت کے مطابق اہل بیت اور اپنے شیعوں کے خون) کی حفاظت کریں۔

---

[1] کتاب سلیم/۲۱۵، ح ۱۲، ان کتابوں میں بھی اس موضوع کا بھی تذکرہ ہے: کتاب سلیم، ح ۱ اور ح ۲ اور ح ۴ اور ح ۲۵ اور ح ۶۱ اور ح ۶۷ اور غیبت طوسی/۱۹۳، فصل في أخبار المعمرين من العرب... اور گزشتہ حوالہ/۳۳۵، فصل في ذكر العلة المانعة لصاحب الأمر... والصراط المستقيم، عاملی ۲/۷۹، مستدرک الوسائل، محدث نوری ۱۱/۷۸-۷۴، کتاب الجہاد، باب سقوط جهاد البغاة... احتجاج ۱/۱۹۰، گزشتہ حوالہ ۱/۷۵ اور ۸۴، کتاب سلیم اور ارشاد القلوب سے منقول، دیلمی ۲/۳۹۵، باب خبر وفاة أبي بكر و معاذ بن جبل، کتاب سلیم اور شرح ابن ابی الحدید سے منقول ۱/۷۲، ۳، گزشتہ حوالہ ۲۰/۳۲۶، ق ۷۳۶، بحار الانوار ۲۸/۱۸۹ اور ۷۴، ۲، گزشتہ حوالہ ۳۰/۱۴، گزشتہ حوالہ ۳۳/۱۵۳، گزشتہ حوالہ، ۱۵/۹۰۔

اس بیان میں غور و فکر کے بعد ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ امیر المؤمنین علیہ السلام نے سب سے پہلے مدد گاروں کو جمع کرنا شروع کیا تاکہ کافی تعداد میں مدد گار فراہم ہونے پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کے پہلے حصے کو نافذ کرنے کے لیے آگے بڑھیں لیکن جب آپ جنگ کے لیے آمادہ مدد گاروں کی فراہمی کی طرف سے مایوس ہو گئے تو اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کے دوسرے حصہ کا پابند بنالیا اور اس طرح سے اپنے اور اپنے چنندہ ساتھیوں کی حفاظت کی اور عہد نبوی کو عملی جامہ پہنایا۔

مدد گاروں کی کمی، تحریک کو روکنے کی وجہ

امیر المؤمنین علیہ السلام نے متعدد بیانات میں مدد گاروں کی کمی کو اپنے تلخ صبر و سکوت کی وجہ قرار دیا ہے:

«اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْتَعْدِيْكَ عَلٰى قُرَيْشٍ وَ مَنْ أَعانَهُم فَاِنَّهُمْ قَدْ قَطَعُوا رَحِمِيْ، وَ اَكْفَأُوْا اِنَائِيْ، وَ اَجْمَعُوا عَلٰى مُنَازَعَتِيْ حَقًّا كُنْتُ اَوْلٰى بِهٖ مِنْ غَيْرِيْ، وَ قَالُوْا: اَلَا اِنَّ فِي الْحَقِّ اَنْ تَأْخُذَهٗ، وَ فِي الْحَقِّ اَنْ تُمْنَعَهٗ، فَاصْبِرْ مَغْمُوْمًا، اَوْ مُتْ مُتَاَسِّفًا. فَنَظَرْتُ فَاِذَا لَيْسَ لِيْ رَافِدٌ، وَ لَا ذَابٌّ وَ لَا مُسَاعِدٌ، اِلَّا اَهْلَ بَيْتِيْ، فَضَنِنْتُ بِهِمْ عَنِ الْمَنِيَّةِ، فَاَغْضَيْتُ عَلَى الْقَذٰى، وَ جَرَعْتُ رِيْقِيْ عَلَى الشَّجَا، وَ صَبَرْتُ مِنْ كَظْمِ الْغَيْظِ عَلٰى اَمَرَّ مِنَ الْعَلْقَمِ، وَ اٰلَمَ لِلْقَلْبِ مِنْ حَزِّ الشِّفَارِ.»[1]

---

[1] نہج البلاغہ/خطبہ ۲۱۷ اور اسی سے مشابہ: خطبہ ۲۶۔

خدایا! میں قریش اور ان کے مددگاروں سے انتقام لینے پر تجھ سے مدد کا خواہاں ہوں کیونکہ انھوں نے میری قرابت و عزیز داری کے بندھن توڑ دیئے اور میرے ظرف (عزت و حرمت) کو اوندھا کر دیا اور اس حق میں کہ جس کا میں سب سے زیادہ اہل ہوں، جھگڑا کرنے کے لیے اتحاد کر لیا اور یہ کہنے لگے کہ یہ بھی حق ہے کہ آپ اسے لے لیں اور یہ بھی حق ہے کہ آپ کو اس سے روک دیا جائے۔ یا تو غم و حزن کی حالت میں صبر کیجیے یا رنج و اندوہ سے مرجایئے۔ میں نے نگاہ دوڑائی تو مجھے اپنے اہل بیت (علیہم السلام) کے سوانہ کوئی معاون نظر آیا اور نہ کوئی سینہ سپر اور معین دکھائی دیا تو میں نے انھیں موت کے منہ میں ڈالنے سے گریز کیا۔ آنکھوں میں کانٹا تھا مگر میں نے چشم پوشی کی، حلق میں (غم و رنج کے) پھندے تھے مگر میں لعاب دہن نگلتا رہا اور غم و غصہ پیتے ہوئے ایسے حالات پر صبر کیا جو حنظل (ایک انتہائی تلخ جڑی بوٹی یا اندرائن) سے زیادہ تلخ اور دل کے لیے چھریوں کے کچوکوں سے زیادہ المناک تھے۔

دوسری جگہ معاویہ نے بھی اس نکتے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے ابوہریرہ اور ابوالدرداء کے ذریعے امام علیہ السلام کی خدمت میں بھیجے گئے خط میں لکھا ہے:

«رَأَيْتُکَ حَمَلْتَ اِمْرَأَتَکَ فَاطِمَةَ [عَلَى حِمَارٍ] وَأَخَذْتَ بِيَدِ اِبْنَيْکَ اَلْحَسَنِ وَاَلْحُسَيْنِ إِذْ بُويِعَ أَبُو بَكْرٍ فَلَمْ تَدَعْ أَحَداً مِنْ أَهْلِ بَدْرٍ وَ أَهْلِ اَلسَّابِقَةِ إِلاَّ دَعَوْتَهُمْ وَ اِسْتَنْصَرْتَهُمْ عَلَيْهِ فَلَمْ تَجِدْ مِنْهُمْ إِنْسَاناً غَيْرَ أَرْبَعَةٍ سَلْمَانَ وَأَبو أَبِي ذَرٍّ وَاَلْمِقْدَادِ وَاَلزُّبَيْرِ.»

... جب ابوبکر کی بیعت ہوگئی تو میں نے آپ کو دیکھا کہ اپنی زوجہ کو مرکب پر سوار کیے اپنے دونوں بچوں حسن و حسین کا ہاتھ تھامے ہر در پر گئے اور اہل بدر اور درخشاں ماضی کے حامل افراد میں سے تم نے کسی کو نہیں چھوڑا مگر یہ کہ انھیں دعوت دی اور ابوبکر

کے خلاف اپنے لیے مدد مانگی لیکن سوائے چار لوگوں سلمان، ابوذر، مقداد اور زبیر کے کسی نے بھی آپ کی مدد نہ کی۔

«...وسَمِعَتْكَ أُذُنَايَ وأَنْتَ تَقُولُ لِأَبِي سُفيَانَ حِينَ قَالَ لَكَ: «غُلِبْتَ يَا بنَ أَبِي طَالِبٍ عَلَى سُلْطَانِ ابْنِ عَمِّك ومَنْ غَلَبَكَ عَلَيهِ أذَلُّ أَحْيَاءٍ[1] قُرَيْشٍ تَيْمَ وَعدِي» ودَعَاكَ إلى أَن يَنْصُرَكَ فَقُلْتَ: «لَوْ وَجَدْتُ أَعْوَاناً أَرْبَعِينَ رَجُلاً مِنَ الْمُهَاجِرِينَ والأَنْصَارِ مِن أهْلِ السَّابِقَةِ لَنَاهَضْتُ هَذَا الرَّجُلَ» فَلَمَّا لَمْ تَجِدْ غَيْرَ أَرْبَعَةِ رَهطٍ بَايَعْتُ مُكْرَهاً.»[2]

میں نے اپنے انھیں دونوں کانوں سے سنا جب ابوسفیان نے آپ سے کہا: "اے ابوطالب کے بیٹے! تم اپنے چچازاد بھائی کی سلطنت کو حاصل کرنے میں ناکام رہے اور قریش کے پست ترین گروہ تیم اور عدی تم پر بازی لے گئے اور اسے ہتھیا بیٹھے۔" ابوسفیان نے آپ کی مدد کرنا چاہی[3] تو آپ نے کہا: اگر درخشاں ماضی کے حامل انصار و مہاجرین میں سے چالیس افراد میری مدد کرتے تو میں اُس سے جنگ کرتا، لہٰذا جب ان چار لوگوں کے سوا آپ کو کوئی اور نہ مل پایا تو آپ نے مجبوراً بیعت کر لی۔

---

[1] حیّ، قبیلے میں ایک مقام و مرتبے اور رتبے کا نام ہے۔

[2] کتاب سلیم/۳۰۳، ح۲۵، بحار الانوار ۳۳/۱۵۱، اسی سے مشابہ مضمون: شرح ابن ابی الحدید ۲/۴۷، کتاب سلیم/۲۱۹، ح ۱۲۔

[3] ابوسفیان کی اس پیشکش کے بارے میں "دریائے حقیقت پر شبہات کے بلبلے" نامی باب میں گفتگو ہوگی۔

امام علیہ السلام نے بھی معاویہ کے جواب میں اس معاملے کی تائید کی اور اپنے سکوت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے گئے اپنے عہد و پیمان سے جوڑتے ہوئے اپنی خاموشی کا جواز پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ سکوت کی اصل وجہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا گیا وعدہ ہے اور کچھ نہیں۔

جیسا کہ دیکھا جاسکتا ہے: خلافت کے غاصبوں کے خلاف عملی اقدام نہ کرنے اور ان کے مقابلے میں اپنی تحریک کو مزید آگے نہ بڑھانے کی وجہ صرف کافی تعداد میں مددگاروں کا نہ ہونا ہی نہیں ہے بلکہ امیر المؤمنین علیہ السلام کا یہ اقدام اس لیے بھی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا حکم بھی دیا تھا اور آنحضرتؐ نے آپؑ سے عہد و پیمان لیا تھا، لہذا آپؑ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کے مطابق شمشیر اٹھانے سے پرہیز کیا اور اس طرح سے اپنا، اہل بیت علیہم السلام اور اپنے بہت تھوڑے سے ساتھیوں کا خون اور ان کی جان محفوظ کرلی۔

ایک شبہے کا ازالہ

نہج البلاغہ میں ایک مقام پر، امیر المؤمنین علیہ السلام نے اپنی گردن پر ایک معاہدے کے وجود کا ذکر کیا جس کی وجہ سے آپؑ نے ابوبکر کی بیعت کی لیکن اس معاہدے کی اصل وجہ اور اس کے اسباب و علل کا ذکر نہیں کیا۔ اسی کو بنیاد بناتے ہوئے کچھ مخالفین -نہج البلاغہ کے بعض مفسرین کے مطابق- اس معاہدے کی مختلف صورتوں میں اور شیعہ عقائد کے منافی تشریح کرتے ہیں اور اسے ابوبکر کی حکمرانی کے ساتھ آپؑ کے راضی ہونے کی علامت سمجھتے ہیں:

> «اس دستاویز کے مطابق کہ جس کی دوسری روایات بھی تصدیق کرتی ہیں، علی علیہ السلام نے کسی مصلحت کی بنیاد پر شیخین کی حکومت پر اتفاق کیا اور بیعت کی ہے... اس رائے کی تصدیق میں اور ابوبکر سے بیعت کرنے کی وجہ کے سلسلے میں ہم نہج البلاغہ میں علی علیہ السلام کے بیان کو دیکھتے ہیں جہاں آپؑ فرماتے ہیں:

فَنَظَرْتُ فِيْ اَمْرِيْ. فَاِذَا طَاعَتِيْ قَدْ سَبَقَتْ بَيْعَتِيْ، وَاِذَا الْمِيْثَاقُ فِيْ عُنُقِيْ لِغَيْرِيْ.

یعنی: «میں نے اپنے معاملے میں غور کیا تو میرے لیے اطاعت رسول ﷺ کا مرحلہ بیعت پر مقدم تھا اور میری گردن میں آنحضرتؐ کے عہد کا طوق پہلے سے پڑا ہوا تھا۔»

نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے گمان کر لیا ہے کہ امام علیہ السلام اپنے اس بیان سے اس جانب اشارہ فرما رہے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے آپ سے اس بات کا حکم فرمایا تھا کہ جب حکومت کے معاملے میں اختلاف پیش آجائے تو تم اس کی بیعت کرنا جس کی سارے مسلمان بیعت کریں۔ اسی لیے علی علیہ السلام فرماتے ہیں: میری بیعت پر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت مقدم تھی اور رسول اللہ ﷺ کے حضور میں ہی میں نے کسی دوسرے کی بیعت کا پھندا اپنی گردن میں ڈالنے کا وعدہ کر لیا تھا۔[1]

پہلی بات: ایسا نہیں ہے کہ نہج البلاغہ کے سبھی مفسرین نے اس خطبے کی یہی ترجمانی کی ہو کیونکہ مثال کے طور پر: شارحِ نہج البلاغہ ابن میثم، امیر المؤمنین علیہ السلام کے مذکورہ بیان کو اس وقت سے متعلق مانتے ہیں جب لوگ آپؑ کی بیعت کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے اور آپ نے خلافت کو قبول کر لیا تھا۔[2]

دوسری بات: یہاں مذکورہ عہد و پیمان کے مندرجات کی وضاحت نہیں کی گئی ہے اور جو دستاویزات و شواہد ہم نے پیش کیے، ان کے ذریعے ہم نے واضح کیا کہ رسول اللہ ﷺ

---

[1] راہی بہ سوی وحدت اسلامی/۱۶۷-۱۶۹۔
[2] شرح نہج البلاغہ، ابن میثم ۲/۹۷، خطبہ نمبر ۳۶ کے ذیل میں۔

کے عہد و پیمان کی دو شقیں تھیں اور پہلی شق کو یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے! یعنی، حضور ﷺ نے سب سے پہلے فرمایا: اگر آپ کو مددگار مل جائیں تو قیام کیجیے اور اُٹھ کر اپنا حق لے لیجیے اور پھر اس کے بعد دوسرے مرحلے میں آپؐ نے فرمایا ہے: اگر آپ کو کوئی مددگار نہ ملا تو اپنا ہاتھ روک لیجیے اور اپنی جان اور اور اپنے خون کی حفاظت کیجیے۔ لہذا امام علیہ السلام نے ابوبکر سے متفق ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ فرمانِ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں اس راستے کا انتخاب کیا اور کہیں بھی اس بات کا تذکرہ نہیں ملتا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا ہو کہ اگر خلافت کے بارے میں کوئی جھگڑا ہو تو، آپ مسلمانوں کے چُنے ہوئے شخص کی بیعت کرلیں۔

تیسری بات: اس فقرے « إِذَا الْمِيْثَاقُ فِيْ عُنُقِيْ لِغَيْرِيْ. » کا لازمی طور پر یہی مطلب نہیں ہے کہ رسول خدا ﷺ کی حیات میں ہی دوسرے شخص سے بیعت کرنے کا پختہ عہد ہو گیا تھا بلکہ یہ جملہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام رسول خدا ﷺ کے ساتھ ہوئے عہد کی خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں: میرا پیغمبر ﷺ کے ساتھ ایک عہد تھا اور آنحضرتؐ سے کیا گیا عہد و پیمان میری گردن پر تھا، اسی وجہ سے میں خاموش رہا اور جو کچھ بھی ہوتا رہا اس پر خاموش تماشائی بنا رہا۔

اگرچہ مصنف کسی حد تک ہماری باتوں سے متفق ہے اسی لیے ہماری باتوں کو قبول کرتے ہوئے آگے چل کر لکھتا نظر آتا ہے:

« اسی لیے سید ابن طاوؤس (مشہور اور متقی شیعہ علماء میں سے ایک) کی کتاب کشف المحجہ میں بیان کیا گیا ہے: رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد، ایک گروہ علی علیہ السلام کے پاس آیا اور آپؑ کی حمایت اور مدد کرنے کی پیشکش رکھی اور علی علیہ السلام سے مسلمانوں کے معاملات کی باگ ڈور سنبھالنے اور دوسروں کی مخالفت کرنے کو کہا لیکن علی علیہ السلام نے

ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کھلے الفاظ میں کہا: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے وصیت کی تھی اور میں اس سلسلے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ عہد رکھتا ہوں جس کی میں کسی صورت خلاف ورزی نہیں کر سکتا اور اس عہد کو نہیں توڑ سکتا۔" »

مذکورہ بالا اقتباس محمد ابن ابی بکر کی شہادت کے بعد لوگوں کو لکھے گئے امیر المؤمنین علیہ السلام کے خط کا ایک حصہ ہے اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اسی خط میں تھوڑا سا آگے بڑھ کر امام علیہ السلام کی طرف سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد و پیمان کے مندرجات کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے مطابق اپنی خاموشی اور قیام نہ کرنے کی وجہ کا بھی ذکر امیر المؤمنین علیہ السلام نے فرمادیا ہے [1] لیکن مصنف پہلے ہی سے اپنے نتائج کو درست اور اچھا دکھانے کے چکر میں اس کا ذکر کرنے سے کتراتا نظر آتا ہے۔

لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کے مطابق امیر المؤمنین علیہ السلام نے سب سے پہلے صحابہ کو اپنی مدد اور نصرت کے لیے بلایا تا کہ غاصبوں اور ظالموں سے اپنا جائز حق لیں لیکن آپ کو لوگوں کی بے وفائی کا سامنا کرنا پڑا اور انھوں نے اپنے آپ کو بے یار و مددگار اور بے بس پایا، جس کے بعد آپ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کے مطابق ظالموں کے ظلم و ستم پر صبر کیا اس حال میں کہ آنکھ میں کانٹا اور گلے میں ہڈی تھی، اپنے اور اپنے شیعوں کے جان کی حفاظت کی اور اس طرح امیر المؤمنین علیہ السلام نے اپنا الٰہی فرض ادا کیا۔

---

[1] بحار الانوار ۳۰/۱۵۔ امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: « وَ قَدْ كَانَ رَسُولُ اللهِ عَهِدَ إِلَيَّ عَهْداً فَقَالَ: يَا ابْنَ أَبِي طَالِبٍ! لَكَ وِلاَيَةُ أُمَّتِي فَإِنْ وَلَّوْكَ فِي عَافِيَةٍ فَقُمْ بِأَمْرِهِمْ وَإِنِ اخْتَلَفُوا عَلَيْكَ فَدَعْهُمْ وَ مَا هُمْ فِيهِ فَإِنَّ اللهَ سَيَجْعَلُ لَكَ مَخْرَجاً. »

سبق ۱۳

تحریک پر لگام اور اس کی حکمتیں-۲

پچھلے دو اسباق میں ہم نے واضح کیا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام نے اس عہد و پیمان کے مطابق جو آپؑ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا تھا، سب سے پہلے اپنے حق کے غاصبوں کے خلاف مدد گاروں کو اکٹھا کرنا شروع کیا لیکن چونکہ مہاجرین اور انصار نے وعدہ وفا نہ کیا اور آپؑ کو تنہا چھوڑ دیا اس لیے آپؑ نے اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے اس وقت کے حکمرانوں کے خلاف تحریک پر لگام لگا دی اور خاموشی کا تلخ گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اب اس بحث میں آگے چل کر ہم امیر المؤمنین علیہ السلام کے طرزِ عمل کے بارے میں کچھ سوالات کا جائزہ لیں گے تاکہ امام علیہ السلام کی حکمت مزید واضح ہو جائے اور پھر اس کے بعد ہم غاصبوں کے خلاف آپ کے عدم قیام کی دوسری وجوہات کا جائزہ لیں گے۔

سب سے پہلے ہم آپ کو یہ یاد دلانا چاہتے ہیں کہ امام علیہ السلام کے سلسلے میں یہ عقیدہ کہ امام ولایت مطلقہ کا حامل ہوتا ہے اور وہ مفترض الطاعہ ہے یعنی اس کی اطاعت فرض اور واجب ہے اور یہ کہ امام عصمتِ الٰہی کا مالک ہوتا ہے اور اس سے کسی بھی طرح کی کوئی خطا و لغزش سرزد نہیں ہوتی؛ ہمیں امام علیہ السلام کے طرز عمل میں موجود حکمت کے اسباب و علل کی تلاش و جستجو سے بے نیاز کر دیتا

ہے کیونکہ بنیادی طور پر کسی ایسے شخص کے مقابلے میں جس کے بارے میں ہمیں یقین ہو کہ وہ حجتِ خدا ہے اور ہم پوری طرح سے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم رکھنے اور اس کی بات ماننے پر ہی مامور ہیں تو پھر بے چوں چرا کیے اس کی بات ماننا ہی ہوگی اور اس کے فرمان کو تسلیم کرنا ہی ہوگا اور اس کے علاوہ کسی طرح کا کوئی ردعمل ہماری طرف سے سوائے اطاعتِ محض کے آئے گا ہی نہیں۔ ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر کوئی امام علیہ السلام کے قول و فعل کے سامنے چوں چرا کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ امام کی قدر و منزلت کو پہچانتا ہی نہیں ہے اور اس سے بے خبر ہے۔

جو بات یقینی ہے اور اس پر اعتقاد رکھنا بھی واجب ہے، وہ یہ ہے کہ امام جو کچھ بھی کرتا ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے وہ خدا کی مرضی اور خدا کے حکم کے مطابق ہی کوئی بھی فعل انجام دیتا ہے اور یہاں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر وہ اپنے فعل اور قول کا کوئی بھی جواز پیش کرتا ہے یا کوئی بھی پہلو ذکر کرتا ہے تو اسے قبول کرنا بھی بے ضروری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد و پیمان اور امیر المؤمنین علیہ السلام کی جانب سے اس کی پابندی کے سلسلے میں بھی یہی حال ہے۔ چاہے امیر المؤمنین علیہ السلام بیان نہ بھی فرماتے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے اپنے عہد و پیمان کی وجہ سے غاصبوں کے خلاف قیام کرنے سے پرہیز کیا ہے یا چاہے اب کہ جب بیانات علوی نے ان کے طرز عمل کے اس پہلو کو واضح کر دیا ہے، دونوں صورتوں میں شیعہ، امام کے فعل کو پوری طرح سے درست اور خود کو اسے قبول کرنے کا پابند سمجھتا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد و پیمان کے بارے میں بھی یہی حکم لاگو ہوتا ہے کہ چاہے ہم اس کی حکمت کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، ہمیں اسے تسلیم کرنا اور اس پر یقین کرنا ہوگا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو بھی امیر المؤمنین علیہ السلام کو حکم دیا اور ان سے عہد و پیمان لیا وہ خدا کی مرضی اور معاشرے کے مفاد کے مطابق تھا۔

لیکن چونکہ ان عظیم ہستیوں نے، اپنے فضل و کرم کے ذریعے اپنے طرز عمل اور قول و فعل کی خود ہی وضاحت کی ہے اور اپنے فعل کی کچھ حکمتوں کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے اپنے شیعوں سے حیرت اور الجھن کو دور کر دیا ہے، لہٰذا ہم بھی ان حکمتوں اور توجیہات کو پیش کرتے ہوئے لوگوں کے ذہنوں میں موجود شکوک و شبہات اور سوالات کو دور کریں گے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام مددگاروں کی تلاش میں کیوں تھے؟

یہ سوال ذہن میں آسکتا ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام نے اپنے دشمنوں کے خلاف کارروائی کو دوستوں اور مددگاروں کے مل جانے تک کیوں مؤخر کیا؟ وہ تو قتل ہونے سے نہیں ڈرتے تھے اور پچھلی لڑائیاں شاہد ہیں کہ آپؑ ناصر اور یاور کا انتظار نہیں کرتے تھے، کیا آپؑ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر تنہا نہیں سوئے؟ یا جنگ احد، خیبر اور خندق میں آپ نے یکہ و تنہا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع نہیں کیا؟ تو پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اپنے دشمنوں کا مقابلہ کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ عمرو ابن عبدود اور دوسرے عرب شہسواروں سے زیادہ جنگجو اور بہادر تھے جن کے سامنے محاذ آرائی کو مددگاروں کی موجودگی پر موقوف کر دیا جائے؟ کیا ہوا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام اس معرکے میں اپنی جان ہتھیلی پر لیے سامنے نہیں آئے اور نہ ہی اپنی تلوار نیام سے کھینچی؟ جواب میں ہم کہتے ہیں:

پہلی بات: جیسا کہ ذکر کیا گیا، یہاں امام کی ایک الگ ذمہ داری تھی۔ انھوں نے بار بار یہ نشاندہی بھی کی کہ اگر خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عہد و پیمان نہ ہوتا تو وہ غاصبوں کو تلوار کا مزہ چکھا دیتے اور ان پر ٹوٹ پڑتے[1] لیکن اس معاملے میں، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق آپؑ کو مددگار میسر ہونے کے صورت میں ہی ایسی کارروائی کرنا تھی۔

---

[1] کافی ۸/۳۳، احتجاج ۱/۸۳، باب الہجوم علی دار علی، گزشتہ حوالہ: ۹۵/، باب احتجاج فاطمہ فی فدک۔

دوسری بات: امام صادق علیہ السلام سے بھی ایسا ہی سوال ہوا کہ آخر امیر المومنین علیہ السلام نے اپنا حق حاصل کرنے کے لیے کارروائی کرنے سے گریز کیوں کیا؟ امام علیہ السلام نے جواب دیا:

«إِنَّ اَللَّهَ لَمْ يُكَلِّفْ هَذَا إِلاَّ إِنْسَاناً وَاحِداً رَسُولَ اَللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ قَالَ: ﴿فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اَللَّهِ لاَ تُكَلَّفُ إِلاَّ نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ اَلْمُؤْمِنِينَ﴾ [1] فَلَيْسَ هَذَا إِلاَّ لِلرَّسُولِ وَ قَالَ لِغَيْرِهِ: ﴿إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ﴾ [2] فَلَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ فِئَةٌ يُعِينونهُ عَلَيَّ أمره.» [3]

اللہ نے ایک شخص یعنی رسول اللہ کے علاوہ کسی اور کو اس حکم پر مامور نہیں کیا ہے، جہاں ارشاد ہوتا ہے: «تو اے نبیؐ! تم اللہ کی راہ میں لڑو، تم اپنی ذات کے سوا کسی اور کے لیے ذمہ دار نہیں ہو۔ (یہ کام خاص تمہارا ہے اور دوسروں پر اس کا بوجھ نہ ڈالو) البتہ اہل ایمان کو لڑنے کے لیے آمادہ کرو» لہذا یہ امر (صرف جنگ کرنا) رسول اللہ کے سوا کسی اور کے لیے نہیں ہے اور اللہ نے دوسروں کے لیے ارشاد فرمایا ہے: «سوائے اس کے جو جنگ (ہی) کے لیے کوئی داؤ چل رہا ہو یا اپنے (ہی) کسی

---

(۱) نساء (۴)/۸۴۔ اس بات کی یاد آوری بھی ضروری ہے کہ ایک طویل مدت تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی جنگ کی اجازت نہیں تھی لیکن جنگ کا حکم ملنے کے بعد اور کچھ مدت گزرنے کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ حکم نازل ہوا۔

(۲) انفال (۸)/۱۶ (رجوع فرمائیں بحار الانوار ۹۰/۷-۸)

(۳) بحار الانوار ۲۹/۴۴۹، ح ۳۸، گزشتہ حوالہ ۱۹/۳۴۰، تفسیر عیاشی سے منقول ۱/۲۶۱، ح ۲۱۱، اسی سے مشابہ: بحار الانوار ۲۹/۴۵۱، ح ۴۱ اور ۴۲، کتاب سلیم/۳۰۳، ح ۲۵، وسائل الشیعہ، حر عاملی ۱۵/۸۹، ح ۲۰۰۴۶۔

لشکر سے (تعاون کے لیے) ملنا چاہتا ہو» لہٰذا اس وقت امیرالمومنین کے کام میں مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

اس بیان کی وضاحت میں یہ بتانا ضروری ہے کہ سورۂ نساء کی آیت کے مطابق، جنگ لڑنے کا حکم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختص ہے، اسی لیے امیرالمومنین علیہ السلام کے لیے یہ حکم نہیں تھا کہ وہ مددگار نہ ہونے کے باجود لڑیں۔ اسی طرح سورۂ انفال کی آیت کے مطابق، میدان جنگ سے بھاگ جانا گناہ (کبیرہ) ہے، سوائے اس کے کہ کوئی جنگی حکمت عملی کے تحت جنگ کو کہیں اور لے جانا چاہتا ہو یا یہ کہ مددگار اکٹھا کرنا چاہتا ہو۔ دوسرے مومنوں کو صرف اسی صورت میں میدان جنگ سے پیٹھ پھیرنے کی اجازت ہے جبکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔ لہٰذا، امام صادق علیہ السلام کے بیان کے مطابق، جب امیرالمومنین علیہ السلام نے اپنا کوئی مددگار نہ پایا تو آپ نے غاصبوں کے خلاف اپنی تحریک پر لگام لگا دی۔[1]

کیا امیرالمومنین علیہ السلام کے مارے جانے کا خطرہ تھا؟

ایک اور سوال جو ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا امیرالمومنین علیہ السلام کی الٰہی طاقت کے باوجود ان کے مارے جانے کا امکان ہے؟ اور کیا دوسرے مقامات پر بھی مارے جانے کے امکان نے امام علیہ السلام کو اپنا فرض ادا کرنے سے روکا تھا؟ جواب میں ہم کہتے ہیں:

پہلی بات: یہ طے نہیں ہے کہ ائمہ علیہم السلام ہمیشہ اپنی غیبی اور الٰہی طاقت کا استعمال کریں۔ ائمہ علیہم السلام کے پاس ایسی طاقتوں کا وجود اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ اس کا ہر مقام پر استعمال کریں۔ اس لیے جہاں خدا کی مرضی ہوتی ہے وہیں یہ عظیم ہستیاں اللہ کی عطا کردہ ان قوتوں کو استعمال

---

[1] اسی سے مشابہ دوسرے اسباب و علل کا تذکرہ بھی موجود ہے، رجوع کریں: بحار الانوار ۲۹/۴۴۹، ذیل ح ۳۸۔

کرتی ہیں، ور نہ وہ خدا کی مرضی کے تابع ہیں۔ ایک موقع پر، امیر المؤمنین علیہ السلام قلعۂ خیبر کے دروازے کو تن تنہا اکھاڑ دیتے ہیں اور اسلام کو خدائی فتح عطا کرتے ہیں اور ایک اور موقع پر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ آپ کے گلے میں رسی باندھ کر بیعت کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ طرز عمل میں اس طرح کا رویہ نہ صرف یہ کہ ان عظیم ہستیوں کے پاس الٰہی طاقت کی موجودگی سے متضاد نہیں ہے، بلکہ خدا کی مرضی کے سامنے ان کی مکمل تابعداری کو بھی ظاہر کرتا ہے اور ان کے ہر زمانے میں ان کے خاص وظائف و فرائض کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد و پیمان کے مندرجات و مفاہیم سے بھی عیاں ہے، اس مقام پر امیر المؤمنین علیہ السلام کا فریضہ اپنی آسمانی طاقت سے زمین و آسمان کو تہہ و بالا کرنا نہیں تھا اور نہ ہی اپنے مخالفین کو بہ یک جنبش نگاہ نیست و نابود کرنا تھا، بلکہ اس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق آپ کا فریضہ مطیع اور طاقتور مددگاروں کے ساتھ مل کر ایسا کرنا تھا اور اگر اصطلاحاً کہا جائے تو آپ اس مقام پر، ظاہر پر مامور تھے۔[1]

دوسری بات: پہلے نکتے اور اُس زمانے کے رجحانات کا ایک جائزہ لینے کے بعد ہم متوجہ ہو جائیں گے کہ ان حالات میں تن تنہا قیام کرنے کا نتیجہ سوائے مارے جانے کے اور کچھ نہیں نکل سکتا تھا:

«قَالَ لَه قَائِلٌ: يَا اميرالمومنِينَ! أرَأيْتَ لَوْ كَانَ رَسُولُ اَللّهِ صلي الله عليه وآله وسَلَّم تَرَكَ وَلَداً ذَكَراً قَدْ بَلَغَ الحُلُمَ وَآنَسَ مِنهُ الرُّشْدُ أكَانَتِ العَرَبُ تُسَلِّمُ اَلَيهِ أمْرَهَا؟ قَالَ: لَا. بَلْ كَانَتْ تَقْتُلُهُ اِنْ لَمْ يَفْعَلْ مَا فَعَلْتُ.»[2]

---

[1] احتجاج ۱/ ۸۳، باب الہجوم علی دار علی۔

[2] شرح ابن ابی الحدید ۲۰/ ۲۹۸، حکمت ۴۱۴۔

کسی نے پوچھا: اے امیرالمؤمنین علیہ السلام! اگر رسول اللہ کا کوئی بیٹا ہوتا جو بالغ اور رشید (سمجھدار) ہوتا، تو کیا عرب اپنے معاملات اس کے سپرد کردیتے؟ (یعنی حکومت اس کے حوالے کردیتے؟) امام علیہ السلام نے فرمایا: نہیں، بلکہ جو رویہ میں نے اپنایا ہے اگر وہی رویہ وہ نہ اپناتا تو یقیناً یہ اسے مار دیتے۔

یہ نکتہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس بیان میں بھی دیکھا جاسکتا ہے جس میں وہ ارشاد فرماتے ہیں:

«فَإِنْ وَجَدْتَ أَعْوَاناً عَلَيْهِمْ فَجَاهِدْهُمْ وَإِنْ لَمْ تَجِدْ أَعْوَاناً فَاكْفُفْ يَدَكَ وَاحْقِنْ دَمَكَ فَإِنَّكَ إِنْ نَابَذْتَهُمْ قَتَلُوكَ.»[1]

تو اگر تمہیں مددگار مل گئے تو ان سے لڑو اور اگر مددگار نہ ملے تو اپنا ہاتھ کھینچ رکھو اور اپنی جان بچاؤ کیونکہ اگر تم ان سے جنگ کا اعلان کروگے تو وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔

ایک اور نکتہ جس پر توجہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام کی زندگی محض غاصبوں کے خلاف قیام کی ہی وجہ سے خطرے میں نہیں پڑتی بلکہ تخت حکومت کے غاصبوں کی جسارتیں اور بے باکیاں اس حد تک پہنچ چکی تھیں کہ اگر امام علیہ السلام بیعت نہ بھی کرتے تب بھی وہ محفوظ نہیں تھے۔ دوسرے لفظوں میں خلافت کے لیے غاصبوں کی حرص اور امیرالمؤمنین علیہ السلام کی مخالفت کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ اگر آپؑ تنہا یا کچھ ساتھیوں کے ساتھ قیام کے لیے اٹھ کھڑے بھی ہوتے تو نہ صرف وہ آپؑ کو مار ڈالنے سے بھی نہ ہچکچاتے بلکہ آپؑ کی گوشہ نشینی اور الگ تھلگ ہوجانے پر بھی راضی نہ ہوتے اور امام علیہ السلام سے بیعت لے کر ہی مانتے۔[2]

---

[1] کتاب سلیم/۳۰۴، ح۲۵۔

[2] یہ معاملہ اس واقعے سے بہتر طور پر روشن ہوجاتا ہیں جہاں بارہ اصحاب پیغمبر نے ابوبکر کے خلاف احتجاج کیا جس کے نتیجے میں عمر اور خالد بن ولید اور کچھ دوسروں نے اپنی شمشیریں نیام سے باہر کھینچ لیں اور مدینے کو فوجی چھاؤنی میں

امیر المؤمنین علیہ السلام اشعث بن قیس کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«وَيْلَكَ يا بنَ قَيْسٍ! إنَّ القَوْمَ حِينَ قَهَرُونِي واسْتَضْعَفُونِي وَكادُوا يَقتُلُونَني لَوْ قَالُوا لِي: نَقْتُلُكَ البَتَّةَ لَامْتَنَعْتُ مِن قَتلِهِم إِيَّاي ولَوْ لَمْ أَجِدْ غَيْرَ نَفسِي وَحْدِي ولَكِنْ قَالُوا: إِنْ بَايَعْتَ كَفَفْنا عَنْكَ وأكْرَمْناكَ وَقَرَّبْناكَ وَفَضَّلْناكَ وإن لَمْ تَفعَل قَتَلْناكَ. فَلَمّا لَمْ أَجِدْ أَحَداً بَايَعْتُهُم وبَيعَتِي إيّاهُم لا يَحِقُّ لَهُم باطِلاً وَلا يُوجِبُ لَهُم حَقاً.»

وائے ہو تجھ پر قیس کے بیٹے! جب اس (غاصب) گروہ نے مجھے بے بس کر کے مجھ پر قابو پالیا اور وہ مجھے مارنے ہی والے تھے، اس وقت اگر وہ مجھ سے کہتے: ہر صورت میں) ہم تمہیں مار ڈالیں گے تو اگرچہ میرا اپنے سوا کوئی مددگار نہیں ہوتا تب بھی میں ان کا مقابلہ کرتا اور انھیں اپنے قتل سے روکتا لیکن انھوں نے مجھ سے کہا: اگر تم بیعت کرتے ہو تو پھر ہم تمھیں قتل نہیں کریں گے اور تمھیں عزت سے نوازیں گے اور تمھیں اپنے قریبیوں میں شامل کر کے مقام و مرتبہ دیں گے اور اگر بیعت نہیں کرتے ہو تو پھر ہم تمھیں جان سے مار ڈالیں گے۔ چنانچہ جب مجھے کوئی مدد نہ ملی تو میں نے ان سے بیعت کی اور میری یہ جبری بیعت نہ ان کے کسی باطل کو حق کو اور نہ ہی کسی حق کو ان کے لیے مفید بناتی ہے۔

مددگار نہ ہونے کی وجہ سے امام علیہ السلام نہ تو قیام کر سکتے تھے اور نہ ہی ان سے منہ موڑنے کا وقت ملا اور بیعت کے سوا جان بچانے کی کوئی صورت نہیں بچی تھی۔ لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم

تبدیل کر دیا اور ہر ایک کو ڈراتے دھمکاتے ہوئے اعلان کیا کہ اب جو کوئی بھی کچھ بولے گا اسے مار ڈالا جائے گا۔ رجوع فرمائیں: احتجاج ۱/۷۹، باب الانکار علی ابی بکر، بحار الانوار ۲۸/۲۱۳۔

سے اور اپنی جان بچانے کے لیے آپؑ نے نہ صرف قیام نہیں کیا بلکہ ان کے ساتھ جبری بیعت کو بھی قبول کر لیا۔

اسی وجہ سے بیعت کرنے سے پہلے آپؑ نے سب کے سامنے تین بار حجت تمام کی اور مخالفین وغاصبانِ خلافت سے یہ اعتراف لیا کہ اگر آپؑ نے بیعت نہیں کی تو انھیں قتل کر دیا جائے گا اور اس طرح رسول اللہ ﷺ کے عہد کے دوسرے حصے پر عمل کرتے ہوئے جو کہ اپنی جان بچانے کی ضرورت پر مبنی تھا، آپؑ نے مجبوراً ابوبکر کی بیعت کی اور ابوبکر کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھنے سے پہلے اپنے اوپر امت کے ظلم وستم پر رسول اللہ ﷺ کو شاہد بنایا اور آنحضرت کے مرقدِ مطہر کی طرف رخ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿«يَابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي»﴾[1]

اے میرے ماں جائے! قوم نے مجھے کمزور اور بے بس کر دیا اور قریب تھا کہ یہ لوگ مجھے قتل کر ڈالیں۔

---

[1] الاعراف (۷) ۱۵۰۔ کتاب سلیم/۱۵۸، ح ۳۔ حتجاج/۱/۸۳، باب الجوم علی دار علی اور اسی سے مشابہ: تفسیر عیاشی ۲/۶۷، اختصاص، مفید/۱۸۶ اور ۲۷۵۔ بحار الانوار ۲۸/۲۲۸ اور ۲۲۹، گزشتہ حوالہ، ۲۸/۳۵۶، گزشتہ حوالہ ۲۹/۶۲۶، الامامۃ والسیاسۃ سے منقول ۱/۱۳، بحار الانوار ۲۸/۲۳۰، بصائر الدرجات/۲۹۵، الجزء السادس، باب ۵، ح ۵، بحار الانوار ۳۱/۵۱، مناقب شہر ابن آشوب سے منقول۔

سبق ۱۴

تحریک پر لگام اور اس کی حکمتیں-۳

گزشتہ سبق میں ہم نے امیرالمومنین علیہ السلام کے طرز عمل کے بارے میں پیش آنے والے کچھ سوالوں کے جواب دیے اور بتایا:

اوّل: امیرالمومنین علیہ السلام نے جو کچھ بھی کیا وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد و پیمان کے مطابق تھا۔ اگر آپ کے طرز عمل کی حکمت کے کچھ پہلو ہم پر پوشیدہ ہوں، تب بھی یہ چیز ہمارے لیے شک و شبہے اور بے بنیاد جوازوں کا سہارا لینے کا عذر فراہم نہیں کرتی۔

دوم: چونکہ بغیر یار و مددگار کے غاصبوں کے خلاف قیام میں ناحق قتل کا خطرہ تھا اس لیے امیرالمومنین علیہ السلام نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے توقّف اختیار کیا اور غاصبان خلافت کے ظلم و جبر کے مقابلے میں صبر کیا۔ اس سبق میں ہم اس سلسلے میں دو دیگر سوالات کا جائزہ لیں گے۔

حامیوں کی تعداد کا تحریک کے آغاز سے تعلق

ان دستاویزات کے مطالعے سے، جن میں جناب امیر علیہ السلام کے پاس مددگار نہ ہونے کی بات کہی گئی ہے، ان مددگاروں کی تعداد میں اختلاف نظر آتا ہے۔ جناب امیر علیہ السلام کبھی فرماتے ہیں: اگر میرے پاس مہاجرین وانصار میں سے چالیس مددگار ہوتے تو میں غاصبوں سے اپنا حق واپس لے لیتا[1] اور بعض اوقات یہ کام تیس افراد کی موجودگی سے مشروط بتاتے ہیں۔[2] کبھی آپؑ اصحاب طالوت اور اہل بدر کی تعداد کے برابر تین سو تیرہ افراد کا وجود اس عمل کے لیے ضروری سمجھتے ہیں[3] اور بعض اوقات اس مقصد کے لیے بیس افراد کے وجود کی خواہش کرتے ہیں۔[4] ایک مقام پر تین یا چار لوگوں کے وجود کو کارروائی کے لیے کافی نہیں مانتے اور کبھی فرماتے ہیں کہ حمزہ اور جعفر ہوتے تو میں اپنا حق واپس لے لیتا:

«وَ لَوْ كَانَ بَعْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيهِ وَ آلِهِ عَمِّي حَمْزَةُ وَ أَخِي جَعْفَرٌ لَمْ أُبَايِعْ كُرهاً وَ لَكِنِّي مُنِيتُ بِرَجُلَيْنِ حَدِيثَيْ عَهْدٍ بِالْإِسْلَامِ الْعَبَّاسِ وَ عَقِيلٍ ...»[5]

---

(1) بحار الانوار ۳۳/۱۵۱، کتاب سلیم سے منقول، شرح ابن ابی الحدید ۳/۴۷، احتجاج ۱/۸۳۔

(2) کافی ۶/۳۴، خطبہ طالوطیہ۔

(3) گزشتہ حوالہ۔

(4) تفسیر عیاشی ۲/۶۶-۶۸، اختصاص/۱۸۷ حدیث سقیفہ بنی ساعدہ۔

(5) حق الیقین ۲/۱۷۷ اور اسی سے مشابہ: شرح ابن ابی الحدید ۱۱/۱۱۱، کتاب سلیم/۲۱۶، ح ۱۲، تفسیر عیاشی ۲/۵۱، ح ۳۱، بحار الانوار ۲۹/۴۵۲، ح ۴۲، گزشتہ حوالہ ۳۰/۱۵، محمد بن ابی بکر کی شہادت کے بعد خط۔

اگر رسول اللہ ﷺ کے بعد میرے چچا حمزہ اور میرے بھائی جعفر میرے ساتھ ہوتے تو میں مجبوراً بیعت نہ کرتا، لیکن میرے ساتھ دو تازہ مسلمان عباس اور عقیل تھے۔

سوال یہ ہے کہ مددگاروں کی تعداد میں یہ اختلاف کہاں سے آیا ہے؟

اس کے جواب میں، ہم کہتے ہیں: اگر ہم رسول خدا ﷺ کے عہد وپیمان کی شرائط پر توجہ دیں تو یہ سوال حل ہوجائے گا۔ جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے عہد وپیمان میں بیان ہوا ہے کہ اگر امیرالمؤمنین علیہ السلام کے مددگار ہوتے تو آپ پر قیام کرنا واجب تھا اور نہ اپنے خون کی حفاظت ضروری تھی۔ لہذا جناب امیر علیہ السلام کے ساتھیوں کی تعداد کا ایک اہم معیار قیام کی صورت میں آپ کے خون کا تحفظ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام کے پاس اتنے ساتھی ضرور ہوں کہ قیام کی صورت میں آپؑ کی جان محفوظ رہ سکے۔ ان مددگاروں اور جانثاروں کی اہم خصوصیت ان کی دو صفات ہیں: ایک طاقت و توانائی اور دوسری استقامت پائیداری تاکہ جنگ کے دوران وہ امام علیہ السلام کو تنہا اور دشمن کے رحم وکرم پر نہ چھوڑیں۔ یہی وجہ ہے کہ جناب امیر علیہ السلام مختلف لوگوں کے سامنے مختلف تعداد کا ذکر فرماتے ہیں۔[1] اس کا مطلب ہے کہ ہوسکتا ہے کہ جن کے دروازوں پر امیرالمؤمنین علیہ السلام رات کے وقت گئے تھے، اگر ان میں سے چالیس نے بھی اپنا وعدہ پورا کردیا ہوتا تو امام علیہ السلام اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے اپنا حق واپس لے لیتے یا اگر صرف حمزہؓ اور جعفرؓ ہی ہوتے تو پھر اس مہم کو سر کرنے کے لیے وہی کافی ہوتے اور امام علیہ السلام کی زندگی سلامت رہتی، کیونکہ ان کی

---

[1] جیسا کہ ابن ابی الحدید کے نقل کے مطابق جناب امیر علیہ السلام کے جانثاروں کی خصوصیت میں «ذوی العزم» کی صفت کا تذکرہ ملتا ہے اور تفسیر عیاشی کی نقل میں قرآن مجید کی اس آیت کی جانب اشارہ ہوا ہے: ﴿إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ﴾ اگر تم میں سے بیس آدمی بھی صابر ہوں تو دو سو پر غالب آجائیں گے۔ (سورۂ انفال ۸/۶۵)

جسمانی طاقت بھی زیادہ تھی اور ان کی استقامت و پائیداری کا بھی کسی سے موازنہ نہیں تھا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام علیہ السلام کی جان بچانے کے لیے کسی اور گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد کی ضروری تعداد تین سو تیرہ ہو۔

ایک اور نکتہ جو حضرت حمزہ اور جعفر کے بارے میں خاص طور پر اہم ہے وہ ان کی شخصیت ہے، جس کا پس منظر ان کا سابق الاسلام ہونا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ ثابت قدم رہنا تھا، جو کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کی فتح میں ایک عظیم نام اور ان کی حقانیت پر محکم دلیل ہو سکتے تھے۔ یوں ان کے رہتے ہوئے لوگ، امیر المؤمنین علیہ السلام کا مقابلہ کرنے سے گریز کرتے۔ یہ تفاوت پوری طرح سے جناب عباسؓ اور عقیل میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں بھی امیر المؤمنین علیہ السلام کی نسبت سے جناب حمزہ اور جعفر کی ہی طرح چچا اور بھائی ہی ہیں مگر ایں کجا و آں کجا۔ اس کے بارے میں ہم چوتھے باب میں مزید تفصیل کے سے گفتگو کریں گے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام کی جان کا تحفظ کیوں ضروری تھا؟

یہاں ایک اور سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ ایسی کونسی ضرورت تھی جس کی بنا پر امیر المؤمنین علیہ السلام کی جان کا بچنا ضروری تھا اور امیر المؤمنین علیہ السلام درجۂ شہادت پر فائز ہونے میں اتنی تاخیر کس لیے کر رہے تھے؟ کیا امیر المؤمنین علیہ السلام اپنی جان دے کر بھی دین کی حفاظت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں میں سب سے آگے نہیں ہیں؟ اور کیا وہ دینِ خدا کو مستحکم بنانے کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے سے گریز کر سکتے ہیں؟

اس سوال کے جواب کے لیے اس نکتے پر توجہ دینا ضروری ہے کہ خدا کے دین کو زندہ، مستحکم اور مضبوط رکھنے کے لیے ہمیشہ اور ہر وقت بس جہاد و شہادت اور جانفشانی کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکے میں تیرہ سال تک تکلیف اور مشکلات برداشت

کرتے ہیں لیکن جہاد کو بروئے کار نہیں لاتے جبکہ دوسری طرف مدینہ ہجرت کرتے ہی دین خدا اور اسلامی حکومت کے استحکام کے لیے جہاد کا حکم صادر فرماتے ہیں، ممکن ہے کہ دین کے تحفظ کا دار و مدار امام حسنؑ کی صلح پر ہو اور ایک ایسا بھی وقت آئے جب سید الشہداء کا خون اپنے نانا کا دین بچاتا نظر آئے، کہیں امام باقرؑ کا علمی مدرسہ دین کے فروغ کی شمعیں روشن کرتا دکھے اور کہیں قید خانے کی سختیاں اور ہارونی ظلم و ستم میں پستے رہنا دین اسلام کی بقا کا ضامن بن جائے۔

امیر المؤمنینؑ کے زمانے میں بھی ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ دین کی حفاظت اور اسلام کے تحفظ میں کون سا فعل مؤثر تھا؟ بغیر کسی تجزیے اور تبصرے کے ہمارا ماننا ہے کہ امیر المؤمنینؑ نے حکم نبوی کے مطابق جو کام بھی کیا، وہ یقینی طور پر خدا کی مرضی اور خدائی مصلحت کے مطابق تھا اور آپ نے وہی کیا جو خدا نے آپ سے چاہا تھا اور یقیناً ایسا کر کے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو آپ نے محفوظ کیا اور اس کی بقا کا سبب بنے لیکن اس معاملے کی وضاحت کے لیے، ہم اس کا مزید تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

سب سے پہلے ضروری ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک بیان کا حوالہ دیا جائے، جس میں امیر المؤمنینؑ کو وصیت فرماتے ہوئے وہ ارشاد فرماتے ہیں:

«اے میرے بھائی! تم میری طرح نہیں ہو۔ بے شک، خدا نے مجھے حق کو ظاہر کرنے کا حکم دیا اور خبر دی کہ وہ مجھے لوگوں کے شر سے بچائے گا اور اس نے مجھے جنگ کا حکم دیا چاہے میں تنہا ہی کیوں نہ رہوں ... لہٰذا میں مکے میں رکا رہا اور مجھے جنگ کی اجازت نہیں تھی۔ پھر اس کے بعد خدا نے مجھے جنگ کا حکم دیا کیونکہ دین اور اس کے قوانین، سنت و احکام، حدود اور حلال و حرام میرے بغیر پہچانے نہیں جا سکتے۔»

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ میرے بعد امت تمھاری مخالفت کرے گی اور تمھارے حق کا احترام نہیں کرے گی، امیرالمؤمنین علیہ السلام کے سامنے اپنے عہد و پیمان کو پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

«فَإِنِّي قَدْ أَظْهَرْتُ حُجَّتَكَ وَ قُمْتُ بِأَمْرِكَ فَإِنْ سَكَتَّ عَنْهُمْ لَمْ تَأْثَمْ وَإِنْ حَكَمْتَ وَ دَعَوْتَ لَمْ تَأْثَمْ غَيْرَ أَنِّي أُحِبُّ أَنْ تَدْعُوَهُمْ وَ إِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ وَلَمْ يَقْبَلُوا مِنْكَ.»

بیشک میں نے تمھاری حجت سب پر ظاہر کردی ہے اور تمھارے حق کو ثابت کردیا ہے، لہٰذا اب چاہے تم سکوت اختیار کرو یا پھر ان کی دعوت و ارشاد کے لیے کمربستہ ہوجاؤ بہرحال اس کا گناہ تمہارے سر پر نہیں ہے، اگرچہ میں چاہتا ہوں کہ تم انھیں خود اپنی طرف اور دین حق کی طرف دعوت دو چاہے وہ تمہاری بات نہ مانیں اور تمہیں قبول نہ کریں۔

« وَ يَتَظَاهَرُ عَلَيْكَ ظَلَمَةُ قُرَيْشٍ فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكَ إِنْ نَاهَضْتَ الْقَوْمَ وَ نَابَذْتَهُمْ وَ جَاهَدْتَهُمْ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُونَ مَعَكَ فِئَةٌ أَعْوَانٌ تَقْوَى بِهِمْ أَنْ يَقْتُلُوكَ فَيُطْفَأُ نُورُ اللَّهِ وَ لَا يُعْبَدَ اللَّهُ فِي الْأَرْضِ وَ التَّقِيَّةُ مِنْ دِينِ اللَّهِ وَ لَا دِينَ لِمَنْ لَا تَقِيَّةَ لَهُ.»

قریش کے ظالم تمہارے خلاف گٹھ جوڑ کرکے تم پر غلبہ پاجائیں گے، مجھے ڈر اس کا ہے کہ ان کی مخالفت کرتے ہوئے تم جب قیام اور جنگ کرو؛ ایسی حالت میں کہ تمھارے پاس ایسے مددگار نہ ہوں جن سے تمہیں تقویت مل سکے تو وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔ ایسی صورت میں خدا کا نور خاموشی کی نذر ہوجائے گا اور پھر زمین پر خدا کی عبادت نہیں ہوگی اور تقیہ خدا کے دین میں سے ہے اور جو کوئی بھی تقیہ اختیار نہ کرے اس کے پاس دین نہیں ہے۔

«... وَاعلَم أَنَّكَ إن لَم تَكُفَّ يَدَكَ وتَحقُنَ دَمَكَ إذاً لَم تَجِدْ أَعْوَاناً أَتَخَوَّفُ عَلَيْكَ أَنْ يَرجِعَ النَّاسُ إلى عِبَادَةِ الأَصْنَامِ وَالجُحُودِ بِأَنِّي رَسُولُ اللهِ فَاستَظهَرَ الحُجَّةَ عَلَيْهِمْ وادْعُهُم لِيَهلِكَ النَّاصِبُونَ لَكَ والبَاغُونَ عَلَيكَ ويَسْلَمَ العامَّةُ والخاصَّةُ.»[1]

.... اور جان لو کہ اگر مدد گار نہ ملنے پر تم پیچھے نہ ہٹے اور اپنے خون کی حفاظت نہ کی تو مجھے ڈر ہے کہ لوگ دوبارہ بتوں کی پوجا کی طرف پلٹ جائیں گے اور میری رسالت کا انکار کر بیٹھیں گے۔ تو ان پر حجت الٰہی کو تمام کرو اور ان کو حق کی طرف دعوت دو تاکہ تمھارے دشمن اور مخالف فنا ہوجائیں اور عام لوگ اور تمہارے خاص ساتھی سلامت رہیں۔

اس حکم میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امیر المومنین علیہ السلام کے ساتھ اپنے عہد کے شرائط کی وجہ اور اس کی وضاحت بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: میری رحلت کے بعد خدا کے دین کو تمھارے خون سے زیادہ تمھارے وجود اور تمھاری رہنمائی کی ضرورت ہے اور اگر تم معاشرے میں نہیں ہوئے اور تم نے خدا کے دین کی حمایت نہیں کی تو لوگ اسلام سے منہ موڑلیں گے اور وہ پھر سے بت پرستی اور زمانۂ جاہلیت کی طرف لوٹ جائیں گے۔ اے علی! اپنے خون کو محفوظ رکھنا اور دشمنوں کے ظلم وستم کے سامنے صبر سے کام لینا تاکہ جب بھی موقع ملے ان کے سامنے احتجاج پیش کرتے ہوئے اور خدا کے دین کو واضح وغالب کرتے ہوئے لوگوں کو ارتداد اور بت پرستی سے بچالے جاؤ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس بیان کی وضاحت کے لیے، کچھ نکات پر دھیان دینا ضروری ہے:

---

(1) کتاب سلیم/۳۰۴-۳۱۵، ح ۲۵، امیر المومنین علیہ السلام کا ابودرداء اور ابوہریرہ کے توسط سے معاویہ کے نام خط، اسی سے مشابہ مضمون: بحار الانوار ۹۰/۱۵۔

پہلا نکتہ: دین کے تحفظ کے اہم عوامل میں سے ایک کسی ایسے کا وجود ہے جو دین کے اصول و ضوابط اور احکام و قوانین سے اچھی طرح واقف ہو۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی اس کتاب کے ابتدائی اسباق میں بیان کر چکے ہیں کہ وہ واحد فرد کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے علوم نبوی کا حامل، آسمانی کتاب قرآن مجید اور دین کے احکام و تعلیمات کا وارث تھا، وہ امیر المؤمنین علیہ السلام کا ہی مقدس وجود تھا۔ لہذا، امیر المؤمنین علیہ السلام کا وجود اسلام کے تحفظ اور بقاء کا ایک ستون ہے۔

دوسرا نکتہ: اُس وقت کے لوگ تازہ مسلمان تھے جن کی اکثریت بنیادی طور پر فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئی تھی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ان کا بہت کم آنا جانا ہوا تھا اور پھر ایسے لوگ بھی کہ جو بہت پہلے سے اور لمبے عرصے سے مسلمان تھے، ان میں سے بھی کچھ یا تو ایسے تھے جو علی الاعلان اور واضح طور پر امیر المؤمنین علیہ السلام کے دشمنوں میں تھے یا پھر دین کے بارے میں ابتدائی اور سطحی فکر رکھنے والے اور بصیرت نہ ہونے کی وجہ سے حیرانی اور کشمکش کا شکار ہو کر غاصبوں اور ظالموں کی صف میں جا کھڑے ہوئے تھے۔ بہت کم اور انگشت شمار لوگ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان پر مضبوط طریقے سے ڈٹے ہوئے تھے جو آپ نے اللہ کی جانب سے لوگوں تک پہنچایا تھا۔ اس بنا پر امیر المؤمنین علیہ السلام کے شہید کر دیے جانے سے، جو یقینی طور پر اہل بیت علیہم السلام اور آپ کے خاص ساتھیوں کے بھی مارے جانے اور ان کی بھی شہادت کا سبب بنتا[1]، دین کے حصول کا صحیح ذریعہ اور اس کا منبع و ماخذ نہیں بچتا اور لوگ وحی کے منبع سے مکمل طور پر منقطع ہو جاتے۔ یہ سب کچھ ایسے عالم میں ہو تا کہ اسلام نے ابھی تک نو مسلموں کے دلوں میں جڑ نہیں پکڑی تھی اور ان میں زمانہ جاہلیت

---

[1] نہج البلاغہ/ خطبہ ۲۶ اور ۲۱۷، کتاب سلیم/۲۱۵، ح ۱۲۔

کے رسم و رواج ابھی بھی باقی تھے۔ معاشرے کے غاصب رہنماؤں اور علوی حق کے غاصبوں کی جہالت بھی اس سلسلے میں حائل تھی کہ عوام اپنے حکمرانوں سے دین کی تعلیمات لے سکیں۔[1]

چنانچہ دین اسلام کا تحفظ وہ وجہ تھی جس نے اس تحریک کو روک دیا اور امیرالمؤمنین علیہ السلام نے جبری بیعت قبول کرلی۔ اگلے سبق میں ہم اس بحث کے دوسرے پہلوؤں کا جائزہ لیں گے۔

---

[1] اسلام کے صحیح احکام و تعالیم کی ترویج میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کی زحمتوں اور طرزِ عمل کا مشاہدہ ہم نے تیسرے سبق میں کیا۔

سبق ۱۵

تحریک پر لگام اور اس کی حکمتیں-۴

پچھلے سبق میں ہم نے اس نکتے کی نشاندہی کی کہ حضرت امیر علیہ السلام کو جب اپنے اکیلے پن اور لوگوں کی بے وفائی کا سامنا ہوا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے بموجب انھوں نے اپنی جان کی حفاظت کے لیے، اپنے الٰہی حق کے غاصبوں کے خلاف قیام سے گریز کیا اور صبر کا تلخ گھونٹ پی گئے۔ ہم نے یہ بھی ذکر کیا کہ امام علیہ السلام نے اپنی، اپنے خاندان والوں اور ساتھیوں کی جان بچائی تاکہ وہ خدا کے دین کو تباہی کے خطرے سے بچا سکیں کیونکہ دین کو محفوظ رکھنے کے سب سے اہم عوامل میں دین کے علمبرداروں اور دین کے احکام و شریعت کے جاننے والوں کا باقی رہنا ہے اور اس وقت یہ امر امیر المومنین علیہ السلام کے مقدس وجود تک محدود تھا۔ اس سبق میں ہم دین کے تحفظ میں امام علیہ السلام کی خاموشی کے کردار کا مزید جائزہ لیں گے۔

اسلام کے نام کو بچانا دین کی حفاظت کا ایک اور سبب

ایک اور اہم عنصر، جو اس وقت دین کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھا، اسلام کا نام اور لوگوں کا اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا تھا۔ بنیادی طور پر لوگوں کو اسی وقت مذہب کی حقیقی تعلیمات کی طرف لے جایا جاسکتا ہے اور انھیں اور دین کے احکامات کا پابند بنایا جاسکتا ہے جب وہ باضابطہ طور پر اسلام کو تسلیم کریں اور خود کو مسلمان سمجھیں ورنہ وہ شخص کہ جو اسلام کو خدا کے دین کے طور پر قبول ہی نہ کرتا ہو، اسے دین کے احکامات و تعلیمات کا پابند بنانا عبث ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت کے جزیرہ نمائے عرب میں دین کے احکام و معارف کو بیان کرنے کے ساتھ ہی اسلام کا نام بھی باضابطہ طور پر مستحکم کیا اور معاشرے سے شرک و بت پرستی کی جہالت کو دور کیا۔ مسلمانوں کے شدید دشمنوں نے، جنھوں نے شروع سے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے مقابل جنگ کی، بالآخر فتح مکہ کے بعد اپنی کھلی مخالفت ترک کر دی اور اسلام اور اس کی حکمرانی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور پورا جزیرۃ العرب اسلام کے نام پر مجتمع ہوگیا۔

البتہ یہ ایک نیا اور نوتشکیل معاشرہ تھا، اسلام ابھی تک لوگوں کی روحوں میں نہیں اترا تھا اور لوگوں کی مذہبیت و دینداری قبائلی سرداروں کے اسلام قبول کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کے امن معاہدے کی وجہ سے زیادہ تھی اور ابھی تک ان کے وجود سے جاہلیت اور کفر و بت پرستی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔ ایسے حالات میں اسلام کے نام کی حفاظت بہت ضروری تھی۔

ایسے حالات میں اسی وقت لوگوں کو آہستہ آہستہ دین کے احکام و تعلیمات سے واقف کیا جاسکتا تھا کہ جب وہ اسلام کے چاہنے والے اور اس کے پیروکار بن جاتے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے۔ لہٰذا اگر معاشرے پر اقتدار کے لیے جدوجہد کا نتیجہ یہ ہو کہ لوگ اس نئے دین کو چھوڑ کر پھر سے اپنے باپ دادا کے مذہب کی طرف لوٹ جائیں، تو پھر اصل مقصد اور ہدف ہی ختم ہو کر رہ جائے گا۔

اس سوچ کے ساتھ جب امیرالمؤمنین علیہ السلام نے اسلام کے سابق حامیوں کی طرف سے مدد نہ ملنے کا مشاہدہ کیا تواقتدار کے حصول کو اسلام کے مفادات کے منافی سمجھا اور اسی لیے مسند حکومت کے غاصبوں سے جنگ سے گریز کیا:

«ایک دفعہ حضرت فاطمہ علیہا السلام نے امیرالمؤمنین علیہ السلام سے خلافت پر غاصبانہ قبضہ کرنے والوں کے خلاف کارروائی کرنے کو کہا۔ تبھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی گواہی دیتے ہوئے مؤذن کی آواز گلدستہ اذان سے بلند ہوئی۔ امیرالمؤمنین علیہ السلام نے فرمایا:

«أَتُحِبِّينَ أَنْ تَزُولَ هَذِهِ الدَّعْوَةُ مِنَ الدُّنْيَا؟ قَالَتْ: لَا. قَالَ: هُوَ مَا أَقُولُ لَكِ.»

کیا آپ چاہتی ہیں کہ یہ پکار دنیا سے ختم ہو جائے؟ حضرت زہرا نے جواب دیا: نہیں۔ امیرالمؤمنین نے فرمایا: پھر فریضہ وہی ہے جو میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔[1]

ایک اور مقام پر امیرالمؤمنین سے روایت ہے:

«إِنَّ اللهَ لَمَّا قَبَضَ نَبِيَّهُ اسْتَأْثَرَتْ عَلَيْنَا قُرَيْشٌ بِالْأَمْرِ وَدَفَعَتْنَا عَنْ حَقٍّ نَحْنُ أَحَقُّ بِهِ مِنَ النَّاسِ كَافَّةً. فَرَأَيْتُ أَنَّ الصَّبْرَ عَلَى ذٰلِكَ أَفْضَلُ مِنْ تَفْرِيقِ كَلِمَةِ الْمُسْلِمِينَ وَسَفْكِ دِمَائِهِمْ، وَالنَّاسُ حَدِيثُو عَهْدٍ بِالْإِسْلَامِ. وَالدِّينُ يُمْخَضُ مَخْضَ الْوَطْبِ يُفْسِدُهُ أَدْنَى وَهْنٍ. وَيَعْكِسُهُ أَقَلُّ خُلْفٍ.»[2]

---

(۱) شرح ابن ابی الحدید ۳۲۶/۲۰، حکمت نمبر ۵۳۷ کے ذیل میں۔

(۲) شرح ابن ابی الحدید ۳۰۸/۱، بحار الانوار ۶۲/۳۲، کلبی سے منقول، اسی سے مشابہ مضمون: شرح ابن ابی الحدید ۳۰۷/۱، بحار الانوار ۶۱/۳۲، مدائنی اور کافی سے منقول ۲۹۵/۸، ح ۴۵۳، امالی، مفید/۱۵۵، المجلس التاسع عشر، ح ۶ اور ارشاد، مفید ۲۴۶/۱، فصل و من کلامه عند نکث طلحہ۔۔۔ علل الشرائع ۱۸۰/۱، باب ۱۴۲، ح ۱۰، کتاب سلیم/۴۳۸، ح ۶۷، بحار الانوار ۵۷۹/۲۹، گزشتہ حوالہ ۶۳۵/۲۹، کتاب طرائف سے منقول، سید بن

جس وقت پیغمبر اسلام ﷺ اپنے رب سے جا ملے، قریش نے حکومت کو ہم سے چھین لیا اور ہمیں اس حق سے محروم کر دیا جس کے ہم، دوسرے تمام لوگوں کی نسبت زیادہ حقدار تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس معاملے میں صبر سے کام لینا بہتر ہے اس چیز کے مقابلے میں کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہو جائے اور ان کا خون بہایا جائے جبکہ لوگ ابھی جلد ہی مسلمان ہوئے تھے اور دین، دودھ سے بھرے اس برتن کی طرح تھا جسے مکھن نکالنے کے لیے ہلایا جا رہا ہو اور وہ اضطراب اور تزلزل کی اس حالت میں تھا کہ ذرا سی بھی چوک اسے ختم اور معمولی سی بھی غلطی برباد کرنے کے لیے کافی ہو۔

لہٰذا امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے الٰہی حق کے غصب کے باوجود خاموشی اختیار کی، مسلم معاشرے میں جنگ کی شروعات سے پرہیز کیا اور صبر و تحمل سے کام لیا۔ جہاں ضروری ہوتا تھا، وہ معاشرے کے معاملات میں حصہ لیتے ہوئے دین کی مدد کرتے اور غاصبانِ حکومت کے ساتھ رہتے ہوئے دین اسلام کے حقیقی معارف و احکام کی ترویج و حفاظت کرتے:

«فَأَمْسَكْتُ يَدِي حَتَّى رَأَيْتُ رَاجِعَةَ النَّاسِ قَدْ رَجَعَتْ عَنِ الْإِسْلَامِ، يَدْعُونَ إِلَى مَحْقِ دِيْنِ مُحَمَّدٍ فَخَشِيتُ إِنْ لَمْ أَنْصُرِ الْإِسْلَامَ وَأَهْلَهُ أَنْ أَرَى فِيهِ ثَلْمًا أَوْ هَدْمًا، تَكُونُ الْمُصِيبَةُ بِهِ عَلَيَّ أَعْظَمَ مِنْ فَوْتِ وِلَايَتِكُمُ الَّتِي إِنَّمَا هِيَ مَتَاعُ أَيَّامٍ قَلَائِلَ، يَزُولُ مِنْهَا مَا كَانَ كَمَا يَزُولُ السَّرَابُ، أَوْ كَمَا يَتَقَشَّعُ السَّحَابُ،

طاؤس، گزشتہ حوالہ کتاب مناقب سے منقول، ابن شہر آشوب، گزشتہ حوالہ ۲۹/۳۴۰، گزشتہ حوالہ ۳۲/۱۱۱، گزشتہ حوالہ ۳۸/۱۷۴، نہج السعادہ فی مستدرک نہج البلاغہ، محمودی ۱/۲۴۸، خ ۷۵۔

فَنَهَضْتُ فِيْ تِلْكَ الْأَحْدَاثِ، حَتّٰى زَاحَ الْبَاطِلُ وَ زَهَقَ، وَ اطْمَأَنَّ الدِّيْنُ وَ تَنَهْنَهَ.»[1]

ان حالات میں، میں نے اپنا ہاتھ روکے رکھا۔ یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ اسلام سے مرتد ہوجانے والے کچھ لوگ محمد ﷺ کے دین کو مٹاڈالنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ تو مجھے خوف محسوس ہوا کہ اگر میں اسلام اور اہل اسلام کی مدد نہ کروں تو ایسا رخنہ یا تباہی پیدا ہوجائے گی جس کی مصیبت میرے لیے تمہاری یہ حکومت ہاتھ سے نکل جانے سے بڑی ہوگی جو کچھ ہی دنوں کا اثاثہ ہے، اس کی ہر چیز سراب کی طرح زائل ہوجائے گی یا بادل کی طرح چھٹ جائے گی۔ چنانچہ میں ان بدعتوں کے ہجوم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یہاں تک کہ باطل دب کر فنا ہوگیا اور دین محفوظ ہو کر تباہی سے بچ گیا۔

لوگوں میں کفر کا چلن

امیر المؤمنین علیہ السلام کے بیانوں میں ایک اور نکتہ موجود ہے جس میں غاصبوں کے خلاف امام علیہ السلام کے قیام نہ کرنے کی ایک اور وجہ بتائی گئی ہے۔ اس طرح کے بیانوں میں امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں: اگر میں اس وقت کے حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا تو لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے: ایک بہت ہی کم تعداد، جو میرے ساتھ آتی اور میری مدد کرتی (جیساکہ ہم نے کہا، ان کی جانوں

---

[1] نہج البلاغہ/خط نمبر ۶۲، سید رضی نے اس خط کو اہل شام سے مربوط بیان کیا ہے جسے آپ نے مالک اشتر کے توسط سے ارسال فرمایا تھا لیکن اسی سے مشابہ مضمون بحار الانوار ۳۰/۱۰-۱۱، میں محمد بن ابی بکر کی شہادت کے بعد خط میں آیا ہے۔

کو خطرہ لاحق ہو جاتا) دوسرا وہ گروہ، جو میرے مقابل آتا اور میرے ساتھ جنگ کرتا۔ یہ گروہ حجت خدا سے علی الاعلان جنگ کے نتیجے میں کافر و مرتد ہو جاتا۔

چنانچہ امام علیہ السلام اپنی خاموشی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«... لِأَنِّي لَوْ نَصَبْتُ نَفْسِي فَدَعَوْتُهُمْ إِلَى نُصْرَتِي كَانُوا مِنِّي وَ فِي أَمْرِي عَلَى إِحْدَى مَنْزِلَتَيْنِ إِمَّا مُتَّبِعٌ مُقَاتِلٌ أَوْ مَقْتُولٌ إِنْ لَمْ يَتَّبِعِ الْجَمِيعَ وَ إِمَّا خَاذِلٌ يَكْفُرُ بِخِذْلَانِهِ إِنْ قَصَّرَ عَنْ نُصْرَتِي أَوْ أَمْسَكَ عَنْ طَاعَتِي.»[1]

... اگر میں اٹھ کھڑا ہوتا اور لوگوں کو اپنی مدد کے لیے پکارتا تو ان کے سامنے میرے اور میرے مشن کے متعلق دو صورتیں ہوتیں: پہلی، یا تو وہ میری پیروی کرنے والے ہوتے اور جنگ کرکے کامیاب ہو جاتے یا پھر اکثریت کی پیروی نہ کرنے کے سبب مارے جاتے۔ دوسری، میری مدد نہ کرتے ہوئے وہ مجھے ذلیل کرتے جس کی وجہ سے کافر ہو جاتے؛ اگر میری مدد کرنے میں کوتاہی برتتے اور میری اطاعت سے منھ موڑتے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد و پیمان کو فراموش نہ کیا جائے

اگرچہ اس سبق میں امیر المؤمنین علیہ السلام کی خاموشی کی حکمت کو ان کے ایک دوسرے بیان کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس سلسلے میں سب سے اہم وجہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم اور آنحضرت کا وہ عہد تھا، جس کے مطابق امیر المؤمنین علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ

---

[1] بحار الانوار ۳۸/۱۷۶، خصال ۲/۳۷۴، باب السبعہ، ح ۵۸، اسی سے مشابہ: کافی ۸/۲۹۶، ح ۴۵۴، علل الشرائع ۱/۱۸۰، باب ۱۴۲، ح ۸ اور ۱۰، بحار الانوار ۲۹/۴۳۰، ح ۱۳ اور ح ۳۲۔

مددگاروں کے نہ ہونے کی صورت میں اپنے خون کی حفاظت کریں اور سکوت اختیار کریں۔ لہٰذا یہ بات ذہن میں نہیں آنی چاہیے کہ اگر امام علیہ السلام کی خاموشی کی وجہ عدم تصادم اور خونریزی سے پرہیز ہے تو پھر امام علیہ السلام کو مددگاروں کی موجودگی میں بھی قیام نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں بھی لوگ دو حصوں میں تقسیم ہوجاتے اور آپؑ کے مخالفین کافر اور مرتد ہوجاتے۔ اس کی وجہ درج ذیل ہے:

اولاً: جیساکہ بیان کیا گیا، امام علیہ السلام کی خاموشی کی بنیادی وجہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا گیا وعدہ اور عہد و پیمان تھا اور جن دوسری وجوہات کا ذکر کیا گیا یا بعد کے اسباق میں جن کا ذکر آئے گا، وہ امیرالمؤمنین علیہ السلام کے طرز عمل کے ساتھ سامنے آنے والے نتائج ہیں۔ یعنی امام علیہ السلام نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر اپنی خاموشی سے دین کو تباہ و برباد ہونے سے بچانے کے ساتھ ہی لوگوں کو بھی کفر و ارتداد کے کنوئیں میں گرنے سے بچالیا۔

ثانیاً: جیساکہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا، زیادہ تر نومسلم، امیرالمؤمنین علیہ السلام کے کارناموں سے واقف نہیں تھے اور اگر امام علیہ السلام بغیر مددگاروں کے غاصبوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تو آپ کے قیام کو دینی و مذہبی اقدام نہیں سمجھا جاتا لیکن اگر سابق الاسلام افراد، اہل بدر، مہاجرین اور انصار، جن سے آپؑ نے مدد مانگی تھی، وہ آپؑ کے ساتھ ہوجاتے اور ظالموں و غاصبوں کے خلاف لڑتے تو پھر دوسرے افراد بھی آپؑ کے اقدام کو اسلامی مقاصد کے تحت شروع ہونے والی ایک دینی و مذہبی تحریک سمجھتے اور امکان قوی تھا کہ ان پر تمام معاملات روشن و واضح ہوجاتے اور وہ کفر و ارتداد کے کنوئیں میں گرنے سے بچے رہتے۔

یہی وجہ تھی کہ امام نے نومسلموں سے مدد کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ ابتدائی دور کے مسلمانوں اور سابقین اسلام سے، جنھیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محضر مبارک میں حاضری کا شرف حاصل تھا اور جو امیرالمؤمنین علیہ السلام کے کارناموں اور آپؑ کے مقام و مرتبے سے کماحقہ واقف و آگاہ تھے، مدد کی

در خواست کی۔ پھر جب امیر المومنین علیہ السلام کو ان سے بے وفائی ملی تو آپ نے اپنا ہاتھ روک لیا اور اپنی تحریک پر لگام لگا دی کیونکہ جب ایسے لوگوں نے مدد سے انکار کر دیا اور ساتھ دینے سے مکر گئے جو کہ سابقین الاوّلین تھے پھر تو ان لوگوں کی بات ہی الگ تھی جو ابھی ابھی مسلمان ہوئے تھے اور نہ ہی امیر المومنین علیہ السلام کو کما حقہ جانتے پہچانتے تھے۔ وہ حکومت سے آپ کی مخالفت کو ذاتی اور قبائلی دعویٰ سمجھتے تھے۔

اس وجہ سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان میں، جسے آپ نے خود امیر المومنین علیہ السلام کے سامنے بیان کیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام کا الٰہی حق چھینے جانے اور اس پر ناجائز قبضہ جمانے پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کو صبر و تحمل سے کام لینے کا حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں: تم اپنی جان کی حفاظت کرنا تاکہ حق کا اظہار اور حقیقت کے بیان سے غاصبوں اور ظالموں کے کفر کو برملا کر سکو اور عوام الناس اور اپنے سچے ساتھیوں کی جان بچا سکو۔

سبق ۱۶

تحریک پر لگام اور اس کی حکمتیں-۵

پچھلے سبق میں ہم نے امیر المؤمنین علیہ السلام کے طرز عمل کے دوسرے پہلوؤں کا جائزہ لیا اور خود آپ کے اپنے الفاظ کے حوالے سے واضح کیا کہ امیر المؤمنین علیہ السلام نے حکومتِ وقت سے راضی ہونے کی بنیاد پر نہیں بلکہ اسلام کے نام اور اسلامی معاشرے کی حفاظت کی خاطر خود پر اور اپنے اہل بیت پر پڑنے والے مصائب و مشکلات پر صبر و تحمل سے کام لیا کہ کہیں اسلامی معاشرہ لادینیت اور کفر و شرک کا شکار نہ ہو جائے۔ انھوں نے ظالموں کے خلاف کاروائی سے گریز کرتے ہوئے مسلمانوں کو پوری طرح سے تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا تاکہ اسلام کے نام پر اپنی جد و جہد اور اپنی اولاد کی قربانیوں اور جانفشانیوں کے ذریعے مؤمن افراد کی تربیت اور دین کی اصل تعلیمات کی ترویج کریں اور اس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کو پورا کریں۔ آنے والی بحث میں ہم امیر المؤمنین علیہ السلام کے کچھ دوسرے بیانات کو پیش کرتے ہوئے آپ کی خاموشی اور سکوت پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی سیرت پر عمل

اپنے الٰہی حق پر دوسروں کے غاصبانہ قبضے کے ردِ عمل میں اپنے طرز عمل کے بارے میں امیر المؤمنین علیہ السلام نے جو باتیں بیان کی ہیں، ان میں سے ایک اپنی امتوں کے سلسلے میں گزشتہ انبیاء علیہم السلام کا رویہ ہے۔ اس طرح کے بیانات میں امیر المؤمنین علیہ السلام اس نکتے کو واضح فرماتے ہیں کہ ان کا ولایتِ الٰہی کے غصب کیے جانے کے مقابل میں جو ردِ عمل سامنے آرہا ہے وہ کوئی نیا اور تازہ معاملہ نہیں ہے بلکہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام نے بھی تبلیغِ توحید اور یکتا پرستی کی دعوت کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات پر ایسا ہی طرزِ عمل اپنایا تھا۔ اسی لیے جس طرح انبیاء علیہم السلام کا وہ عمل بت پرستی سے راضی ہونے یا توحید کی تبلیغ و دعوت کی عدمِ حقانیت کی دلیل نہیں ہے، اسی طرح آپ کا طرزِ عمل بھی خلافتِ الٰہی کے غصب کیے جانے کے مقابلے میں کسی بھی طرح سے غاصبوں کے کاموں پر مہرِ تائید ثبت نہیں کرتا اور نہ ہی امیر المؤمنین علیہ السلام کی حقانیت پر سوالیہ نشان لگاتا ہے۔

منقول ہے کہ جنگِ نہروان کے بعد کسی جگہ امیر المؤمنین علیہ السلام سے سوال کیا گیا: ایسا کیوں ہے کہ جس طرح سے طلحہ و زبیر اور معاویہ سے آپ نے جنگ کی، اس طرح سے ابوبکر و عمر سے نہیں کی؟ امیر المؤمنین علیہ السلام نے سب سے پہلے فرمایا: میں ہمیشہ مظلوم رہا ہوں، میرا حق مجھ سے چھین لیا گیا اور میں اپنے حقوق پر دوسروں کے تجاوز کو دیکھتا رہا۔ پھر جب اشعث بن قیس نے پہلے سوال پر زور دیتے ہوئے اس کا جواب چاہا تو جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا:

«إِنَّ لِي أُسْوَةً بِسِتَّةٍ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ أَوَّلُهُمْ نُوحٌ حَيْثُ قَالَ: ﴿رَبِّ إِنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ﴾[1] فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: إِنَّهُ قَالَ هَذَا لِغَيْرِ خَوْفٍ فَقَدْ كَفَرَ وَإِلَّا فَالْوَصِيُّ أَعْذَرُ.

---

(۱) قمر (۵۴)/۱۰۔

میرے لیے انبیائے گزشتہ میں سے چھے، نمونہ عمل ہیں اور میں نے ان کی پیروی کی ہے: **اول:** حضرت نوحؑ ہیں، جیسا کہ انھوں نے کہا ہے: "پروردگارا! میں مغلوب ہوگیا ہوں، تو میری مدد کر۔" اس مقام پر اگر کوئی کہتا ہے کہ انھوں نے خوف کی وجہ سے یہ بات نہیں کہی تھی تو وہ کافر[1] ہوگیا ورنہ ایسے خوف کے مرحلے میں انبیاء سے زیادہ ان کے اوصیاء کے لیے یہ عذر قابل توجہ ہے۔

وَ ثَانِيهِمْ لُوطٌ حَيْثُ قَالَ: ﴿لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِي إِلَى رُكْنٍ شَدِيدٍ﴾[2] فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: إِنَّهُ قَالَ هٰذَا لِغَيْرِ خَوْفٍ فَقَدْ كَفَرَ وَ إِلَّا فَالْوَصِيُّ أَعْذَرُ.»

دوم: جناب لوطؑ ہیں، جیسا کہ انھوں نے کہا ہے: "اے کاش! میرے پاس اتنی طاقت ہوتی کہ تمھیں سیدھا کر دیتا، یا کوئی مضبوط سہارا ہی ہوتا کہ اس کی پناہ لیتا" اگر کوئی کلام خدا کے مقابل حضرت لوطؑ کے ان کی قوم سے خوف و اضطراب کا انکار کرے تو وہ کافر ہے اور اوصیائے انبیاء اس میں زیادہ معذور ہیں۔

« وَ ثَالِثُهُمْ إِبْرَاهِيمُ خَلِيلُ اللّٰهِ حَيْثُ قَالَ: ﴿وَ أَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ﴾[3] فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: إِنَّهُ قَالَ هٰذَا لِغَيْرِ خَوْفٍ فَقَدْ كَفَرَ وَ إِلَّا فَالْوَصِيُّ أَعْذَرُ.

سوم: ابراہیمؑ خلیل اللہ ہیں، جیسا کہ انھوں نے کہا ہے: "اور میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور اُن ہستیوں کو بھی جنھیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے

---

[1] توجہ رہے کہ اس مقام پر کفر لازمی طور پر بے ایمان ہونے کے ہی معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت کو چھپانے کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔

۲ ھود (۱۱)/۸۰۔

۳ مریم (۱۹)/۴۸۔

ہیں۔ "جناب ابراہیمؑ کا اپنی دعوت ترک کردینا خوف کے سبب تھا، تو اگر کوئی ان کے خوف کا منکر ہو تو وہ کلام خدا کی صریحاً خلاف ورزی کرکے کافر ہوجائے گا ورنہ وصیؑ پیغمبر کا عذر تو زیادہ قابل قبول ہے۔

وَ رَابِعُهُمْ مُوسَىٰ حَيْثُ قَالَ: ﴿فَفَرَرْتُ مِنكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ﴾[1] فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ إِنَّهُ قَالَ هَذَا لِغَيْرِ خَوْفٍ فَقَدْ كَفَرَ وَ إِلَّا فَالْوَصِيُّ أَعْذَرُ.»

چہارم: حضرت موسیٰؑ ہیں، جیسا کہ انھوں نے کہا ہے: "پھر میں تمہارے خوف سے فرار ہو گیا۔" اگر کوئی جناب موسیٰ کے خوف کا منکر ہو تو وہ کافر ہو گیا ہے ورنہ وصی کا عذر تو زیادہ قابل قبول ہے۔

«وَ خَامِسُهُمْ أَخُوهُ هَارُونُ حَيْثُ قَالَ: ﴿يَا ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَ كَادُوا يَقْتُلُونَنِي﴾[2] فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ إِنَّهُ قَالَ هَذَا لِغَيْرِ خَوْفٍ فَقَدْ كَفَرَ وَ إِلَّا فَالْوَصِيُّ أَعْذَرُ.

پنجم: ان کے بھائی جناب ہارونؑ ہیں، جیسا کہ انھوں نے کہا ہے: "اے میرے بھائی! قوم نے مجھے ضعیف و عاجز کر دیا اور نزدیک تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیتی۔" تو اگر کوئی یہ کہے کہ انھوں نے خوف کے علاوہ کسی وجہ سے یہ بات کہی ہے تو وہ کافر ہے ورنہ وصی تو اس لحاظ سے زیادہ معذور ہے۔

---

[1] شعراء (۲۶)/۲۱۔
[2] اعراف (۷)/۱۵۰۔

وَ سَادِسُهُمْ أَخِي مُحَمَّدٌ خَيْرُ الْبَشَرِ حَيْثُ ذَهَبَ إِلَى الْغَارِ وَ نَوَّمَنِي عَلَى فِرَاشِهِ فَإِنْ قَالَ قَائِلٌ: إِنَّهُ ذَهَبَ إِلَى الْغَارِ لِغَيْرِ خَوْفٍ فَقَدْ كَفَرَ وَ إِلَّا فَالْوَصِيُّ أَعْذَرُ.»(۱)

ششم: میرے بھائی خیر البشر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جب وہ غار میں چلے گئے اور مجھے اپنے بستر پر سلا دیا تو اگر کوئی کہے کہ وہ خوف سے غار میں نہیں چھپے تھے تو وہ یقیناً کافر ہے ورنہ ان کے وصی کی بات زیادہ قابل قبول ہے؟

(اس وقت سبھی نے ان کی بات کی حقانیت کو تسلیم کیا اور اپنے کیے پر توبہ کی۔)

جی ہاں، حضرت نوحؑ نے سیکڑوں برس تک اپنی قوم کو وحدانیت کی دعوت دی اور اس کے بعد خدا کی بارگاہ میں دستِ دعا اٹھایا اور اس سے عذاب کی درخواست کی، جب جناب لوطؑ نے اپنے آپ کو بے بس و بے یار و مددگار دیکھا تو آپ نے لوگوں سے جنگ اور مقابلے کو ترک کرتے ہوئے خدا کی پناہ مانگی۔ ابراہیم خلیلؑ نے یہ دیکھ کر اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کر لی کہ قوم ہدایت پانے والی نہیں ہے اور حضرت موسیٰؑ نے اگرچہ ایک قبطی کو قتل کیا لیکن اس کے بعد مصر سے فرار ہو گئے اور اس طرح اپنی جان بچائی۔ اس صورت حال میں امیر المومنین علیہ السلام کی حالت تو سب سے جدا نظر آتی ہے کیونکہ آپ ہی تمام جنگوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فوج کے سپہ سالار اور مرد میدان تھے اور آپ کی دشمنی کی آگ جنگِ بدر، احد، خیبر، حنین اور دیگر جنگوں میں آپ کے ہاتھوں تہہ تیغ ہونے والوں سے تعلق رکھنے والے مشرکوں کے دلوں میں دہک رہی تھی:

امیر المومنین علیہ السلام حضرت ہارونؑ سے اپنی شباہت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

(۱) احتجاج ۱/۱۸۹، باب احتجاجات امیر المومنین علیہ السلام اور اسی سے مشابہ: علل الشرائع ۱/۱۴۸، باب ۱۲۲، ح ۷، بحار الانوار ۲۹/۴۳۸، گزشتہ حوالہ ۲۹/۴۴۲، علی بن میثم تمار سے منقول، گزشتہ حوالہ ۲۹/۴۴۳، مناقب شہر آشوب سے منقول، احتجاج ۲/۲۸۹، باب احتجاج الحسن علی من انکر علیہ الصلح۔

وأَخبَرَنِي صلَّ الله عليه وآلِه أَنَّ الأُمَّةَ سَتَخذُلُنِي وَتُبَايِعُ غَيْرِي وتَتَّبِعُ غَيْرِي وَأَخبَرَنِي صلى الله عليه وآله أَنِّي مِنهُ بِمَنزِلَةِ هَارُونَ مِن مُوسىٰ إِذ قَالَ لَهُ مُوسَى: ﴿قَالَ يَا هَارُونُ مَا مَنَعَكَ إِذ رَأَيتَهُم ضَلُّوا ۞ أَلَّا تَتَّبِعَنِ أَفَعَصَيتَ أَمرِي﴾[1] ﴿قَالَ يَابنَ أُمَّ إِنَّ القَومَ استَضعَفُونِي وَكَادُوا يَقتُلُونَنِي﴾[2] وَقَالَ: ﴿يَا ابنَ أُمَّ لَا تَأخُذ بِلِحيَتِي وَلَا بِرَأسِي ۞ إِنِّي خَشِيتُ أَن تَقُولَ فَرَّقتَ بَينَ بَنِي إِسرَائِيلَ وَلَم تَرقُب قَولِي﴾[3]

رسول اللہ ﷺ نے مجھے پہلے ہی خبر دے دی تھی کہ عنقریب ہی امت میرے ساتھ دغا کرے گی اور مجھے چھوڑ کر دوسرے آدمی کی بیعت کر لے گی۔ انھوں نے مجھ سے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان سے میری نسبت وہی ہے جو موسیٰ سے ہارون کی تھی جب موسیٰ نے ان سے کہا تھا: (موسیٰ نے) کہا: اے ہارونؑ، جب تم نے دیکھا تھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا کہ میرے طریقے پر عمل نہ کرو؟ کیا تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی؟ "ہارون نے کہا: "اے میری ماں کے بیٹے، اِن لوگوں نے مجھے دبا لیا اور قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے۔" اسی طرح انھوں نے کہا: "اے میری ماں کے بیٹے، میری داڑھی نہ پکڑیے، نہ میرے سر کے بال کھینچیے، مجھے اِس بات کا ڈر تھا کہ آپ آ کر کہیں گے تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا"

---

[1] طٰہٰ (۲۰)/۹۲-۹۳۔

[2] اعراف (۷)/۱۵۰۔

[3] طٰہٰ (۲۰)/۹۴۔

«وإِنَّمَا يَعْنِي: أَنَّ مُوسَى أَمَرَ هَارُونَ حِينَ اِسْتَخْلَفَهُ عَلَيْهِمِ إِنْ ضَلُّوا فَوَجَدَ أَعْوَاناً أَنْ يُجاهِدَهُمْ وَإِنْ لَمْ يَجِدْ أعواناً أن يَكُفَّ يَدَهُ وَيَحْقِنَ دَمَهُ وَلا يُفَرِّقَ بَيْنَهُمْ.»

اس سے مراد وہ واقعہ ہے جب حضرت موسیٰ نے جناب ہارون کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا تو انھیں حکم دیا کہ اگر یہ لوگ گمراہ ہوجائیں اور تمھیں مددگار مل جائیں تو ان سے جہاد کرنا اور اگر مددگار نہ ملیں تو ہاتھ روک لینا اور اپنے خون کی حفاظت کرنا اور ان میں تفرقے کا سبب نہ بننا۔

«وإِنِّي خَشِيتُ أَنْ يَقُولَ لِي ذَلِكَ أَخِي رَسُولُ اَللَّهِ صلى الله عليه وآله: لِمَ فَرَّقْتَ بَيْنَ الأُمَّةِ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي وقَدْ عَهِدْتُ إِلَيْكَ إِنْ لَمْ تَجِدْ أَعْوَاناً أَنْ تَكُفَّ يَدَكَ وتَحْقِنَ دَمَكَ ودَمَ أَهْلِ بَيْتِكَ وشِيعَتِكَ.»[1]

مجھے بھی یہ تشویش تھی کہ یہی بات میرے بھائی رسول اللہ ﷺ نہ فرمائیں کہ تم نے میری امت میں تفرقہ کیوں ڈال دیا اور میری بات کا پاس نہ رکھا حالانکہ میں نے تم سے عہد و پیمان لیا تھا کہ اگر تمھیں مددگار نہ ملیں تو ہاتھ روک لینا اپنے اور اپنے اہلبیت اور شیعوں کے خون کی حفاظت کرنا۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی اپنی دعوت کے آغاز میں اور اپنی مکی زندگی کے دور میں مشرکین سے جنگ نہیں کی اور مدینے میں بھی چند ماہ گزرنے کے بعد مشرکین سے جنگ پر مامور ہوئے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے بھی رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر عمل کرتے ہوئے اپنی امامت کے آغاز میں اپنے مخالفوں اور اپنے حق پر ناجائز قبضہ جمانے والوں کے ساتھ جنگ سے گریز کیا اور پھر جب آپ

(۱) کتاب سلیم/۲۱۵، ح۱۲، اسی سے مشابہ مضمون: گزشتہ حوالہ/۱۳۵-۱۳۷، ح۱، ح۲۔

اقتدار میں آئے اور مخالفوں نے آپ کے سامنے جنگ کا نقارہ بجادیا آیا تب آپ نے بھی ان سے جنگ کی۔ امام رضاؑ سے بھی پوچھا گیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امام علیؑ نے پورے پچیس برس تک دشمنوں سے جنگ کیوں نہ کی اور پھر اپنے زمانۂ حکومت میں دشمنوں سے کیوں لڑے؟ امام علی رضاؑ نے جواب دیا:

«لِأَنَّهُ اِقْتَدَى بِرَسُولِ اَللّٰهِ صَلَّى الله عليه وآله فِي تَرْكِهِ جِهَادَ اَلْمُشْرِكِينَ بِمَكَّةَ بَعدَ النُّبُوَّةِ ثَلاثَ عَشرَةَ سَنَةً وبِالْمَدِينَةِ تِسعَةَ عَشَرَ شَهراً وَذلِكَ لِقِلَّةِ أعوانِهِ عَلَيهِم وَكَذلِكَ عَلِيٌّ عليه السلامُ تَرَكَ مُجَاهَدَةَ أعدائهِ لِقِلَّةِ أعوانِهِ عليهم فَلَمَّا لَمْ تَبْطُلْ نُبُوَّةُ رَسُولِ اَللّٰهِ صلى الله عليه وآله مَعَ تَرْكِهِ اَلْجِهَادَ ثَلاثَ عَشرَةَ سَنَةً وَتِسعَةَ عَشَرَ شَهراً كَذلِكَ لَم تَبْطُلْ إِمَامَةُ عَلِي عَلَيهِ السَّلاَمُ مَعَ تَرْكِهِ الجِهادَ خَمساً وعِشرِينَ سَنَةً إِذَا كانَتِ العِلَّةُ المانِعَةُ لَهُما مِنَ الجِهادِ وَاحِدَةً.»[1]

حضرت علیؑ نے پچیس برس تک جنگ نہ کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تیرہ سالہ مکی زندگی اور انیس ماہ کی مدنی زندگی کی پیروی کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اس عرصے میں مددگار نہ تھے اسی لیے آپ نے کفار ومشرکین سے جنگ نہیں کی تھی۔ اسی طرح پچیس برس تک حضرت علیؑ کے پاس بھی مددگار نہ تھے اسی لیے آپ نے بھی مخالفین سے جنگ نہیں کی۔ اگر مکے کے تیرہ برس اور مدینے کے انیس ماہ تک آنحضرت

---

[1] بحار الانوار ۲۹/۵/۴۳۵، ح ۲۲، عیون اخبار الرضا ۲/۱۵۲، باب ماجاء عن الرضا من العلل، ح ۱۶، علل الشرائع ۱/۱۴۸، باب ۱۲۲، ح ۵ اور اسی سے مشابہ: کتاب سلیم/۳۶۰، ح ۷۶ اور امالی، طوسی/۵۶۶، مجلس ۲۱ اور بحار الانوار ۱۰/۱۴۳ اور گزشتہ حوالہ ۴۴/۲۲-۶۲۔

ﷺ نے جنگ نہیں کی اور ان کی نبوت میں کوئی فرق نہیں آیا تو حضرت علی علیہ السلام کی پچیس سالہ خاموشی سے بھی ان کی امامت میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ جنگ نہ کرنے کی دونوں کے لیے وجہ ایک ہی تھی۔

واضح رہے کہ امام رضا علیہ السلام کا یہ بیان کہ رسول اللہ ﷺ نے اعوان و انصار کی کمی کی وجہ سے جہاد نہیں کیا، پیغمبر اسلام ﷺ کے اس حکم سے متصادم نہیں ہے جس میں آپؐ نے امیرالمؤمنین علیہ السلام سے فرمایا تھا: "آپ میری طرح نہیں ہیں کیونکہ مجھے اپنے دشمنوں سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے اگرچہ میں اکیلا ہی کیوں نہ ہوں۔"[1] کیونکہ یہ حکم پیغمبر اسلام ﷺ پر جہاد کا حکم نافذ ہونے کے بعد نازل ہوا تھا اور اس وقت آپ کو اکیلے ہونے کے باوجود لڑنا ہی تھا۔ در حقیقت، امام رضا علیہ السلام کا بیان اُن ۱۳ سالہ مکّی اور ۱۹ ماہ کی مدنی زندگی سے متعلق ہے کہ کیوں اس دوران جہاد کا حکم پیغمبر ﷺ پر نازل نہیں ہوا۔ دوسرے الفاظ میں جہاد کے حکم کے نزول سے پہلے پیغمبر اسلام ﷺ نے مددگاروں کی کمی کی وجہ سے مشرکین کے خلاف جہاد سے پرہیز فرمایا لیکن جہاد کا حکم نازل ہونے اور کچھ سال گزرنے کے بعد آپؐ کو مشرکین کا سامنا اور ان سے جنگ کرنا ہی تھا اور کسی مددگار کا انتظار بھی نہیں کرنا تھا کیونکہ آپؐ پر ایک خاص حکم نازل ہو چکا تھا جس کے مطابق آپ پر مددگاروں کی تعداد کو نظر میں رکھنا ضروری نہیں رہ گیا تھا[2] لیکن امیرالمومنین علیہ السلام پر ایسا کوئی فرض نہیں تھا اور مددگاروں کے مہیا ہونے کی صورت میں ہی انھیں اپنے مخالفین کے خلاف لڑنا اور جہاد کرنا تھا۔

امام رضا علیہ السلام کے بیان میں ایک اور اہم نکتہ آپ کے فرمان کا آخری حصہ ہے۔ اس مقام پر امام علیہ السلام فرماتے ہیں: دشمنوں کے سامنے ہر طرح کی خاموشی اور سکوت ہمیشہ ان کے عمل سے

---

[1] بحار الانوار ۲۹/۴۴۹۔ (تیرہویں سبق کی جانب رجوع کریں۔)

[2] پیغمبر ﷺ پر جہاد کے حکم کا فرمان مرحلہ وار نازل ہوا۔ رجوع فرمائیں بحار الانوار ۹۰/۷-۸۔

راضی ہونے اور ان کی تائید کے مساوی نہیں ہوتا۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کے ذریعے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کے سامنے صبر کا مظاہرہ کیا اور یہ صبر مشرکوں کی سچائی یا ان کے حق پر ہونے کی علامت نہیں تھا، اسی طرح امیرالمومنین علیہ السلام کا صبر اور ان کی خاموشی، ان کے الٰہی منصب کے غاصبوں کے ظلم اور جارحیت کو درست نہیں ٹھہراتی۔ دوسری طرف اس جانب بھی توجہ رہے کہ جس طرح نبوت ورسالت کی حقانیت کا انحصار مشرکین سے جنگ پر نہیں ہے ،اسی طرح امیرالمومنین علیہ السلام کی امامت بھی غاصبوں اور مخالفوں سے جنگ نہ کرنے کی وجہ سے شک و شبہے کے دائرے میں نہیں آسکتی۔

اس سبق کی بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جانا چاہیے کہ جس طرح توحید اور نبوت کے معاملے میں مخالفین کے سامنے خاموشی اور سکوت سے کام لینا مخالفین کی حقانیت اور ان کے عمل سے رضامندی کی علامت نہیں ، اسی طرح الٰہی حق کے غصب کے وقت امام اور جانشین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صبر کرنا بھی غاصبوں سے رضامندی کی نہ تو دلیل ہے اور نہ ہی ناجائز طریقے سے اقتدار کی کرسی پر قبضہ جمانے والوں کی تائید کی علامت۔

سبق ۱۷

تحریک پر لگام اور اس کی حکمتیں (۶)

پچھلے سبق میں ہم نے امیر المومنین علیہ السلام اور گزشتہ انبیاء کے طرز عمل میں پائی جانے والی مشابہت کا جائزہ لیا اور بیان کیا کہ اپنی الٰہی خلافت کے غصب کے مقابل امیر المومنین علیہ السلام کا رویہ، پچھلے نبیوں کی سیرت پر مبنی تھا جو انھوں نے اپنی دعوت توحید کا انکار کرنے والی قوموں کے سامنے اپنایا اور اس پر عمل کیا تھا۔ ہم نے یہ بھی کہا کہ انبیاء کا اس طرح کا رویہ نہ تو اپنی قوم سے رضامندی کی علامت تھا اور نہ ہی مشرکین کی تائید پر دلیل تھا۔ امت کی ناقدری کے مقابلے میں انبیاء کا سکوت، نہ تو حجت الٰہی کی حقانیت پر سوالیہ نشان لگاتا ہے اور نہ ہی ان کی سچائی کا انکار کرتا ہے۔ کسی کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ حجت الٰہی کی خاموشی کو دلیل بناتے ہوئے اس کی حقانیت کو رد کرنے کی جسارت کرے۔

اس سبق میں، ہم کچھ دوسری وجوہات اور حکمتوں کا تذکرہ کریں گے جو امیر المومنین علیہ السلام کے طرز عمل کے لیے بیان کی گئی ہیں اور ان کے بارے میں مختصر وضاحت پیش کریں گے۔

ارادۂ الٰہی

ایک اہم نکتہ جس کی طرف ہمیں اشارہ کرنا چاہیے، یہ ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے اِذن اور اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اپنے بندوں کے بارے میں اللہ کی دائمی سنتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ انسانوں کو ان کے اعمال میں مکمل اختیار دیتا ہے تاکہ وہ اپنے حُسنِ اختیار سے ایسی چیزوں کا انتخاب کریں جو خدا کی پسند اور اس کی مرضی کے مطابق ہوں یا پھر اپنے سوئے اختیار کے ذریعے اللہ کی معصیت کے مرتکب ہوتے ہوئے زمین پر فساد پھیلائیں۔ اللہ کی سنت کبھی یہ نہیں رہی کہ گناہوں کے راستے جبری طور پر بندوں کے لیے پوری طرح سے بند کردے بلکہ اس کی سنت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ اپنے بندوں تک انبیاء و مرسلین بھیجتا ہے اور ان کے ذریعے سعادت و شقاوت کے راستوں کا تعارف کرواتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اوامر و نواہی سے انھیں اپنی اطاعت کی ترغیب دیتے ہوئے گناہوں سے روکتا ہے۔

اسی بنیاد پر حضور ﷺ کی رحلت کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی خدا کے اِذن اور اس کی مرضی سے ہوا۔ ان معنوں میں کہ خدا نے اپنی شریعت میں امتِ مسلمہ کے لیے صحیح راستہ متعارف کرایا اور نبی اکرم ﷺ کے ذریعے صحیح اور برحق ائمہ مقرر کردیے لیکن امت کے سامنے گناہوں کا راستہ بند نہیں کیا اور اطاعت و گناہ میں ان کا ہاتھ کھلا رکھا تاکہ وہ اپنے اختیار سے جس بھی راستے کا چاہیں انتخاب کریں:

«قُلْتُ لِأَبِي عَبْدِ اَللَّهِ (عَلَيْهِ اَلسَّلاَمُ) : لِمَنْ كَانَ اَلْأَمْرُ حِينَ قُبِضَ رَسُولُ اَللَّهِ قَالَ: لَنَا أَهْلَ اَلْبَيْتِ . فَقُلْتُ: فَكَيْفَ صَارَ فِي تَيْمٍ وَعَدِيٍّ قَالَ: إِنَّكَ سَأَلْتَ فَافْهَمِ اَلْجَوَابَ. إِنَّ اَللَّهَ (تَعَالَى) لَمَّا كَتَبَ أَنْ يُفْسَدَ فِي اَلْأَرْضِ، وَتُنْكَحَ اَلْفُرُوجُ اَلْحَرَامُ، وَيُحْكَمَ بِغَيْرِ مَا أَنْزَلَ اَللَّهُ،

خَلاَّ بَيْنَ أَعْدَائِنَا وَ بَيْنَ مُرَادِهِمْ مِنَ الدُّنْيَا حَتَّى دَفَعُونَا عَنْ حَقِّنَا،
وَ جَرَى الظُّلْمُ عَلَى أَيْدِيهِمْ دُونَنَا.» (۱)

فضیل بن یسار سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابو عبد اللہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت اقدس میں عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے گئے تو اس وقت امرِ خلافت کن لوگوں کا حق تھا؟ آپؑ نے فرمایا: یہ حق ہم اہل بیت کا تھا۔ میں نے عرض کیا: اگر یہ آپ اہل بیت کا حق تھا تو پھر یہ بنی تیم اور بنی عدی کے قبیلے میں کیسے چلا گیا؟ آپؑ نے فرمایا: تم نے سوال کیا ہے تو اب اس کے جواب کو بھی سمجھو۔ جب اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ زمین پر فساد ہوگا، لوگوں میں زنا عام ہو جائے گا اور اللہ کی طرف سے نازل شدہ دین کے خلاف حکم دیا جائے گا تو اللہ نے ہمارے دشمنوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے جس سے وہ اپنی دنیوی مرادیں پاتے ہیں حتیٰ کہ انھوں نے ہمارے حق کو غصب کیا اور ہمارے اوپر ظلم کیا۔

لہٰذا خلافت پر قبضہ، اللہ کے اس تکوینی اذن کے راستے میں واقع ہوا جو کہ اللہ کا پسندیدہ راستہ نہیں تھا، اور ائمہ علیہم السلام نے، جو خدا کی مشیت کے رازدار اور اس کے محافظ ہیں، رب العزت کی اس تقدیر اور مرضی سے مطمئن اور راضی ہوتے ہوئے خود پر آنے والی مصیبتوں کو برداشت کیا اور جو بھی خدا نے ان سے چاہا تھا اسے درست اور مکمل طور پر پورا کیا۔

---

(۱) امالی، طوسی ۱/۲۲۶، المجلس الثامن، ح ۴۵، بحار الانوار ۲۹/۴۴۱، ح ۳۴، اسی سے مشابہ: گزشتہ حوالہ/ح ۲۷، علل الشرائع ۱/۱۸۴، باب ۱۲۲، ح ۱۴۔

مؤمنوں کی پیدائش

امیر المؤمنین علیہ السلام کی خاموشی کے بارے میں جو حکمتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں مؤمنوں کی پیدائش کا معاملہ بھی ہے کیونکہ خدا کی مرضی اور اس کے ارادہ و مشیت کے مطابق اس دنیا میں مؤمن اور کافر ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ روایات میں بیان کیا گیا ہے: امیر المؤمنین علیہ السلام نے کافروں سے اس وقت تک جنگ نہیں کی جب تک ان کے مؤمن بچے پیدا نہیں ہو گئے:

ابراہیم کرخی کہتے ہیں: میں نے ابو عبداللہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کیا: کیا علی علیہ السلام دینِ خدا میں پختہ و قوی نہ تھے؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں، وہ قوی تھے۔ میں نے کہا: پھر قوم ان پر کس طرح غالب آگئی اور انھوں نے قوم کا مقابلہ کیوں نہیں کیا؟ کس چیز نے انھیں اس سے روکا؟ تو آپ نے فرمایا: قرآن مجید کی ایک آیت نے۔ میں نے پوچھا: کونسی آیت؟ امام علیہ السلام نے فرمایا:

﴿لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَاباً أَلِيماً﴾[1] إِنَّهُ كَانَ لِلّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَدَائِعُ مُؤْمِنِينَ فِي أَصْلَابِ قَوْمٍ كَافِرِينَ وَ مُنَافِقِينَ. فَلَمْ يَكُنْ عَلِيٌّ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِيَقْتُلَ الْآبَاءَ حَتَّى تَخْرُجَ الْوَدَائِعُ. فَلَمَّا خَرَجَتْ ظَهَرَ عَلَى مَنْ ظَهَرَ وَ قَتَلَهُ

"اگر وہ (مؤمن اور کافر) الگ ہو جاتے تو ہم ان میں سے کافروں کو دردناک سزا دیتے۔" کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مؤمن امانتیں کافروں اور منافقوں کے صلبوں میں موجود تھیں تو علی علیہ السلام کے لیے اس وقت تک ممکن نہیں تھا کہ ان کے آباؤاجداد کو قتل کر دیں

---

(۱) فتح (۴۸)/۲۵۔

جب تک وہ امانتیں پیدا نہ ہوجائیں اور جب امانتیں نکل آئیں تو علی علیہ السلام ان پر حملہ آور ہوئے اور ان سے مقابلہ کیا۔۔۔۔

اس روایت کے مطابق امیر المؤمنین علیہ السلام کی خاموشی کی ایک اور حکمت واضح ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ نوٹ کرنا چاہیے کہ اس طرح کے بیانات کو امیر المؤمنین علیہ السلام کے اقدامات کے اثرات و فوائد پر حمل کیا جانا چاہیے۔ یعنی جب خدا کی مرضی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے امام علی علیہ السلام نے اپنے مخالفین سے جنگ سے گریز کیا تو انھوں نے اپنے اس اقدام سے جہاں دین کی حفاظت اور لوگوں کے مرتد ہوجانے کے اندیشے کو روکا، وہیں دوسرے مؤمنین کی پیدائش کا موقع بھی فراہم کیا۔ اس لیے کہ اگر ہم امام علیہ السلام کی خاموشی کی بنیادی وجہ مؤمنوں کی پیدائش کو سمجھ لیں تو پھر یہ قبول نہیں کیا جاسکتا کہ امام علیہ السلام اپنے مددگاروں کے موجود ہونے کی صورت میں قیام کرتے کیونکہ ایسی صورت میں کافر مارے جاتے اور ان کے مؤمن بچے پیدا نہ ہوپاتے۔

لہٰذا اس طرح کی روایتوں کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ خدا کی حکمت اور مصلحت کے مطابق، امیر المؤمنین علیہ السلام نے غاصبوں کے خلاف جنگ نہیں کی اور اس طرح لوگوں کے ارتداد کو بھی روکا اور ساتھ ہی کافروں کے صلب سے مؤمن بچے بھی دنیا میں آگئے، بے شک خدا کا ہاتھ کھلا ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہاں سے یہ بات پوری طرح قابل فہم ہے کہ اپنے حق کے غاصبوں کے خلاف اگر امیر المؤمنین علیہ السلام قیام فرماتے تو پھر یا تو ان معاملات سے متعلق خدا کی مشیت میں تبدیلی واقع ہوتی اور بطور مثال اس طرح کے مؤمنوں کی پیدائش رک جاتی یا پھر اللہ ان مقاصد کو کسی اور طریقے سے پورا کرتا لیکن موجودہ صورتحال میں خدا کا ارادہ ایسا ہی واقع ہوا ہے اور اس نے چیزوں کو اس طرح سے طے کردیا ہے۔

یہ نکتہ اس وقت مزید واضح ہوجاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ امام علیہ السلام اپنی حکومت کے دوران اور جنگوں میں اس معاملے کا لحاظ کرتے تھے اور ہر کسی کو تہہ تیغ نہیں کرتے تھے۔

اب جب کہ ہم نے ظالموں اور غاصبوں کے خلاف امیرالمؤمنین علیہ السلام کی خاموشی کی حکمت کے اسباب اور پہلوؤں کا جائزہ لے لیا ہے تو ہم پہلے سے بہتر طریقے سے سمجھ گئے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اسلامی معاشرہ اس راستے سے ہٹ گیا جو خدا نے اس کے لیے مقرر کیا تھا اور خدا کی برحق حجت کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ سازش کرنے والوں نے ولیٔ خدا کی مسند پر ناجائز قبضہ جماتے ہوئے اقتدار کی باگ ڈور کو خلیفۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زبردستی چھین لیا اور اس طرح امیرالمؤمنین کو خانہ نشین بنا دیا اور آپ کو تلخ صبر اور صبر آزما خاموشی کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا۔

اس تحقیق سے ہمیں جو اہم نتیجہ حاصل ہوتا ہے وہ امیرالمؤمنین علیہ السلام کے صبر کے سلسلے میں غلط مفروضے قائم کرتے ہوئے بے بنیاد نتائج نکالنے والوں کی قلعی کا کھلنا ہے جو اپنی بے ہودہ اور بے ثمر تحقیق سے اس چکر میں تھے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام کی خاموشی کو غلط طریقے سے پیش کرتے ہوئے اسے خلافت کے غاصبوں کے طرز عمل کی تائید کی علامت بنا دیا جائے اور امیرالمؤمنین علیہ السلام کے سکوت کو غاصبان حکومت سے رضامندی کی دلیل کے طور پر پیش کر دیا جائے لیکن خود امیرالمؤمنین علیہ السلام کے بیانات کے مطابق ہم نے واضح کر دیا کہ حکمرانی اور اسلامی معاشرے کی رہنمائی و حکومت کے معاملے میں امیرالمؤمنین علیہ السلام خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ سمجھتے ہیں اور دوسروں کو غاصب اور جابر کے طور پر متعارف کراتے ہیں۔

امیرالمؤمنین علیہ السلام اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے اپنے عہد و پیمان کی پاسداری کا پابند سمجھتے تھے اور اپنی خاموشی کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی تعمیل شمار کرتے تھے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کے مطابق امیرالمؤمنین علیہ السلام جنگ کرنے کو مددگاروں کے وجود کے ساتھ ہی اپنی اور اپنے اہل بیت علیہم السلام اور اپنے بہت تھوڑے سے شیعوں کی زندگی کے تحفظ سے مشروط سمجھتے تھے۔

امیر المؤمنین (علیہ السلام) نے غاصبوں کے مقابلے میں اپنے صبر کو دعوتِ توحید کے میدان میں خدا کے عظیم انبیاء (علیہم السلام) کے عمل اور ان کے صبر و ضبط کے مترادف قرار دیا ہے۔

امیر المؤمنین (علیہ السلام) اپنی خانہ نشینی کا نتیجہ دین اسلام کی حفاظت اور اس کے نام کی حفاظت سمجھتے ہیں اور اس لیے وہ ظالموں کے ظلم و ستم کو برداشت کرتے ہیں۔

امیر المؤمنین (علیہ السلام) نے اپنی خاموشی سے لوگوں کو کفر اور ارتداد کی کھائی میں گرنے سے بچا لیا اور اسلامی معاشرے کے ظاہر کو محفوظ رکھتے ہوئے حقیقی مسلمانوں کو تعلیم اور اسلام کے حقیقی اصولوں کو فروغ دینے کی بنیاد فراہم کی۔

امیر المؤمنین (علیہ السلام) نے ارادۂ الٰہی سے کافروں کی صلبوں میں موجود اللہ کی امانتوں کے باہر آنے کی راہ ہموار کی اور اپنے الٰہی حق کے غاصبوں کے خلاف جنگ کو کسی اور وقت کے لیے ملتوی کر دیا ہے۔

اور آخر میں یہ کہ امیر المؤمنین (علیہ السلام) ارادۂ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے، صبر کے ساتھ اپنے الٰہی حق کے غصب کو تسلیم کرتے ہیں اور تلخ خاموشی کے ساتھ صفحۂ تاریخ پر اپنی مظلومیت کی داستان رقم کر جاتے ہیں۔

چوتھا باب

دریائے حقیقت پر شبہات کے بلبلے

جیسا کہ بیان کیا گیا: مخالفین 'رضایت' کے تصور کو ثابت کرنے کے لیے امیر المؤمنین علیہ السلام کے کچھ بیانات کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں ہم ان بیانات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دکھائیں گے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے یہ بیانات نہ صرف یہ کہ آپؑ کی رضایت کی علامت نہیں ہیں، بلکہ حکمرانی کے معاملے میں امیر المؤمنین علیہ السلام کے الٰہی حق کے غصب کی ایک اور تصدیق بھی ہیں۔

مخالفین کی جانب سے پیش کیے جانے والے شکوک و شبہات پر تنقید کرنے میں ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم واضح کر دیں: امام کے خطبات اور الفاظ و بیانات، جنھیں مخالفین نے دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، بنیادی طور پر مبہم اور ذو معنیٰ ہیں اور انھیں دوسرے معنی پر بھی حمل کیا جاسکتا ہے اور اس صورت میں شیعہ عقیدے پر کسی بھی طرح کی کوئی چوٹ نہیں لگائی جاسکتی۔ ساتھ ہی امام کے بیانات کے صحیح معنی کا تعین کرنے میں ہماری بحث کا مأخذ اول تو گزشتہ ابواب میں پیش کی گئی باتیں ہوں گی اور دوسرے وہ موضوعات و مباحث ہوں گے جو ہر اعتراض کے ساتھ ساتھ مستند حوالوں کے ہمراہ پیش کیے جائیں گے۔

اسی طرح بعض مقامات پر مخالفین کی جانب سے امیر المؤمنین علیہ السلام کے بیانات کو کتر بیونت کر کے پیش کیا گیا ہے اور کلام جناب امیر علیہ السلام کے ایک حصے کو لیتے ہوئے دیگر حصوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس طرح شیعوں کے خلاف شبہہ پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے لیکن ہم نے امیر المؤمنین علیہ السلام کے مکمل بیان (یا آپؑ کے خط) کو پیش کرتے اور مخالفوں کے غلط اور غیر علمی طریقے کی پول کھولتے ہوئے امیر المؤمنین علیہ السلام کے کلام میں موجود داخلی اور متصل قرائن کو پیش کر دیا ہے تاکہ اس سے حاصل کیے ہوئے مخالفین کے غلط نتائج برملا ہو جائیں۔

سبق ۱۸

پانچویں خطبے کا جائزہ

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ان کے چچا عباس اور ابو سفیان نے امیر المؤمنین علیہ السلام کو بیعت کی پیشکش کی۔ عباس نے کہا: اگر میں آپ سے بیعت کرتا ہوں تو کوئی آپ کی مخالفت نہیں کرے گا۔ ابو سفیان نے کہا: اگر آپ چاہیں تو میں مدینے کو سپاہیوں سے بھر دوں گا۔ لیکن جناب امیر علیہ السلام نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

امیر المؤمنین علیہ السلام کے اس طرز عمل سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ گویا امیر المؤمنین علیہ السلام حکومت کے شورائی ہونے کو قبول کرتے تھے اور نتیجتاً ابوبکر کی حکومت سے راضی تھے:

«... جب پیغمبر ﷺ کے چچا عباس، امیر المؤمنین علیہ السلام کے ساتھ، حضور ﷺ کے جنازے کے غسل و کفن میں مشغول تھے اور جب انھوں نے محسوس کیا کہ خلافت پر کسی اور کی طرف سے قبضہ کرنے کی سازش ہو رہی ہے تو انھوں نے امیر المؤمنین علیہ السلام کے

سامنے بیعت کی پیشکش رکھی اور کہا: اگر میں آپ سے بیعت کروں تو دو لوگ بھی اس معاملے میں آپ کی مخالفت نہیں کریں گے۔ امام نے پہلی بار حیرت سے کہا: أَوَلَهَا غَيْرِي؟ کیا میرے علاوہ بھی کوئی اس (عہدے) کے لیے ہے؟ اور جب عباس نے باہر چل رہی سازشوں کے بارے میں آگاہ کیا تو جناب امیر علیہ السلام نے وہ الفاظ بیان فرمائے جو ہمیشہ ان کا نصب العین اور اسلام کا دائمی قانون رہا ہے: إِنَّ بَيْعَتِي لَا تَكُونُ خَفِيّاً وَ لَا تَكُونُ إِلَّا عَنْ رِضًى الْمُسْلِمِينَ در حقیقت اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ خلافت صرف تمہارا حق نہیں کہ اسے اپنے اعتبار تم میرے حوالے کر دو اور کوئی بھی اس کی مخالفت نہ کرے بلکہ یہ ایک عمومی حق ہے اور ایک ایسے شخص کو دیا جانا چاہیے جو مسلمانوں کے مشورے سے اس کا مستحق ہو۔ چنانچہ انھوں نے عباس اور ان کے بعد ابو سفیان کی ایسی تجاویز کو، جو اسلامی شریعت کی روح سے متصادم تھیں اور جو مکار سیاستدانوں کا طریقہ کار رہا ہے، مسترد کر دیا۔» [1]

اس معاملے کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

بعض روایات کے مطابق، حاصلِ مطلب یہ ہے کہ عباس اور ابوسفیان کی طرف سے دو الگ الگ تجاویز امیر المؤمنین علیہ السلام کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ عباس کی تجویز رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر اور آپؐ کی تدفین کے وقت تھی اور ابوسفیان کی تجویز بعد میں لیکن اسی دن دی گئی تھی۔ اگرچہ بظاہر عباس کی تجویز لوگوں کے ابوبکر سے بیعت کرنے سے پہلے تھی اور ابوسفیان کی تجویز ابوبکر سے بیعت کے بعد تھی [2] لیکن کچھ دوسری روایتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ عباس اور ابوسفیان دونوں نے ہی

---

(۱) حکومت در اسلام، حیدر علی قلمداران/۱۹۱-۱۹۲، بیعت کے مخفی طور پر نہ ہونے کے سلسلے میں بحث و گفتگو اور آپ کے سلسلے میں ہوئی بیعت کے کردار کو آنے والی جلدوں میں ذکر کریں گے۔

(۲) شرح ابن ابی الحدید ۱/۲۱۸-۲۱۹، بحار الانوار ۲۸/۲۳۳، مناقب ابن الجوزی سے منقول۔

بیعت کی پیشکش رکھی اور یہ پیشکش لوگوں کے ابوبکر سے بیعت کرنے کے بعد کی گئی۔[1] دونوں روایتوں کے مطابق، امیر المؤمنین علیہ السلام نے بیعت کی یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کے بعد ایک خطبہ دیا جس کا ذکر نہج البلاغہ میں خطبہ نمبر پانچ کے ضمن میں موجود ہے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام کو عباس کی تجویز مندرجہ ذیل تھی:

«فَقَالَ الْعَبَّاسُ لِعَلِيٍّ وَهُمَا فِي الدَّارِ: أُمْدُدْ يَدَكَ أُبَايِعْكَ. فَيَقُولُ النَّاسُ: عَمُّ رَسُولِ اللَّهِ بَايَعَ ابْنَ عَمِّ رَسُولِ اللَّهِ فَلَا يَخْتَلِفُ عَلَيْكَ اثْنَانٌ. فَقَالَ لَهُ: أَوَ يَطْمَعُ يَا عَمِّ فِيهَا طَامِعٌ غَيْرِي ؟ قَالَ سَتَعْلَمُ.»[2]

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے گھر میں، عباس نے علیؑ سے کہا: اپنا ہاتھ بڑھاؤ تاکہ میں تم سے بیعت کروں، ایسی صورت میں لوگ کہیں گے: نبی کے چچا نے، نبی کے چچازاد بھائی سے بیعت کی۔ پھر دو لوگ بھی تمھاری مخالفت نہیں کریں گے۔ امام نے عباس سے کہا: اے چچا! کیا میرے علاوہ بھی کوئی اس (منصب) کے لیے ہے؟[3] عباس نے کہا: تمھیں جلد پتہ چل جائے گا۔

اسی طرح ابوسفیان کی طرف سے امیر المؤمنین علیہ السلام کو دی گئی تجویز کا متن بھی کتابوں میں درج ہے:

---

[1] منہاج البراعہ فی شرح نہج البلاغہ ۳/۷، ۱۳، نہج البلاغہ/خطبہ ۵۔

[2] شرح ابن ابی الحدید ۱/۱۶۰-۱۶۱ اور اسی سے مشابہ: بحار الانوار ۲۸/۲۸۶-۲۹۰ (فٹ نوٹ میں اہلسنت کے دیگر منابع سے منقول)۔

[3] واضح رہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے اس طرح کے بیانات آپ کی لاعلمی کے معنوں میں نہیں ہے بلکہ اس طرح کے مقامات پر امیر المؤمنین علیہ السلام کے بیان کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے کچھ اس طرح سے میرے معاملے کو مستحکم کر دیا ہے کہ عام حالات میں کسی کو بھی میرے سامنے حکومت کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے۔

ثُمَّ قَالَ لِعَلِيٍّ: أُبْسُطْ يَدَكَ أُبَايِعْكَ فَوَ اللّٰهِ! إِنْ شِئْتَ لَأَمْلَأَنَّهَا عَلَى أَبِي فَصِيلٍ يَعْنِي أَبَابَكْرٍ خَيْلاً وَرَجِلاً فَامْتَنَعَ عَلَيْهِ عَلِيٌّ.»(۱)

پھر ابوسفیان نے علیؑ سے کہا: اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ تاکہ میں تم سے بیعت کروں۔ خدا کی قسم! اگر تم چاہو تو میں ابوبکر کے مدِ مقابل تمہاری حمایت میں مدینے کو سپاہیوں اور گھڑ سواروں سے بھر دوں گا۔ لیکن امیرالمؤمنین علیہ السلام نے انکار کر دیا۔

عباس کی شخصیت

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، عباس جنگ بدر کے دوران مشرک فوج کے رکن تھے اور مسلمانوں کے ہاتھوں پکڑے جانے اور اسیر ہونے کے بعد وہیں پر ایمان لائے۔(۲) (اگرچہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ پہلے ہی ایمان لا چکے تھے لیکن اپنے ایمان کو چھپا کر رکھا تھا۔) خیر جو بھی ہو وہ مسلمانوں میں شامل نہیں تھے۔ لہٰذا وہ اسلام میں نہ ہی کوئی ایسی شخصیت تھے جن کا اسلام میں کوئی سابقہ تھا اور نہ ہی وہ انصار و مہاجرین کے زمرے میں آتے تھے، چنانچہ ان کی شخصیت نہ ہی دینی شخصیت تھی نہ ہی اسلامی شخصیت کہ جس کے ذریعے حکومت کے حصول میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کو اپنے الٰہی دعوے کے اثبات کے لیے کوئی حمایت حاصل ہو سکتی تھی۔ امیرالمؤمنین علیہ السلام بھی اس موضوع کو کنایتاً بیان کرتے ہیں:

---

(۱) گزشتہ حوالہ ۱/۲۲۱ اور ۲/۴۴-۴۷، بحار الانوار ۲۹/۶۳۲، الفتوح ابن اعثم سے منقول۔

(۲) بحار الانوار ۱۹/۲۲۷-۲۵۸-۳۶۵-۳۷۲، اگرچہ یہ نظریہ بھی پایا جاتا ہے کہ عباس فتح مکہ میں ایمان لائے تھے، رجوع فرمائیں الصحیح من سیرۃ النبی ۵/۱۲۰-۱۳۶۔

«...وَلَوْ كَانَ لِی بَعْدَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَ آلِهِ عَمِّی حَمْزَةُ وَ أَخِی جَعْفَرٌ لَمْ أُبَايِعْ كَرْهاً وَ لَكِنِّی مُنِيتُ بِرَجُلَيْنِ حَدِيثَیْ عَهْدٍ بِالْإِسْلَامِ الْعَبَّاسِ وَ عَقِيلٍ...»[1]

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد میرے چچا حمزہ اور میرے بھائی جعفر میرے ساتھ ہوتے تو میں مجبوراً بیعت نہ کرتا لیکن میں دو تازہ مسلمان عباس اور عقیل میں الجھ کر رہ گیا۔

یہاں پر امیر المؤمنین علیہ السلام دو چچاؤں اور دو بھائیوں کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حمزہ اور جعفر کا وہ عظیم مقام تھا جو عباس اور عقیل نہیں رکھتے، وہ جنگجو اور مرد میدان افراد تھے لیکن ان میں ایسی خصوصیات نہیں ہیں۔ اسی طرح وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عظیم ساتھی اور جلیل القدر اصحاب میں سے تھے لیکن ان دونوں کی ایسی تاریخ نہیں رہی ہے اور ان پر اب بھی ایامِ جاہلیت کی رسومات کا اثر ہے۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ عباس (اور عقیل) کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کچھ خاص اٹھنا بیٹھنا نہ تھا اور انہیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت کا فیض کچھ زیادہ حاصل نہ تھا جس کی وجہ سے ممکن تھا کہ وہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے فضائل و کمالات اور آپؑ کے شاندار ماضی نیز آپ کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات سے کماحقہ آگاہی نہ رکھتے ہوں۔[2] لہذا، عباس کی طرف سے بیعت کی

---

[1] حق الیقین ۲/۱۷۱ اور اسی سے مشابہ: شرح ابن ابی الحدید ۱۱/۱۱۱، کتاب سلیم/۲۱۶، ح ۱۲، تفسیر عیاشی ۲/۵۱، ح ۳۱، بحار الانوار ۲۹/۵۲، ح ۴۲، گزشتہ حوالہ ۳۰/۱۵، محمد بن ابی بکر کی شہادت کے بعد خط۔

[2] خاص طور پر ایسی حالت میں کہ جب مشہور قول کی بنیاد پر عباس جنگ بدر کے بعد واپس مکہ پلٹ آئے اور فتح مکہ تک وہیں رہے۔ رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۱۹/۲۰۲-۳۱۲، عیون اخبار الرضا ۱/۸۳، باب فی جمل من اخبار موسی بن

پیشکش ضروری نہیں تھی کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام کے خدائی حق کے علم پر مبنی ہو اور امیرالمؤمنین علیہ السلام کے الٰہی منصب کو پورا کرنے کے لیے ہی ہو بلکہ اس تجویز میں عباس ایک بوڑھے قریشی آدمی کی حیثیت سے خود اپنے مقام پر زور دیتے ہیں، اس لحاظ سے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا بھی ہیں۔

اسی وجہ سے جب وہ کہتے ہیں کہ اگر میں آپ سے بیعت کرتا ہوں تو کوئی آپ کی مخالفت نہیں کرے گا تو یہ ان کی اسلامی شخصیت کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں ان کا اپنے عہدے اور قبائلی حیثیت پر زور ہے۔ اس لیے کہ چونکہ وہ پیرِ قریش اور خاندانی لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نزدیک ہیں اس لیے قریش ان کی مخالفت نہیں کریں گے اور چونکہ قریش عربوں کے سردار ہیں اس لیے تمام عرب ان کی اطاعت کریں گے۔[1]

ابوسفیان کی شخصیت

ابوسفیان بظاہر فتح مکہ کے دوران مسلمان ہوا۔[2] وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا اور بیس سال سے زیادہ عرصے تک اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی اور آنحضرت کے خلاف کئی جنگوں میں اس کا ہاتھ رہا اور آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے طلقاء میں شمار کیا۔

جعفر علیہ السلام مع ہارون، کافی ۸/۱۹۰، ح ۲۱۶، گزشتہ حوالہ ۸/۲۰۲، ح ۲۴۴، العباس والعقیل یوم بدر، مستدرک، حاکم ۴/۳۸۴، ح ۵۴۵۵۔

(۱) اسی وجہ سے امیرالمؤمنین علیہ السلام کے الٰہی حق کو غصب کرنے والوں نے شروعات میں ہی عباس کو لالچ دیتے ہوئے انھیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تاکہ ان کی حکومت جلد از جلد اور آسانی سے محکم ہوجائے، رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۲۸/۲۹۱-۲۹۳۔

(۲) منقول ہے کہ فتح مکہ کے دن ابوسفیان نے عباس سے کہا: « واللهِ يا أبا الفضلِ! لقد أصبح ملكُ ابنِ أخيك الغداةَ عظيمًا » عباس نے جواب میں کہا: « أبا سفيانَ! إنها النبوةُ. » (بحار الانوار ۲۱/۱۰۳،

اس لیے ابوسفیان کا کوئی اسلامی چہرہ نہ تھا اور وہ کوئی اسلامی شخصیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن زمانۂ جاہلیت کے رسم ورواج کے مطابق اس کا ایک اعلیٰ مقام اور درجہ تھا۔ قریش میں، بنی ہاشم کو اعلیٰ نسل والا سمجھا جاتا تھا اور اس کے بعد بنی امیہ عربوں پر اپنی فضیلت کے دعوے دار تھے جن کا سردار ابوسفیان تھا۔ جاہلیت کے زمانے میں مکے کے بزرگوں میں شمار ہونے والے ابوسفیان کی سماجی پوزیشن اسلام کی آمد کے بعد خطرے میں پڑگئی اس لیے اس نے حتی الامکان حضور کی مخالفت کی۔

رسول اللہ ﷺ کی رحلت اور ابوبکر کے اقتدار میں آنے کے بعد ابوسفیان کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی کہ ابوبکر جیسے نچلے طبقے کا انسان بر سرِاقتدار آجائے کیونکہ ابوبکر اور عمر کا سماجی مرتبہ ابو سفیان سے کم تھا۔ وہ قبیلۂ تیم اور عدی-قریش کے نچلے طبقے سے- تھے اور ابوسفیان کا تعلق بنی امیہ اور قریش قبیلے کے اعلیٰ طبقے سے تھا۔ لہٰذا ابوسفیان کا امیرالمؤمنین علیہ السلام کی طرف رُخ کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ اسے امیرالمؤمنین علیہ السلام کی حقانیت پر یقین تھا، بلکہ اس وجہ سے تھا کہ بہرحال امیرالمؤمنین علیہ السلام بنی ہاشم سے تھے اور بنی امیہ سے بنی ہاشم خاندانی لحاظ سے نزدیک تھے اور چونکہ خود ابوسفیان اسلامی معاشرے پر حکومت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے وہ امیرالمؤمنین علیہ السلام کی حمایت کرتے ہوئے چاہتا تھا کہ قریش کے نچلے طبقات کو عربوں پر حکمرانی سے ہٹادے۔

عربی میں ایک کہاوت ہے:

«أَنَا عَلَى أَخِي وَ أَنَا وَ أَخِي عَلَى اِبْنِ عَمِّي وَ أَنَا وَ أَخِي وَ اِبْنُ عَمِّي عَلَى الْغَرِيبِ.»

سیرت ابن ہشام ۴/۴۷)۔ اسی طرح عثمان کے دورِ خلافت میں ایک دن جناب حمزہ کی قبر پر جا کے کہا: اے ابوعمارہ اکل کو جس چیز کے لیے تم ہم سے لڑ رہے تھے وہ آج کل ہمارے بچوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن چکی ہے۔ (بحار الانوار ۸۹/۳۳، شرح ابن ابی الحدید سے منقول ۶۸/۴، اسی سے مشابہ: احتجاج ۲۷۵/۱، باب احتجاج الحسن علیہ السلام فی مجلس معاویہ۔)

میری اپنے بھائی کے ساتھ دشمنی ہے لیکن میں اپنے چچازاد بھائیوں کے خلاف اپنے بھائی کی حمایت کروں گا اور میں اپنے بھائی اور چچازاد بھائیوں کے ساتھ مل کر بیگانوں کے خلاف لڑوں گا۔

ابو سفیان نے امیر المؤمنین علیہ السلام کے لیے اپنے تعاون اور حمایت کا اظہار اس وجہ سے نہیں کیا کہ وہ امیر المؤمنین علیہ السلام کو اس عہدے کا الٰہی حقدار سمجھتا تھا بلکہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے ساتھ اپنی قریبی رشتہ داری اور بیگانوں کو اس عہدے سے دور رکھنے کے لیے وہ ایسا کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات خود ابو سفیان کے بیان میں بھی مل جاتی ہے:

«مَا بَالُ هَذَا الْأَمْرِ فِي أَقَلِّ حَيٍّ مِنْ قُرَيْشٍ!»[1]

یہ کیا ہو گیا ہے کہ حکومت سماجی درجے کے لحاظ سے قریش کے سب سے نچلے طبقے کے پاس ہے۔

غَلَبَكَ عَلَيْهِ أَذَلُّ أَحْيَاءِ قُرَيْشٍ تَيْمٌ وَ عَدِيٌّ[2]

اے علی! حکومت کے معاملے میں قریش کے سب سے نچلے طبقے تیم اور عدی تم پر غالب آ گئے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام کا انکار

عباس اور ابو سفیان کی شخصیات کا ایک مختصر جائزہ لینے کے بعد ان دونوں کی بیعت کی پیشکش کو امیر المؤمنین علیہ السلام کی جانب سے ٹھکرا دینے کی وجہ واضح ہو جاتی ہے۔ جو بات یقینی ہے وہ یہ

---

(١) شرح ابن ابی الحدید ١/٢٢١، اسی سے مشابہ: المستدرک، حاکم ٣/٧٧، ح ٤٥١٩، تاریخ الخلفاء، سیوطی/٥٣، الاستیعاب ٤/١٦٧٩، ابو سفیان بن صخر کے ذیل میں۔

(٢) کتاب سلیم/٣٠٢، ح ٢٥۔

ہے کہ صرف معاشرے کی حکمرانی جناب امیر علیہ السلام کے لیے اہم نہیں تھی بلکہ اگر آپؑ نے معاشرے پر حکمرانی چاہی تو یہ اس کے الٰہی پہلو کی وجہ سے تھا اور آپؑ حکومت کو دین خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ حکومت کے معاملے میں جناب امیر علیہ السلام کا دعویٰ الٰہی اور اسلامی تھا لیکن ابو سفیان اور عباس جس چیز کے خواہاں تھے وہ کچھ اور تھا۔

عباس اور ابو سفیان کی پیشکش اور ان کی شخصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ عباس اور ابو سفیان نے جس چیز پر انحصار کیا تھا وہ زمانہ جاہلیت کی رسم اور قبائلی نظام کی روایت تھی۔ اس لیے اگر جناب امیر علیہ السلام نے ان دونوں کی پیشکش قبول کر لیتے تو وہ اپنے الٰہی حق کے دعوے سے واضح طور پر پیچھے ہٹ جاتے اور حقیقت میں یہ ثابت کرتے کہ اب جبکہ تم مجھے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم اور میرے فضائل و مناقب کے باوجود حکومت نہیں دیتے تو پھر میں زمانہ جاہلیت کے قدیم قبائلی رسم و رواج کے مطابق اس کو حاصل کر لوں گا۔

عباس (اور عقیل) کے تازہ مسلمان ہونے کے ذکر اور ان دونوں کے حمزہ اور جعفر سے موازنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر امیر المومنین علیہ السلام جناب حمزہ اور جعفر کے ساتھ مل کر غاصبوں کے خلاف قیام کرتے تو ان کا یہ اقدام ایک سماجی اور خاندانی تحریک نہ سمجھا جاتا اور ان کے اسلامی اور مذہبی دعوے پر قبائلی نظام کا سایہ بھی نہیں پڑتا۔ اسی لیے جب جناب امیر علیہ السلام اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ مدد کرنے والوں کو اکٹھا کرنے کے لیے چلے تو مہاجرین و انصار اور شروعاتی دور کے مسلمانوں اور اہل بدر کے گھروں پر گئے کیونکہ ان کے ساتھ مل کر قیام کرنا امیر المومنین علیہ السلام کی تحریک کے الٰہی اور دینی پہلو کو واضح کرتا لیکن عباس اور ابو سفیان کے زیر سایہ رہ کر تحریک کو آگے بڑھانے سے تحریک کی اسلامی اور دینی روح ختم ہو جاتی اور قبائلی رنگ و روپ لے لیتی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

دیرینہ دشمن سے مدد مانگنے اور اس کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت حاصل کرنے کا الٰہی دعوے کو ترک کرنے اور جاہلانہ روایت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کوئی پیغام نہیں ہوتا۔[1]

دوسری طرف امیرالمؤمنین علیہ السلام ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنے مقدس مقصد کے حصول کے لیے کوئی بھی راستہ چن لیں اور کسی بھی چالبازی اور حیلے کا سہارا لے لیں جیسا کہ معاویہ کے معاملے میں بھی آپ نے اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے۔ جب مغیرہ بن شعبہ نے آپ کے سامنے پیشکش رکھی کہ فی الحال شام پر معاویہ کی ولایت کو قبول کر لیجیے تاکہ آپ کی حکومت پوری طرح سے مستحکم ہو جائے پھر اگر آپ چاہیں تو اسے معزول کر دیجیے گا۔ امام نے جواب دیا: کیا تم اس بات کی ضمانت دیتے ہو کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں گا کہ اسے ہٹا دوں؟! پھر آپ نے قرآن کی ایک آیت بطور دلیل تلاوت فرمائی:[2]

﴿وَمَا كُنتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّينَ عَضُدًا﴾[3]

اور میں ایسا نہیں ہوں کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بناؤں۔

اور خود امیرالمؤمنین علیہ السلام کے الفاظ میں:

«... وَلَوْلَا كَرَاهِيَةُ الْغَدْرِ لَكُنْتُ مِنْ أَدْهَى النَّاسِ...»[4]

---

(1) تاریخ طبری کے حوالے سے منقول ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے ابوسفیان کے جواب میں فرمایا: «واللهِ ما أَرَدتَ بِهذا إلاَّ الفِتْنَةَ وَإِنَّكَ واللهُ طَالَ ما بَغَيْتَ لِلإسلامِ شَرّاً لا حَاجَةَ لَنَا فِي نُصْحِكَ.» رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۳۲۹/۲۸، فٹ نوٹ، اس بیان سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ابوسفیان معاشرے کو داخلی انتشار کی آگ میں جھونکنا چاہتا تھا جس کے نتیجے میں یا تو جناب امیر علیہ السلام قتل ہو جاتے یا اسی اثنا میں وہ موقع غنیمت جانتے ہوئے زمامِ حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔

(2) بحار الانوار ۳۲/۳۷۸-۳۸۶، واقعۂ صفین سے منقول اور امالی شیخ مفید۔

(3) کہف، ۱۸/۵۱۔

(4) نہج البلاغہ/خطبہ نمبر ۲۰۰۔ امیرالمؤمنین علیہ السلام کسی بھی موقع پر فریب کاری و دورنگی سے اپنے اقتدار کے استحکام کا تصور بھی نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب لوگوں نے آپ کو یہ مشورہ دیا کہ عثمانی دور کے عمال کو ان کے عہدوں پر برقرار

...اگر مجھے عیاری و غداری سے نفرت نہ ہوتی تو میں سب سے بڑا سیاستداں ہوتا۔

امیر المؤمنین علیہ السلام ہدف و مقصد کے حصول کے لیے ہر طرح کا ذریعہ استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ وہی راستہ اپناتے تھے جس سے اللہ راضی ہوتا تھا اور وہ ہر حالت میں دین اسلام اور الٰہی قوانین کی پابندی کو فرض سمجھتے تھے۔

لہٰذا عباس اور ابو سفیان کی تجویز کو مسترد کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ امیر المؤمنین علیہ السلام حکومت کو ایک شورائی معاملہ سمجھتے تھے اور یہ دیکھنے کے منتظر تھے کہ اسلامی برادری کس کو منتخب کرتی ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں بھی بیان کیا، امیر المؤمنین علیہ السلام حکومت کو اپنا خدائی حق سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے عباس کی بیعت کو، جس کی کوئی الٰہی بنیاد نہیں تھی قبول نہیں کیا، اور ابو سفیان کی نصرت و مدد کو بھی، جو امیر المؤمنین علیہ السلام کے دعوائے اسلام کے برخلاف تھی، قبول نہیں کیا۔

خطبہ نمبر ۵

عباس اور ابو سفیان کے جواب میں جو خطبہ امیر المؤمنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اس میں بھی ہماری گزشتہ بحثوں کے شواہد و دلائل موجود ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا سے رحلت

رہنے دیا جائے، طلحہ و زبیر کو کوفہ و بصرہ کی امارت دے کر ہمنوا بنا لیا جائے اور معاویہ کو شام کا اقتدار سونپ کر اس کے دنیوی تدبر سے فائدہ اٹھایا جائے تو آپ نے دنیوی مصلحتوں پر شرعی تقاضوں کو ترجیح دیتے ہوئے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ ظاہر بیں لوگ شاطرانہ چالوں اور عیارانہ گھاتوں سے جسے کامیاب و کامران ہوتے دیکھتے ہیں اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور اسے مدبر، بافہم، سیاستداں اور بیدار مغز سمجھنے لگتے ہیں اور جو الٰہی تعلیمات اور اسلامی ہدایات کی پابندی کی وجہ سے چالوں اور ہتھکنڈوں کو کام میں نہ لائے اور غلط طریق کار سے حاصل کی ہوئی کامیابی پر محرومی کو ترجیح دے وہ ان کی نظروں میں سیاست سے ناآشنا اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے کمزور سمجھا جاتا ہے۔

فرمائی تو عباس اور ابوسفیان نے آپؑ سے عرض کیا کہ ہم آپؑ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں جس پر حضرتؑ نے فرمایا:

«اَیُّهَا النَّاسُ! شُقُّوْا اَمْوَاجَ الْفِتَنِ بِسُفُنِ النَّجَاةِ، وَ عَرِّجُوْا عَنْ طَرِیْقِ الْمُنَافَرَةِ، وَ ضَعُوْا عَنْ تِیْجَانِ الْمُفَاخَرَةِ. اَفْلَحَ مَنْ نَّهَضَ بِجَنَاحٍ، اَوِ اسْتَسْلَمَ فَاَرَاحَ. هٰذَا مَآءٌ اٰجِنٌ، وَ لُقْمَةٌ یَّغَصُّ بِهَا اٰكِلُهَا. وَ مُجْتَنِی الثَّمَرَةِ لِغَیْرِ وَقْتِ اِیْنَاعِهَا كَالزَّارِعِ بِغَیْرِ اَرْضِهٖ.»

اے لوگو! فتنہ و فساد کی موجوں کو نجات کی کشتیوں سے چیر کر اپنے کو نکال لے جاؤ، تفرقہ و انتشار کی راہوں سے اپنا رخ موڑ لو، فخر و مباہات کے تاج اتار ڈالو، صحیح طریقۂ عمل اختیار کرنے میں وہ کامیاب ہے جو اٹھے تو پر و بال کے ساتھ اٹھے[1] اور نہیں تو (اقتدار کی کرسی) دوسروں کے لیے چھوڑ دے اور اس طرح خلق خدا کو بدامنی سے راحت میں رکھے۔ یہ (اس وقت طلبِ خلافت کے لیے کھڑا ہونا) ایک گدلا پانی ہے اور ایسا لقمہ ہے جو کھانے والے کے گلوگیر ہو کر رہے گا۔[2] پھلوں کو ان کے پکنے سے پہلے چننے والا ایسا ہے جیسے دوسروں کی زمین میں کاشت کرنے والا۔

اس خطبے کے آغاز میں امامؑ نے ضمنی طور پر واضح کر دیا ہے کہ ابوسفیان اور عباس کی پیشکش، قبائلی فخر و مباہات اور تفرقہ یا تقسیم بندی اور فتنہ پیدا کرنے پر مبنی ہے جس سے موجودہ صورتحال میں دور رہنا ضروری ہے۔ پھر حضرتؑ فرماتے ہیں: اچھا نتیجہ اسی کے لیے ہے جو یا تو پروں

---

[1] ابن ابی الحدید نے اس مقام پر ایک دوسری توجیہ بیان کی ہے جو ظاہر سے دور ہے۔ ان کا کہنا ہے: اس سے مراد وہ فرد ہے جو لوگوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے، اس پرندے کی طرح جو پروں کو پھڑپھڑاتا ہے اور چلا جاتا ہے یا اس شخص کی طرح کہ جو مر جاتا ہے اور سکون پا جاتا ہے۔ رجوع فرمائیں: شرح ابن ابی الحدید ۱/۲۱۳۔

[2] نہج البلاغہ کے اکثر شارحین نے اس مقام پر اس فقرے سے مراد خلافت کو جانا ہے جبکہ کچھ نے اس سے مراد عباس اور ابوسفیان کی پیشکش کو قرار دیا ہے۔ رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۲۸/۲۳۸۔

سے اڑتا ہے- اس جانب کنایہ ہے کہ دوست اور مددگار ہونے کی صورت میں قیام کرے- یا جو مددگاروں کی عدم موجودگی میں ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اپنے خون کی حفاظت کرتا ہے۔

در حقیقت خطبے کے اس حصے میں امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ عباس اور ابو سفیان وہ ساتھی نہیں ہیں جن پر بھروسہ کرتے ہوئے قیام کی تحریک چلائی جاسکے اور ان پر تکیہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کے پہلے حصے کو نافذ کرسکیں۔ اس لیے امیر المؤمنین علیہ السلام مصلحت اسی میں دیکھتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق ہتھیار ڈال دیا جائے اور اپنی اور اپنے اہل بیت علیہم السلام کی حفاظت کی جائے۔

بعد کے حصے میں امام ایک اور کنائے کا استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں: یہ وہ وقت نہیں ہے کہ جب قیام کیا جاسکے کیونکہ اس کے اسباب فراہم نہیں ہوئے ہیں اور کوئی حقیقی مددگار نہیں ہے۔ اسی طرح جناب امیر علیہ السلام ابو سفیان اور عباس کی پیشکش کو قبول کرنے کو غیر کی زمین پر کاشتکاری سے تشبیہ دیتے ہیں جو اس بات کی جانب کنایہ ہے کہ حکومت کے حصول کے لیے ابو سفیان کی مدد لینے کا نتیجہ خود ابو سفیان کو فائدہ پہنچانے کی صورت میں نکلے گا کہ وہ امیر المؤمنین علیہ السلام کی مدد کی آڑ میں عربوں پر حکمرانی کے اپنے دیرینہ خواب کو پورا کرلے نہ یہ کہ امیر المؤمنین علیہ السلام اپنا الٰہی حق حاصل کرنے میں کامیابی کی منزل تک پہنچیں۔

خطبے کے اگلے حصے میں امام نے بتایا کہ کچھ لوگ ان کے عملی اقدام کو لالچ کی علامت سمجھتے ہیں اور ان کی خاموشی کو خوف کی علامت مانتے ہیں: خدا کی قسم! موت سے میرا انس، ماں کی چھاتی سے بچے کے انس سے زیادہ ہے۔ پھر حضرتؑ مزید فرماتے ہیں: میرے دل میں ایک علم دفن ہے کہ اگر میں اُسے زبان پر لے آؤں تو یہ لوگوں کی پریشانی اور مشکلات کا باعث بنے گا۔ اسی لیے امامؑ اس سے زیادہ کچھ اور نہیں فرماتے اور سکوت اختیار کرتے ہیں۔

المختصر یہ کہ عباس اور ابو سفیان کی تجویز کو مسترد کرنا حکمرانی کے معاملے میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کی عدمِ حقانیت کی علامت نہیں ہے اور آپؑ کا خطبہ کنایتاً بیان کرتا ہے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام جس چیز کی تلاش میں ہیں وہ عباس اور ابوسفیان کی پیشکش میں ندارد ہے اسی لیے وہ ان دونوں کی پیشکش ٹھکرا دیتے ہیں۔

سبق ۱۹

خطبہ نمبر ۷۴ کا جائزہ

امیر المومنین علیہ السلام کا ایک اور خطبہ جسے مخالفین اپنے دعوے کے اثبات کی خاطر بڑے شد ومد کے ساتھ پیش کرتے ہیں، وہ خطبہ ہے جسے حضرتؑ نے عثمان سے بیعت اور شش رکنی شوریٰ کے سامنے ارشاد فرمایا تھا:

«لمّا عزموا على بيعة عثمان: لَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّيْ اَحَقُّ النَّاسِ بِهَا مِنْ غَيْرِيْ. وَاللهِ! لَأُسْلِمَنَّ مَا سَلِمَتْ اُمُوْرُ الْمُسْلِمِيْنَ. وَ لَمْ يَكُنْ فِيْهَا جَوْرٌ اِلَّا عَلَيَّ خَاصَّةً ...»

جب لوگوں نے عثمان کی بیعت کا ارادہ کیا تو آپؑ نے فرمایا: تم جانتے ہو کہ مجھے اوروں سے زیادہ خلافت کا حق پہنچتا ہے۔ خدا کی قسم! جب تک مسلمانوں کے

امور کا نظم ونسق برقرار رہے گا اور صرف میری ہی ذات ظلم و جور کا نشانہ بنتی رہے گی، میں خاموشی اختیار کرتا رہوں گا۔[1]

مخالفین کہتے ہیں: اگر امیر المؤمنین علیہ السلام خلافت کو اپنا الٰہی حق سمجھتے تھے تو پھر اسے کسی اور کے سپرد کرنے اور سرِ تسلیم خم کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ دوسری طرف اگر غاصبوں کا عمل خدائی حق کو پامال کرنا ہے تو ایسی صورت میں امام علیہ السلام کے لیے اس بات کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ وہ خلافت پر قبضے کے سبب ہونے والے ظلم کو صرف اپنے اوپر جاری سمجھیں کیونکہ الٰہی حق کا غصب خدا کے دین اور تمام مسلمانوں پر ظلم ہے اور یہ کوئی انفرادی مسئلہ نہیں ہے۔ اس لیے امام علیہ السلام نے جو سرِ تسلیم خم کیا ہے اور خلافت کو کسی اور کے حوالے کر دیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صرف ان پر ظلم ہوا ہے اور جو بات اس انفرادی ظلم کے بارے میں کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کی برتری کو تسلیم نہیں کیا گیا:

«وَ هَذَا اَلْكَلاَمُ يَدُلُّ عَلَىٰ اَنَّهُ (ع) لَمْ يَكُن يَذْهَبُ إِلَىٰ أَنَّ خِلاَفَةَ عُثْمَانَ كَانَتْ تَتَضَمَّنُ جَوْراً عَلَىٰ اَلْمُسْلِمِينَ وَ الإِسْلاَمِ وَ إِنَّمَا كَانَتْ تَتَضَمَّنُ جَوراً عَلَيهِ خَاصَّةً وَإِنَّهَا وَقَعَتْ عَلَىٰ جِهَةِ مُخَالَفَةِ

---

[1] امیر المؤمنین علیہ السلام کا مقصد یہ ہے کہ خلافت میرے مقصدِ حیات کا مرتبہ نہیں رکھتی ہے۔ یہ در حقیقت عام انسانیت کے لیے سکون و اطمینان فراہم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ لہٰذا اگر یہ مقصد کسی بھی ذریعے سے حاصل ہو گیا تو میرے لیے سکوت جائز ہو جائے گا اور میں اپنے اوپر ظلم کو برداشت کر لوں گا۔ دوسرا فقرہ اس بات کی دلیل ہے کہ باطل خلافت سے مکمل انصاف اور اطمینان کی توقع محال ہے لیکن مولائے کائنات علیہ السلام کا منشاء یہ ہے کہ اگر ظلم کا نشانہ میری ذات ہوگی تو برداشت کر لوں گا لیکن اگر عوام الناس ہوں گے اور میرے پاس مادّی طاقت ہوگی تو ہرگز برداشت نہ کروں گا کہ یہ عہدِ الٰہی کے خلاف ہے۔ (مترجم)

الاُوْلٰی لَا عَلٰی جِهَةِ الْفَسَادِ الْكُلِّيِّ وَ الْبُطْلَانِ الْاصْلِيِّ وَ هٰذَا مَحْضُ مَذْهَبِ أَصْحَابِنَا.»[1]

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی علیہ السلام کا ماننا، یہ نہیں تھا کہ عثمان کی خلافت میں اسلام اور مسلمانوں پر ظلم ہوگا بلکہ یہ بطور خاص ان پر انفرادی ظلم ہے اور یہ ظلم ایک زیادہ قابل شخص کے ہوتے ہوئے کسی اور کے انتخاب کا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ عثمان کی خلافت ہی پوری طرح سے باطل ہو اور یہی ہم معتزلیوں کے مذہب کے عین مطابق ہے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام نے خلافت کو نہیں چھوڑا

مذکورہ شبہے کو جانچنے کے لیے پہلا نکتہ جس کا ہم جائزہ لیتے ہیں وہ یہ ہے کہ کیا امیر المؤمنین علیہ السلام حکمرانی کے معاملے میں اپنے الٰہی حق سے دستبراد ہو گئے تھے؟ دوسرے لفظوں میں اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے جن باتوں کا مخالفین سہارا لیتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ امام علیہ السلام اپنی طرف سے خلافت سے دستبراد ہو گئے تھے اور انھوں نے اسے کسی اور کے سپرد کر دیا تھا جبکہ ہمارے مخالفین کو سب سے پہلے تو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ امام علیہ السلام نے حکومت کو کس کے حوالے کیا اور پھر اس کے بعد جاکر یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ اس حکومت کو کسی اور کے حوالے کرتے وقت خود امام علیہ السلام کے علاوہ کسی اور پر ظلم نہیں ہوا تب جاکر اس ظلم کو افضلیت و برتری کی رعایت نہ کرنے پر محمول کرنا چاہیے۔

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ۹/۱۶۷، اسی سے مشابہ: حکومت در اسلام/۱۳۶۔

لیکن معاملے کی حقیقت اس کے برخلاف ہے اور جو کچھ بھی پیش آیا وہ بھی جبر واکراہ کا منہ بولتا ثبوت ہے اس لیے امیرالمؤمنین علیہ السلام کی جانب سے عثمان کی بیعت، جبری بیعت کہلائے گی نہ یہ کہ انھوں نے حکومت اور حکمرانی بہ رضا ورغبت عثمان کے حوالے کر دی ہو۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں دوسرے خلیفہ نے اپنے جانشین کی تقرری ایک چھے رکنی شوریٰ (کونسل) کے حوالے کر دی اور ابوطلحہ انصاری کو پچاس افراد کے ساتھ حکم دیا کہ ان چھے افراد کو تین دن کا موقع دے اور اگر انھوں نے خلیفہ مقرر نہیں کیا تو ان سب کو قتل کر دے یا اگر خلیفہ مقرر ہو گیا لیکن کچھ لوگ اس کی مخالفت کریں تو پھر مخالفت کرنے والے کی گردن اڑا دی جائے۔ آخر کار عبدالرحمن بن عوف اور دوسرے افراد نے بھی تین دن بعد، عثمان کی بیعت کر لی لیکن امیرالمؤمنین علیہ السلام نے پہلے بیعت کرنے سے انکار کیا اور اپنے فضائل و حقانیت کی بنیاد پر اپنا احتجاج درج کروایا۔[1]

ابن ابی الحدید نے اس شوریٰ میں پیش کیے گئے امیرالمؤمنین علیہ السلام کے منتخب بیان کو، جس میں انھیں غدیر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے خلیفہ بنائے جانے کی بات بھی موجود تھی، پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

«یہیں عبدالرحمن بن عوف نے انھیں اپنا بیان جاری رکھنے سے روکا اور کہا: اے علی! یہ گروہ (یا لوگ) سوائے عثمان کے کسی اور پر راضی نہیں ہوں گے اس لیے ہمارے ہاتھوں کو اپنی جانب موڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پھر اس نے ابوطلحہ سے کہا: عمر نے تمھیں کیا حکم دیا ہے؟ اس نے جواب دیا: جو بھی جماعتِ مسلمین کی مخالفت

---

[1] اس واقعے کی تفصیل اس کتاب کے ہدف سے خارج ہے اس لیے اس ضمن میں مزید آگاہی کے لیے اس سے مربوط کتابوں کی جانب رجوع کریں۔ مزید اطلاعات کے لیے رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۳۱/۶۵-۶۹ اور ۳۱۵-۴۰۵، شیعہ اور سنی منابع و مآخذ سے منقول اور ۲۹/۵۷۸، ح ۱۴، شرح ابن ابی الحدید ۱/۱۸۵-۱۹۵۔

کرے اسے قتل کر دوں۔ پھر عبدالرحمٰن نے علی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا: اب جبکہ یہ معاملہ ہے تو پھر بیعت کر لیجیے ورنہ آپ مسلمانوں کے راستے کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کریں گے اور نتیجتاً ہم آپ کے سلسلے میں عمر کے حکم پر عمل کرگزریں گے۔ یہیں پر علی علیہ السلام نے خطبہ (نمبر ۴۷) کے جملے ارشاد فرمائے اور اپنا ہاتھ بڑھایا اور عثمان سے بیعت کی۔ »[1]

جیسا کہ دیکھا جا سکتا ہے: جناب امیر علیہ السلام سب سے پہلے - ماضی کی طرح - حکومت کے معاملے میں اپنی حقانیت پر احتجاج کرتے ہیں اور جان سے مارنے کی دھمکی ملنے کے بعد، خاموش ہو جاتے ہیں اور عثمان سے بیعت پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعہ، جسے خود مخالفین نے بیان کیا ہے، واضح کرتا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام اپنی جان کی حفاظت کی خاطر خاموشی اختیار کرتے ہوئے بیعت کو قبول کرتے ہیں نہ یہ کہ خلافت کو پلیٹ میں سجا کے عثمان کے حوالے کر دیا ہو جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی بھول کی جائے کہ جناب امیر علیہ السلام اپنے لیے الٰہی حق کے قائل نہیں تھے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مخالفین کو اپنے مزعومہ نتائج کو درست ٹھہرانے کے لیے جناب امیر علیہ السلام کے کلام میں موجود لفظ "لَأُسَلِّمَنَّ" کو "میں تسلیم ہوتا ہوں" کے معنوں میں لینا ہو گا جب کہ اس لفظ کا مطلب "میں تسلیم ہو جاؤں گا" بیان کیا گیا ہے۔[2] ساتھ ہی جو بات اس کلام کے صدور سے زیادہ قریب ہے وہ "تسلیم ہو جانا ہے" نہ کہ تسلیم ہوتا ہوں یا اسے چھوڑتے ہوئے میں اسے کسی اور کے سپرد کرتا ہوں۔[3]

---

(۱) شرح ابن ابی الحدید ۶/۱۶۷-۱۶۸ اور اسی سے مشابہ: گزشتہ حوالہ ۱/۱۹۴۔

(۲) معجم مقاییس اللغۃ: الاسلام، ھو الانقیاد۔

(۳) اگرچہ بعض دوسرے نسخوں میں "لَأُسَلِّمَنَّ" بھی آیا ہے لیکن اس بحث کی تحقیق میں جب ہم خطبہ نمبر گیارہ کا جائزہ لیں گے تو وہاں پر مخالفوں کی تمام حسرتیں پانی پانی ہو جائیں گی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے پائیں گے۔

خطبے کا صحیح مفہوم

امیر المؤمنین علیہ السلام کے بیان پر جب ہم توجہ دیں گے تو پائیں گے کہ حضرتؑ فرماتے ہیں: میں اس وقت تک کے لیے تسلیم ہوگیا ہوں جب تک مسلمانوں کے معاملات محفوظ ہوں اور میرے سوا کوئی اور مظلوم نہ ہو۔ اس بیان کا نتیجہ ایک شرطیہ جملہ ہے کہ جو حکومت کو کسی اور کے سپرد کرنے یا دے دینے والے نظریے کے قائل افراد کے ہدف کو پورا نہیں ہونے دیتا۔ یعنی حضرتؑ فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کے امور محفوظ ہوتے ہیں اور صرف میں مظلوم واقع ہوتا ہوں تو حکومت سے چشم پوشی اختیار کرلوں گا اور اسے کسی اور کے حوالے کردوں گا۔ اس جملۂ شرطیہ سے حکومت کو سپرد کردینے کا فرض، مسلمانوں کے امور کے محفوظ رہنے کا فرض اور صرف حضرت کے ہی حق پر ظلم ہونے کا فرض، ان سارے مفروضوں کو بطور نتیجہ حاصل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ منطقی اصطلاح کے لحاظ سے قیاس استثنائی میں "وضعِ مقدم" (پہلی حالت) نتیجہ خیز ہے نہ کہ "وضعِ تالی" (آخری حالت) یعنی اگر اگر مسلمانوں کے امور محفوظ ہوں گے اور صرف امامؑ ہی تیرِ ظلم کا نشانہ ہوں گے تو پھر یقینی طور پر امیر المؤمنین علیہ السلام حکومت کسی اور کے سپرد کردیں گے لیکن حکومت کو سپرد کردینے سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کیا جاسکتا کہ اب چونکہ جناب امیر علیہ السلام نے حکومت سپرد کردی ہے تو پھر یقینی طور پر مسلمانوں کے امور محفوظ اور صرف حضرتؑ کے حق پر ہی ظلم ہوا ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ تفویضِ حکومت دوسری بنیادوں اور شرائط پر کی گئی ہوگی، جیسے زور زبردستی اور ڈرانا دھمکانا وغیرہ۔

اس بیان کے ساتھ، یہ واضح ہوگیا کہ جناب امیر علیہ السلام یہ نہیں کہتے کہ صرف میرے ذاتی حق کی خلاف ورزی کی گئی ہے اور صرف اسے ہی ضائع کیا گیا ہے اور عثمان کی حکومت صحیح تھی اور اس نے مسلمانوں کے امور کو محفوظ رکھا ہے۔ اسی طرح جناب امیر علیہ السلام یہ بھی نہیں فرماتے کہ چونکہ اسلامی معاشرے کے معاملات عثمان کے انتخاب سے صحیح طریقے سے انجام پا رہے ہیں اور اس دوران، صرف میری برتری پر غور نہیں کیا جاتا، اس لیے میں حکومت چھوڑ دیتا ہوں اور اسے عثمان

کے حوالے کرتا ہوں بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ "اگر ایسا ہوگیا" تو میں اپنا حق چھوڑ دوں گا، لہذا یہ خطبہ غاصبوں کی حکمرانی کی تصدیق نہیں کرتا اور جیسا کہ ہم نے کہا، حکومت کو تسلیم کردینے کا حوالہ بھی قطعی نہیں ہے اور بیعت کے لیے عثمان کے سامنے تسلیم ہونے کے معنی بھی خود جناب امیرؑ کے ہی بیان کی روشنی میں سمجھے جائیں گے جس سے صاف طور پر زور زبردستی کیے جانے کا مفہوم سامنے آتا ہے۔

اسلامی معاشرے پر ظلم

اگر ہم یہ مان لیں کہ بات حکومت کے حوالے کرنے کی ہے تو پھر جناب امیرؑ کے بیان کی تاویل کرتے ہوئے اس کی خلافِ ظاہر تشریح کرنا پڑے گی کیونکہ یہ بات تو مخالفین بھی قبول نہیں کریں گے کہ انتہائی قابل اور باصلاحیت شخص کو چھوڑنے سے صرف اس پر ہی ظلم ہوتا ہو اور اس سے معاشرے کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو۔ یہ بیان خاص طور پر امیر المومنینؑ کے معاملے میں زیادہ واضح ہے۔

اہل تسنن کی کتابوں کے مطابق، اس سے پہلے کہ عمر چھ رکنی کونسل بناتے، کچھ لوگ تھے جنھیں عمر کے بعد اسلامی معاشرے کا حکمراں بنانے کی تجویز دی گئی تھی۔ ان افراد سے عمر نے کچھ بات چیت کی؛ من جملہ عمر نے جناب امیرؑ سے کہا:

«... ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَىٰ عَلِيٍ فَقَالَ: لِلّٰهِ أَنتَ، لَوْلا دُعابَةٌ فِيكَ، أَمَا وَاللّٰهِ لَئِنْ وَلِّيتَهُمْ لَتَحْمِلَنَّهُمْ عَلَىٰ الْمَحَجَّةِ الْبَيْضَاءِ وَالْحَقِّ الْوَاضِحِ.»[1]

---

[1] بحار الانوار ۳۱/۳۸۹، شرح ابن ابی الحدید ۱/۱۸۶ سے منقول، یہی مضمون اسی کتاب کے صفحات نمبر ۶۱-۶۵ اور ۳۸۵-۳۹۵ پر بھی اہل تسنن کی مختلف کتابوں سے مذکور ہے، اسی طرح کتاب سلیم/۲۰۵-۲۰۶، ح ۱۱ اور تاریخ

... پھر عمر نے علی کی طرف رُخ کیا اور کہا: خدا آپ کو خوش رکھے! کاش آپ شوخ طبع نہ ہوتے (اگر آپ شوخ طبع نہ ہوتے تو میں آپ حاکم بنا دیتا) خدا کی قسم! بلاشبہ اگر آپ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو لوگوں کی واضح و آشکار حق کے ساتھ رہبری کریں گے۔

اگرچہ جناب امیر علیہ السلام کی ہیبت و طاقت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے [1] اور اگرچہ اسلام کی نصرت و مدد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمراہی میں جناب امیر علیہ السلام کا ماضی شاندار اور سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے (جن میں سے بہت سارے فضائل و مناقب کو اس شورائی نشست میں خود جناب امیر علیہ السلام نے بیان بھی فرمایا ہے) جس کا اعتراف دوست دشمن سبھی کو ہے اور خود عمر کی زبانی ہم کتنی ہی بار « لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَر » کی فریاد سن چکے ہیں جو ہماری یادوں سے محو نہیں ہوئی ہے لیکن عمر کے بہانوں کی کمزوری سے قطع نظر، ہم یہاں جس بات کا ذکر کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ خود عمر نے جناب امیر علیہ السلام کی حکومت سنبھالنے کی صلاحیت اور اس کے شاندار نتائج کا اعتراف کیا ہے اور بقول عمر اگر آپ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو لوگوں کی واضح و آشکار حق کے ساتھ رہبری کریں گے۔ جبکہ جناب عمر کا یہی بیان ایسے موقع پر ہے جب وہ عثمان کے بارے میں اسی گفتگو کے دوران فرماتے ہیں کہ اگر عثمان حاکم ہوتے ہیں (جو کہ ہو بھی گئے) [2] تو وہ بنی امیہ کو لوگوں پر مسلط کر

دمشق، ابن عساکر ۳۲۱/۴۵-۳۲۲، مستدرک، حاکم ۱۵/۴، ح ۴۴۹۱، اسی سے مشابہ مضمون: بحار الانوار ۱۳۸/۳۸، ح ۹۸ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول۔

[1] امیر المومنین علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں: « هَيْهَاتَ! يَمْنَعُنِي مِنْ ذَلِكَ خَوْفُ الْمَوْتِ وَذِكْرُ الْبَعْثِ وَ الْحِسَابِ.... » رجوع فرمائیں، نہج السعادۃ ۸۷/۳، خطبہ ۱۷۳۔

[2] یہ بات خود عمر کے بیان میں بھی موجود ہے اور جس انداز سے چھے لوگوں کی شوریٰ تشکیل دی گئی تھی اس سے یہ واضح تھا کہ عثمان ہی برسر اقتدار آئیں گے۔ « ثم أقبل على عثمان فقال: هيهات إليك. كأني بك قد قلدتك قريش هذا الأمر لحبها إياك. فحملت بني أمية. و بني أبي معيط على رقاب

دیں گے اور انھیں بیت المال کے حصوں میں ترجیح دیں گے اور یہ معاملہ ان کی موت کا باعث بنے گا۔ (۱)

اب کیا یہ مانا جا سکتا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کی برطرفی سے صرف وہی مظلوم ہوں گے اور مسلمانوں کے معاملات پر امن طریقے سے گزر جائیں گے اور وہ بھی ایسے حالات میں کہ جب جناب امیر علیہ السلام کی حکمرانی کا نتیجہ حق کے نفاذ کے سوا کچھ نہیں ؟!

امیر المؤمنین علیہ السلام خود اس بارے میں فرماتے ہیں:

«وَلَعَمْرِي! لَوْ أَنَّ ٱلنَّاسَ حِينَ قُبِضَ رَسُولُ ٱللَّهِ (صَلَّى الله عليه وآله) سَلَّمُوا لَنَا وَاتَّبَعُونَا وَقَلَّدُونَا أُمُورَهُمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِم وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ... فَمَا فَاتَهُمْ مِنَّا أَكْثَرُ مِمَّا مِنَّا فَاتَنَا مِنْهُمْ.» (۲)

مجھے اپنی جان کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے بعد اگر لوگ ہمیں تسلیم کر لیتے، ہماری پیروی کرتے اور اپنے امور کی باگ ڈور ہمارے حوالے کر دیتے تو بلا شبہ وہ آسمان اور زمین سے روزی حاصل کرتے... انھوں نے ہمارا کیا لے لیا جبکہ انھوں نے ہماری وجہ سے بہت کچھ گنوا دیا۔

الناس، و آثرتهم بالفيء، فسارت إليك عصابة من ذؤبان العرب، فذبحوك على فراشك ذبحا، و الله لئن فعلوا لتفعلن، و لئن فعلت ليفعلن. ثم أخذ بناصيته، و قال: فإذا كان ذلك فاذكر قولي، فإنه كائن». عمر نے عثمان کے بارے میں کہا: اگر تم خلیفہ بنے تو بنی امیہ کو لوگوں پر مسلط کر دو گے...

(۱) بحار الانوار ۳۸۹/۳۱۔

(۲) کتاب سلیم /۳۰۷، ح ۲۵، (ابوہریرہ اور ابوالدرداء کے توسط سے جناب امیر علیہ السلام کا معاویہ کو خط) اور اسی سے مشابہ: گزشتہ حوالہ /۲۱۱، ح ۱۱، نہج السعادہ ۳۵۳/۱، خطبہ ۱۱۷، احتجاج ۱۱۱/۱، باب احتجاج سلمان، گزشتہ حوالہ ۱۵۸/۱، باب خطبہ ابی ذر فی الموسم اور گزشتہ حوالہ ۲۸۹/۲، باب احتجاج الحسن علیہ السلام علی من انکر علیہ الصلح، بحار الانوار ۱۲/۳۰۔

ایک دوسرے مقام پر امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

«... أَمَا وَ ٱلَّذِي فَلَقَ ٱلْحَبَّةَ وَ بَرَأَ ٱلنَّسَمَةَ لَوِ ٱقْتَبَسْتُمُ ٱلْعِلْمَ مِنْ مَعْدِنِهِ وَ شَرِبْتُمُ ٱلْمَاءَ بِعُذُوبَتِهِ وَ ٱدَّخَرْتُمُ ٱلْخَيْرَ مِنْ مَوْضِعِهِ وَ أَخَذْتُمُ ٱلطَّرِيقَ مِنْ وَاضِحِهِ وَ سَلَكْتُمْ مِنَ ٱلْحَقِّ نَهْجَهُ لَنَهَجَتْ بِكُمُ ٱلسُّبُلُ وَ بَدَتْ لَكُمُ ٱلْأَعْلاَمُ وَ أَضَاءَ لَكُمُ ٱلْإِسْلاَمُ فَأَكَلْتُمْ رَغَداً وَ مَا عَالَ فِيكُمْ عَائِلٌ وَ لاَ ظُلِمَ مِنْكُمْ مُسْلِمٌ وَ لاَ مُعَاهَدٌ.»

... سنو قسم اس کی جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور انسان کو پیدا کیا! اگر تم علم اس کے اصل منبع سے حاصل کرتے، پانی کو اس کی مٹھاس کے ساتھ پیتے، بھلائی کا ذخیرہ اس کے مقام سے اکٹھا کرتے، ہدایت کا راستہ ہدایت والوں سے لیتے اور حق میں اس کے مقررہ راستے پر چلتے تو تمہارے لیے راستہ مقرر ہو جاتا، (حق کی) علامات ظاہر ہوتیں، اسلام واضح ہو جاتا جس سے تم پر رزق کی فراوانی ہو جاتی اور کوئی فقیر و محتاج نہ ہوتا اور نہ ہی کسی مسلم اور اہل ذمی پر ظلم ہوتا۔

«وَ لَكِنْ سَلَكْتُمْ سَبِيلَ ٱلظَّلاَمِ فَأَظْلَمَتْ عَلَيْكُمْ دُنْيَاكُمْ بِرُحْبِهَا وَ سُدَّتْ عَلَيْكُمْ أَبْوَابُ ٱلْعِلْمِ.... رُوَيْداً عَمَّا قَلِيلٍ تَحْصُدُونَ جَمِيعَ مَا زَرَعْتُمْ وَ تَجِدُونَ وَخِيمَ مَا اجْتَرَمْتُمْ وَ مَا اجْتَلَبْتُمْ ...»[1]

---

[1] کافی ۳۲/۸، خطبہ طالوطیہ، اسی سے مشابہ حضرتؑ کے کلام کو خود مخالفوں کی طرف سے بھی بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ رجوع فرمائیں: حکومت در اسلام/۱۵۱-۱۵۲۔

لیکن تم اندھیرے راستے پر چل پڑے اس لیے تمہاری دنیا تم پر وسیع و عریض ہونے کے باوجود اندھیری ہو گئی اور تم پر علم و دانش کے دروازے بند ہو گئے... کچھ دیر ٹھہر جاؤ عنقریب تم وہی کاٹو گے جو تم نے بویا ہے اور تم ان جرائم اور اعمال کا ضرر محسوس کرو گے جو تم نے کیے ہیں۔

جب امیرالمومنین علیہ السلام دنیا و آخرت میں لوگوں کی سختی کو اپنی بیعت سے دوری کا نتیجہ سمجھتے ہیں تو کیا یہ قبول کیا جا سکتا ہے کہ وہ افضل ترین شخص سے انحراف کو صرف اپنے اوپر ہوا ظلم سمجھیں اور مسلمانوں کے امور کا تحفظ عثمان کی بیعت میں دیکھیں؟!

یہ ساری باتیں اور کلامِ جناب امیر علیہ السلام میں موجود نکات ہماری توجہ زیادہ سے زیادہ امیرالمومنین علیہ السلام کے الفاظ کے مندرجات کی طرف مبذول کراتے ہیں، جنھوں نے حکومت کی منتقلی کو اس بات سے مشروط مانا تھا جو یقیناً جامۂ عمل نہ پہن پائی۔ اس لیے جناب امیر علیہ السلام نے بھی ایسی حکومت کو مسترد کیا ہے۔ اس کے علاوہ، جس سیاق و سباق میں یہ بیان جاری ہوا ہے اس سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ امام اپنے خدائی حق کو غصب کرنے والوں کی دھمکیوں کے سامنے مجبور ہو گئے تھے اور اس بیان میں خلافت کے ان کے حق کو کسی دوسرے کے سپرد کیے جانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر امام اپنے آپ کو خدا اور نبی کی طرف سے حکومت کرنے کا جائز حقدار مانتے تھے اور خود کو منصوص من اللہ والرسول سمجھتے تھے تو پھر آپ نے چھ رکنی کونسل میں کیسے حصہ لیا؟ کیا جناب امیر علیہ السلام کا یہ عمل شوریٰ کے صحیح ہونے اور ان کے کسی بھی الٰہی حق کے نہ ہونے کی علامت نہیں ہے؟ اس کے جواب میں ہم کہیں گے:

اوّلاً: جیساکہ عمر کی موت اور چھ رکنی شوریٰ (کونسل) کی تقرری کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے، امامؑ نے اپنی مرضی سے اس کونسل میں حصہ نہیں لیا تھابلکہ عمر کی طرف سے حضرتؑ کو اس گروہ میں منتخب کیا گیا تھااور خلاف ورزی کی صورت میں ابو طلحہ انصاری[1] کو پچاس افراد کے ساتھ خلاف ورزی کرنے والوں کا سر قلم کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ لہٰذا جو بات واضح ہے وہ جناب امیرؑ کی اس شوریٰ میں شرکت کرنے کی مجبوری اور زور زبردستی ہے کہ کس طرح سے پہرے بٹھا کر اس شوریٰ میں شریک ہونے پر مجبور کیا گیا ہے اور پھر اس صورت میں کہ جہاں پہرے بٹھائے گئے ہوں اور زور زبردستی کا دَور دورہ ہو یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ جناب امیرؑ شوریٰ کی بنیاد کو قبول کرتے تھے اور خلافت کے سلسلے میں اپنے لیے خدائی حق کے قائل نہیں تھے۔

ثانیاً: جناب امیرؑ کی طرف سے ایک بیان میں، اس جبری چھ رکنی شوریٰ میں شریک ہونے کاایک فائدہ ذکر کیا گیا ہے۔

جب جناب امیرؑ شوریٰ میں شریک ہونے کے لیے جارہے تھے تو حضرتؑ کے چچا عباس نے مشورہ دیا کہ وہ اس شوریٰ میں شرکت نہ کریں۔ امامؑ نے اس وقت تو کوئی جواب نہیں دیااور شوریٰ کی مجلس میں حاضر ہوئے اور جیساکہ پہلے ہی سے طے تھا، شوریٰ کا نتیجہ عثمان کے انتخاب

---

[1] زید بن سہل بن اسود بن حرام خزرجی، ابو طلحہ انصاری کے نام سے معروف رسول خداؐ کے مشہور صحابی اور صدر اسلام کے دلاور و نمایاں تیر انداز ہیں جنھوں نے جنگ بدر، جنگ احد اور جنگ خندق میں شرکت کی۔ انھوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایات بھی نقل کی ہیں۔ جس وقت اپنے آخری لمحات میں خلیفہ دوم نے خلافت کے سلسلے میں چھ افراد پر مشتمل شوریٰ تشکیل دی تو ابو طلحہ کو حکم دیا کہ وہ ۵۰ لوگوں کے ساتھ اس گھر کے دروازہ پر بیٹھ جائیں جس میں اہل شوریٰ جمع ہیں اور تین دن تک ان میں سے کسی کو باہر نکلنے اور اندر جانے کی اجازت نہ دیں۔ یہاں تک کہ وہ افراد آپس میں کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرلیں۔

کے حق میں رہا۔ تین دن بعد عباس نے دوبارہ امام سے شکایت کی کہ آپؑ نے اس شوریٰ میں شرکت کیوں کی؟ امام نے جواب دیا:

«يَا عَمِّ! إِنَّهُ قَدْ خَفِيَ عَلَيْكَ أَمْرٌ. أَمَا سَمِعْتَ قَوْلَهُ عَلَى الْمِنْبَرِ: مَا كَانَ اللَّهُ لِيَجْمَعَ لِأَهْلِ هَذَا الْبَيْتِ الْخِلَافَةَ وَ النُّبُوَّةَ؟ فَأَرَدْتُ أَنْ يُكَذِّبَ نَفْسَهُ بِلِسَانِهِ فَيَعْلَمَ النَّاسُ أَنَّ قَوْلَهُ بِالْأَمْسِ كَانَ كَذِباً بَاطِلاً. وَ أَنَّا نَصْلَحُ لِلْخِلَافَةِ. فَسَكَتَ الْعَبَّاسُ.»(۱)

اے چچا! ایک بات آپ سے پوشیدہ ہے۔ کیا آپ نے اس شخص کو منبر پر یہ کہتے ہوئے نہیں سنا تھا کہ "اللہ تعالیٰ اس گھرانے میں خلافت اور نبوت دونوں اکٹھا نہیں کرے گا۔" لہٰذا میں نے چاہا کہ خود اس کی زبان سے اس کو جھوٹا ثابت کردوں اور لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ کل جو کچھ اس نے کہا تھا وہ سراسر جھوٹ تھا اور ہم خلافت کے اس وقت بھی اہل تھے۔ یہ سن کر عباس خاموش ہوگئے۔

جیسا کہ ہم صاف طور پر دیکھ سکتے ہیں، اس طرح جناب امیرؑ نے نہ صرف یہ کہ اپنی جان کی حفاظت کی اور زور زبردستی کے سائے میں اور موت کی دھمکیوں کی وجہ سے اس شوریٰ میں حصہ لیا بلکہ انھوں نے اس شوریٰ میں حصہ لے کر غاصبوں کے مظالم اور مسند خلافت پر قبضے کے سلسلے میں ان کے بیانوں کے خلاف ایک اور ثبوت پیش کردیا۔

(۱) علل الشرائع ۱/۲۰۳، باب ۱۳۴، ح ۲۰۳، بحار الانوار ۳۱/۳۵۵-۳۵۶، ح ۹، اسی سے مشابہ استدلال: کتاب سلیم/۲۰۵، ح ۱۱، احتجاج ۱/۱۸۹، جناب عمر کا مذکورہ بیان اس وقت کا ہے جب وہ سقیفہ بنی ساعدہ کے حادثے کے بعد حضرتؑ سے جبراً بیعت لینے پر مصر تھے۔

سبق ۲۰

خطبہ نمبر ۹۲ کا جائزہ-۱

امیرالمؤمنین علیہ السلام کا ایک اور خطبہ جس کا حوالہ مخالفین دیتے ہیں؛ اس وقت کا ہے جب عثمان کو قتل کردیا جاتا ہے اور لوگ آپ کے ہاتھوں پر بیعت کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کے اس کلام کو بنیاد قرار دیتے ہوئے مخالفین، شیعوں کے اُس عقیدے پر اعتراض کرتے ہیں جس کی رو سے حکومت کے معاملے میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کی خلافت پر نصّ پائی جاتی ہے اور جناب امیر علیہ السلام منصوص من اللہ والرسول اور خلیفۂ بلافصل ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کا خطبہ کچھ اس طرح ہے:(جب قتلِ عثمان کے بعد آپ کے ہاتھ پر بیعت کا ارادہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا:)[1]

«دَعُوْنِیْ وَ الْتَمِسُوْا غَیْرِیْ. فَاِنَّا مُسْتَقْبِلُوْنَ اَمْرًا لَهٗ وُجُوْهٌ وَ اَلْوَانٌ. لَا تَقُوْمُ لَهُ الْقُلُوْبُ. وَ لَا تَثْبُتُ عَلَیْهِ الْعُقُوْلُ. وَ اِنَّ الْاٰفَاقَ قَدْ اَغَامَتْ. وَ الْمَحَجَّةَ قَدْ تَنَكَّرَتْ. وَ اعْلَمُوْٓا اَنِّیْ اِنْ

---

[1] نہج البلاغہ کے مختلف نسخوں کے لحاظ سے اس خطبے کا نمبر مختلف بھی ہو سکتا ہے جیسے خطبہ نمبر ۹۰۔

اَجَبْتُكُمْ رَكِبْتُ بِكُمْ مَا اَعْلَمُ، وَلَمْ اُصْغِ اِلٰى قَوْلِ الْقَآئِلِ وَعَتْبِ الْعَاتِبِ، وَ اِنْ تَرَكْتُمُوْنِیْ فَاَنَا كَاَحَدِكُمْ، وَ لَعَلِّیْۤ اَسْمَعُكُمْ وَ اَطْوَعُكُمْ لِمَنْ وَّلَّیْتُمُوْهُ اَمْرَكُمْ، وَ اَنَا لَكُمْ وَزِیْرًا، خَیْرٌ لَّكُمْ مِنِّیْ اَمِیْرًا! »

مجھے چھوڑ دو اور (اس خلافت کے لیے) میرے علاوہ کوئی اور ڈھونڈ لو۔ ہمارے سامنے ایک ایسا معاملہ ہے جس کے کئی رخ ہیں۔ جسے نہ دل برداشت کر سکتے ہیں اور نہ عقلیں اسے مان سکتی ہیں۔ (دیکھو!) اُفق عالم پر گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ راستہ پہچاننے میں نہیں آتا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میں تمہاری اس خواہش کو مان لوں تو تمہیں اس راستے پر لے چلوں گا جو میرے علم میں ہے اور اس کے متعلق کسی کہنے والے کی بات اور کسی ملامت کرنے والے کی سرزنش پر کان نہیں دھروں گا اور اگر تم میرا پیچھا چھوڑ دو تو پھر جیسے تم ہو ویسا میں ہوں اور ہو سکتا ہے کہ جسے تم اپنا امیر بناؤ اس کی میں تم سے زیادہ سنوں اور مانوں اور میرا (تمہارے دنیوی مفاد کے لیے) امیر ہونے سے وزیر ہونا بہتر ہے۔[1]

---

[1] جب عثمان کے قتل ہو جانے سے مسند حکومت خالی ہوئی تو مسلمانوں کی نظریں امیرالمومنین علیہ السلام کی طرف اٹھنے لگیں جن کی سلامت روی، اصول پرستی اور سیاسی بصیرت کا اس طویل مدت میں انھیں بڑی حد تک تجربہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ لوگ متفقہ طور پر آپؑ کے دستِ حق پرست پر بیعت کے لیے اس طرح ٹوٹ پڑے جس طرح بھولے بھٹکے مسافر دور سے منزل کی جھلک دیکھ کر اس کی سمت لپک پڑتے ہیں۔ مگر امیرالمومنین علیہ السلام نے آمادگی کا اظہار نہ فرمایا۔ جب اصرار حد سے بڑھا تو اس موقع پر یہ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اس امر کو واضح کیا ہے کہ اگر تم مجھے دنیوی مقاصد کے لیے چاہتے ہو تو میں تمہارا آلہ کار بننے کے لیے تیار نہیں، مجھے چھوڑ دو اور اس مقصد کے لیے کسی اور کو منتخب کر لو جو تمہاری توقعات پوری کر سکے اور اگر یہ ٹھان چکے ہو کہ میرے ہاتھوں پر بیعت کیے بغیر نہ رہو گے تو پھر یاد رکھو کہ چاہے تمہاری پیشانیوں پر بل آئے اور چاہے تمہاری زبانیں میرے خلاف کھلیں، میں تمھیں حق کی راہ پر لے چلنے پر مجبور کر دوں گا اور حق کے معاملے میں کسی کی ◆

اس بیان کا حوالہ دیتے ہوئے مخالفین کہتے ہیں: اگر جناب امیر علیہ السلام خلافت و حکومت کو اپنا خدائی حق سمجھتے تھے تو پھر لوگوں کی دعوت کو رد کرنا اور ان کی بیعت لینے سے انکار کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس بارے میں ابن ابی الحدید کا کہنا ہے:

«وَ هٰذَا الكَلامُ يَحمِلُهُ أصحابُنا عَلى ظاهِرِهِ و يَقُولُونَ إنَّه(عليه السلام) لَم يَكُن مَنصُوصاً عَلَيهِ بِالإمامَةِ مِن جَهَةِ الرَّسول(صلى الله عليه و آله) و إن كانَ أولَى النّاسِ بِهِ وَ أحَقَّهُم بِمَنزِلَتِها»

ہمارے ہم فکر ساتھی (معتزلہ) اس کلام کو اس کے ظاہر پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے امامت کے لیے مقرر نہیں ہوئے تھے، اگرچہ آپ، لوگوں میں امامت کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔

«لأنَّه لَو كانَ مَنصُوصاً عَلَيهِ بِالإمامَةِ مِن جَهَةِ الرَّسُولِ(صلى الله عليه و آله) لَما جازَ لَهُ أن يَقُولَ «دَعُونى وَ التَمِسُوا غَيرى» وَلا أن يَقُولَ: «وَلَعَلّى أسمَعُكُم وَ أطوَعُكُم لِمَن وَلَّيتُمُوهُ أمرَكُم» وَلا أن يَقُولَ: «وَ أنَا لَكُم وَزِيراً خَيرٌ لَكُم مِنّى أمِيراً.» [1]

کیونکہ اگر آپ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے امامت کے لیے مقرر ہوتے تو پھر آپ کا یہ کہنا جائز نہ ہوتا کہ "مجھے چھوڑ دو اور (اس خلافت کے لیے) کسی اور کو ڈھونڈ لو" یا آپ کا یہ

رو رعایت نہیں کروں گا۔ اس پر بھی اگر بیعت کرنا چاہتے ہو تو اپنا شوق پورا کر لو۔ امیر المومنین علیہ السلام نے ان لوگوں کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا تھا بعد کے واقعات اس کی پوری پوری تصدیق کرتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے ذاتی اغراض و مقاصد کے پیش نظر بیعت کی تھی، جب انھیں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو بیعت توڑ کر الگ ہو گئے اور بے بنیاد الزامات تراش کر حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

(۱) شرح ابن ابی الحدید ۷/ ۳۳-۳۴۔

کہنا کہ "ہوسکتا ہے کہ جسے تم اپنا امیر بناؤ اس کی میں تم سے زیادہ سنوں اور مانوں" یا پھر آپؑ کا یہ فرمانا کہ "میرا وزیر ہونا، امیر ہونے سے بہتر ہے۔"

یا ایک اور صاحب فرماتے ہوئے ملتے ہیں:

« ... جس وقت عثمان کو قتل کردیا جاتا ہے، ایسے نازک موقع پر بھی مسلمان عمومی طور پر بیعت کے لیے بے تابی اور سوز و گداز کے ساتھ آپؑ کے درِ دولت کی طرف دوڑتے ہیں اور آپؑ بیعت قبول کرنے سے انکار کردیتے ہیں اور منصب خلافت کو ٹھکرادیتے ہیں! جب کہ اگر خلافت آپؑ کا حق تھا، یا کم از کم اگر آپؑ خود کو اس کے لیے سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے تو اب جب تمام رکاوٹیں برطرف ہوگئی تھیں اور حق اپنے حقدار کو مل رہا تھا تو آپ کو اپنا حق لے لینا چاہیے تھا۔ یا اگر اپنے حق کو واپس لینے میں کوئی جلدی نہیں کررہے تھے اور مقدمات کا سہارا نہیں لے رہے تھے تو کم سے کم اسے قبول کرنے سے تو انکار نہ کرتے!! »[1]

دونوں صورتوں میں کلام جناب امیر علیہ السلام کی تأویل

مذکورہ اعتراض کے جواب میں، سب سے پہلے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ امیرالمومنین علیہ السلام کے اس خطبے کی دونوں صورتوں میں اس کے ظاہر سے تأویل نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی ہم خلافت کو جناب امیر علیہ السلام کا خدائی حق سمجھیں یا پھر آپؑ کو حکمرانی کے لحاظ سے افضل مانیں؛ دونوں ہی صورتوں میں یہ نہیں مانا جاسکتا کہ جناب امیر علیہ السلام خلافت کو قبول کرنے سے انکار کررہے تھے۔

یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام خلافت پر اپنے تمام تر اصرار اور اپنی افضلیت پر اس قدر زور دینے کے باوجود؛ اب جبکہ لوگ خود ہی بیعت کے لیے ٹوٹے پڑرہے ہوں، جناب

---

(۱) حکومت در اسلام/۱۶۰-۱۶۱۔

امیر علیہ السلام اپنے تمام تر اصرار اور خلافت کے لیے مکمل اہلیت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیں؟!

جیسا کہ ہم جانتے ہیں: امیر المومنین علیہ السلام پچھلی دو حکومتوں سے کبھی راضی نہیں رہے اور ہمیشہ خود پر ہو رہے ظلم و ستم اور اپنے حق کے استحصال کی فریاد کرتے رہے۔ ابن ابی الحدید کے مطابق ، آپؑ کی اپنے حق کے غاصبوں کے خلاف شکایت تواتر کے ساتھ تاریخ میں درج ہے۔[1] اب چاہے ہم اس حق خواہی کے مأخذ کو الٰہی نص سمجھیں یا حکمرانی میں آپؑ کی افضلیت کو قرار دیں، ہر حال میں اور دونوں ہی صورتوں میں یہ بات مسلّم ہے کہ جناب امیر علیہ السلام گزشتہ دونوں ہی خلفاء سے ناراض تھے اور ان کی خلافت کو غصبی اور ناجائز مانتے تھے۔ یہ مسئلہ اس قدر واضح ہے کہ اسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ (ہم نے گزشتہ اسباق میں اس ناراضگی کے کچھ معاملات کو ذکر کیا ہے اور بعض دوسرے معاملات کو، جن میں گزشتہ خلفاء سے آپؑ کی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے، ہم اس سبق میں پیش کریں گے۔) ان سب باتوں کے پیش نظر خلافت قبول کرنے سے آپؑ کے انکار کرنے کا معاملہ قابل قبول نہیں ہے۔ یا تو ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ جناب امیر علیہ السلام نے اپنی افضلیت کا دعویٰ ترک کر دیا ہے اور وہ دوسروں کو زیادہ قابل سمجھتے ہیں جو کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہے؛ یا پھر کوئی اور اہم مسئلہ ہے کہ اس صورت میں اگر افضلیت کا دعوی ترک کرنا جائز ہے تو پھر منصوصیت کے دعوے سے بھی چشم پوشی جائز ہو جائے گی۔ مرحوم علامہ مجلسی کے بقول:

«وَ لاَ يُخْفِي عَلَيَ اَللَّبِيبُ أَنَّهُ بَعْدَ اَلْإِغْمَاضِ عَنِ اَلْأَدِلَّةِ اَلْقَاهِرَةِ وَ النُّصُوصِ اَلْمُتَوَاتِرَةِ لاَ فَرْقَ بَيْنَ الْمَذْهَبِينَ فِي وُجُوبِ اَلتَّأْوِيلِ وَ لاَ يَسْتَقِيمُ الْحَمْلُ عَلَيَ ظَاهِرِهِ إِلاَّ عَلِيٌّ اَلْقَوْلُ بِأَنَّ إمامته(ع)

---

[1] رجوع فرمائیں: چھٹا سبق۔

كَانَتْ مَرْجُوحَةً وَ أَنَّ كَوْنَهُ وَزِيراً أُولي مَنْ كَوْنَهُ أَمِيراً وَ هُوَ يُنَافِي اَلْقَوْلَ بِالتَّفْضِيلِ اَلَّذِي قَالَ بِهِ.»

عقلمند لوگوں کے لیے یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے کہ ٹھوس دلائل اور متواتر نصوص کو بھی اگر نظر انداز کردیا جائے تب بھی حضرتؑ کے کلام کی تاویل کرنا ضروری ہوگا اور اس بارے میں دونوں مذاہب کے درمیان کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ اس مقام پر جناب امیرؑ کے کلام کو اس کے ظاہر پر حمل کرنا درست نہیں ہے جب تک کہ یہ نہ مان لیا جائے کہ آپؑ کی امامت باترجیح ہے اور آپؑ کی وزارت آپؑ کی امارت سے بہتر ہے اور یہ بیان خود ابن ابی الحدید کے دعوائے افضلیت سے متصادم ہے۔

« فَإِنَّه(ع) إِذا كَانَ أَحَقَّ الإِمامِةِ وَ بَطَلَ تَفْضِيلُ الْمَفْضُولِ عَلَىٰ مَا هُوَ الْحَقَّ وَ اخْتَارَهُ أَيضاً كَيفَ يَجُوزُ لِلنَّاسِ أَنْ يَعْدِلُوا عَنْهُ إِلَىٰ غَيْرِهُ وَ كَيْفَ يَجُوزُ لَه ع أَن يَأْمُرَ النَّاسَ بِتَرْكِهِ وَ العُدولِ عَنْهُ إِلَىٰ غَيْرِهُ مَعَ عَدَمِ ضَرُورةٍ تَدْعُو إِلَىٰ تَرْكِ الإِمَامِةِ وَ مَعَ وُجُودِ اَلضَّرُورةِ كَمَا جَازَ تَرْكُ اَلإِمَامِةِ الْوَاجِبَةِ بِالدَّلِيلِ جَازَ تَرْكُ الْإِمَامِةِ الْمَنْصُوصَ عَلَيْهَا فَالتَّأْوِيلُ وَاجِبٌ عَلَىٰ التَّقديرين وَلاَ نَعْلَمُ أَحداً قَالَ بِتَفْضيلِ غَيْرِهِ عَلَيْهِ وَ رُجحَانُ اَلعُدُولِ إِلَىٰ أَحَدٌ سِوَاهُ فِي ذَلِكَ اَلزَّمَانِ.»[1]

چنانچہ اس لحاظ سے کہ جناب امیرؑ امامت کے لیے سب سے لائق فرد ہیں اور وہ فاضل پر مفضول کی برتری کو باطل جانتے ہیں اور حق بھی یہی ہے اور ابن ابی الحدید بھی

---

[1] بحار الانوار ۳۲/۳۷۔

(حضرتؑ کی افضلیت) کا معترف ہے تو پھر ایسی صورت میں کس طرح جائز ہے کہ وہ لوگ آپؑ سے روگردانی کریں اور کیسے اس بات کا امکان پایا جاسکتا ہے کہ حضرتؑ لوگوں کو حکم دیں کہ وہ انھیں چھوڑ دیں اور کسی دوسرے شخص کو منتخب کریں۔ لہٰذا دونوں ہی صورتوں میں حضرتؑ کے کلام کی تأویل کرنا لازمی ہے اور ہم کسی ایسے شخص کو اس زمانے میں نہیں جانتے جو جناب امیر علیہ السلام پر کسی دوسرے شخص کی برتری کا عقیدہ رکھتا ہو اور آپؑ کے علاوہ کسی اور کی طرف رُخ کرنے کو پسند کرتا ہو۔

کچھ دوسرے شواہد

اس بات کے علاوہ کہ اس کتاب میں ہمارا بنیادی مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد پیش آنے والے واقعات کے ساتھ جنابِ امیر علیہ السلام کی ناراضگی کو ظاہر کیا جائے جسے خود انھوں نے اپنی زبانی ارشاد فرمایا ہے جس کی تائید نہج البلاغہ کے خطبوں سے ہوتی ہے، جیسے خطبہ نمبر ۶، ۳، ۱۷۲ اور خطبۃ الوسیلہ۔ اسی طرح آپ کے خطوط بھی ہیں جیسے نہج البلاغہ کا خط نمبر ۲۸ وغیرہ ہمارے بیان کی تائید میں موجود ہے اور ہمارے نقطۂ نظر کو واضح و آشکار کرتا ہے لیکن یہاں ہم حضرتؑ کے کچھ اور بیاناتؑ و فرمودات کو پیش کرتے ہیں تاکہ آپؑ کے الٰہی حق پر غاصبانہ قبضہ جمانے والوں سے ان کی ناراضگی کی حقیقت پر شک و شبہے اور اعتراض کی بدلیاں نہ چھانے پائیں اور روز روشن کی طرح بات صاف و شفاف رہے کہ جناب امیر علیہ السلام غاصبینِ خلافت و حکومت سے کسی طور راضی نہ تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جائے کہ جناب امیر علیہ السلام کے اِن بیانات سے جو شائبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ کچھ لوگ جو یہ گمان کر لیتے ہیں کہ حضرتؑ اپنے ان بیانات سے اپنی افضلیت و برتری کو بیان کرنا چاہتے ہیں ان کے بھی مزعومہ خیالات کی تردید ہو جائے اور خلافت کو قبول کرنے سے آپ کے انکار کی تأویل ضرورت پہلے سے زیادہ آشکار ہو جائے۔

جس وقت جناب عثمان اپنے انجام کو پہنچے اور لوگوں نے جناب امیر علیہ السلام کی بیعت کر لی تو حضرتؑ نے ایک خطبہ دیا جس کے ایک حصے میں آپ نے فرمایا:

«... أَلاَ وَ قَدْ سَبَقَنِي إِلَى هَذَا الأَمْرِ مَنْ لَمْ أُشْرِكْهُ فِيهِ وَ مَنْ لَمْ أَهَبْهُ لَهُ وَ مَنْ لَيْسَتْ لَهُ مِنْهُ نَوْبَةٌ إِلَّا بِنَبِيٍّ يُبْعَثُ أَلَا وَ لَا نَبِيَّ بَعْدَ مُحَمَّدٍ(ص) أَشْرَفَ مِنْهُ عَلَى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ.»

...آگاہ رہو کہ! (حکومت کے) اس معاملے میں اس نے مجھ پر سبقت کی جسے میں نے (خود کے ساتھ) اس میں شریک نہیں کیا تھا اور نہ ہی (حکومت کا کوئی حصہ) اس کے سپرد کیا تھا اور نہ ہی اس عہدے میں اس کی کوئی باری آنے والی تھی مگر یہ کہ کوئی پیغمبر آتا (اور اسے اس کے بارے میں خبر دیتا) (یا اس کے لیے کوئی توبہ نہیں ہے مگر یہ کہ کوئی پیغمبر مبعوث ہو اور اس کی توبہ کی قبولیت کی خبر دے) لیکن جان لو کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے (یعنی نہ ہی اس کی کوئی باری آنے والی ہے اور نہ ہی اس کی کوئی توبہ قبول ہونے والی ہے) اس کی وجہ سے (ایسے مقام پر غاصبانہ قبضہ جمانے کی وجہ سے جو اس کے لیے نہیں تھا) ہلاکت کی کھائی اور آگ کے دہانے تک آگیا اور اسے جہنم کی آگ نے نابود کر ڈالا۔

«... وَإِنِّي لَأَخْشَى أَنْ تَكُونُوا عَلَى فَتْرَةٍ مِلْتُمْ عَنِّي مَيْلَةً كُنْتُمْ فِيهَا عِنْدِي غَيْرَ مَحْمُودِي الرَّأْيِ وَلَوْ أَشَاءُ لَقُلْتُ "عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفَ" سَبَقَ فِيهِ الرَّجُلَانِ وَقَامَ الثَّالِثُ كَالْغُرَابِ هَمُّهُ بَطْنُهُ ...»(۱)

... مجھے اندیشہ ہے کہ اب بھی تم اسی نادانی کا شکار ہو جس کی وجہ سے تم نے مجھ سے منہ موڑ لیا (اور دوسروں کی جانب مائل ہو گئے تھے) کہ میرے نزدیک تم ان میں سراہنے کے قابل نہیں ہو (اور تمہارا یہ مجھ کو پیٹھ دکھانا ایک آنکھ نہ بھایا تھا) اور اگر میں کچھ کہنا چاہوں تو یہی کہوں گا کہ "خدا تمہاری گزشتہ لغزشوں سے درگزرے" کہ ماضی میں اس مقام کے لیے دو لوگوں نے خلافت ہتھیانے میں سبقت کی اور تیسرا ایک کوّے کی طرح جو ہمیشہ اپنے پیٹ کے بارے میں سوچتا رہتا ہے، ایسا کرنے کے لیے اٹھا...۔

ان شواہد و دلائل میں سے ایک اور، معاویہ کا وہ اعتراف نامہ ہے جس میں وہ حضرتؑ کے بارے میں اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ جناب امیرؑ اپنے سے پہلے والے خلفاء سے راضی نہیں تھے۔ معاویہ کا جناب امیرؑ کے نام یہ خط خود ان کے جوابی خط سے مہر تائید حاصل کرتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ معاویہ کی بات بالکل درست ہے۔ جناب امیرؑ کا جوابی خط، نہج البلاغہ کا خط نمبر ۲۸ ہے جسے ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ معاویہ نے اس خط میں لکھا ہے:

«... وَ ما مِنْ هولاءِ الاّ مَنْ بَغَيْتَ عَلَيْهِ وَ تَلَكَّأْتَ فى بيْعَتِهِ حَتى حُمِلْتَ اِلَيْهِ قَهْراً تُساقُ بِخَزائِمِ الاِقْتِسارِ كَما يُساقُ الْفَحْلُ الْمَخْشُوشُ ...»(۲)

---

(۱) کافی ۶۸/۸، ح ۲۳، اسی سے مشابہ: نہج البلاغہ/ خطبہ ۱۷۸، بحار الانوار ۵۸۳/۲۹-۶۳۶، سنی منابع و ماخذ سے منقول، گزشتہ حوالہ: ۹/۳۲-۱۶، دوسرے منابع سے منقول اور شرح ابن ابی الحدید ۶۱/۱۰-۶۲، نہج السعادہ ۱۸۹/۱-۱۹۱-۱۹۶-۲۰۰، خطبے: ۵۵-۵۶-۵۷-۵۸ اور ارشاد، مفید ۲۳۴/۱، فصل: و من کلامہ فی الدعا الی نفسہ....۔

(۲) شرح ابن ابی الحدید ۱۸۶/۱۵، بحار الانوار ۶۳۲/۲۹، ح ۴۷، تاریخ ابن اعثم کوفی سے منقول، گزشتہ حوالہ ۶۲/۳۳۔

... ان تینوں خلفاء میں سے کوئی ایسا نہیں گزرا جس پر تم نے حملہ نہ کیا ہو، ان سے دشمنی نہ برتی ہو اور ان کی بیعت کرنے سے انکار نہ کیا ہو یہاں تک کہ تمہیں بیعت کے لیے زور زبردستی سے کھینچ کر لایا گیا۔ بندھی رتی سے تمہیں ایسے کھینچا جا رہا تھا جیسے نکیل پڑے اونٹ کو کھینچا جاتا ہے...۔

اسی سے ملتے جلتے مضمون کے ساتھ معاویہ نے اپنے ایک دوسرے خط میں جناب امیر علیہ السلام کو لکھا ہے:

«... فَكُلُّهُمْ حَسَدْتَ وَعَلَى كُلِّهِم بَغَيْتَ عَرَفْنا ذلِكَ في نَظَرِكَ الشَّزْرِ وقَوْلِكَ الهجرُ وَتَنَفُّسِكَ الصُّعَداءُ وإِبْطائِكَ عَنِ الخُلَفاءِ ...»[1]

تمام خلفاء سے تم نے حسد کیا اور ہر ایک کے خلاف شورشیں کیں، اسے ہم نے تمہاری ناامید آنکھوں، پرتشدد تقریر، گھٹی گھٹی سی سانسوں اور خلفاء کی بیعت میں تاخیر سے جانا ہے۔

امیر المومنین نے معاویہ کے اس خط کے جواب میں لکھا:

«وَ ذَكَرْتَ حَسَدِي ٱلْخُلَفَاءَ وَ إِبْطَائِي عَنْهُمْ وَ بَغْيِي عَلَيْهِمْ فَأَمَّا ٱلْبَغْيُ فَمَعَاذَ ٱللَّهُ أَنْ يَكُونَ وَ أَمَّا ٱلإِبْطَاءُ عَنْهُمْ وَ الْكَرَاهِيَةُ لِأَمْرِهِمْ فَلَسْتُ أَعْتَذِرُ إِلَى ٱلنَّاسِ مِنْ ذَلِكَ ...»[2]

---

(1) شرح ابن ابی الحدید ۱۵/۷۴، بحار الانوار ۳۳/۱۰۸، کتاب واقعہ صفین سے منقول، نصر بن مزاحم۔ ابن ابی الحدید نے خط نمبر ۲۸ کے ذیل میں اپنے استاد نقیب ابو جعفر کے حوالے سے ان دونوں خطوط کے ایک دوسرے سے الگ ہونے کے بارے میں وضاحت پیش کی ہے۔ رجوع فرمائیں: شرح ابن ابی الحدید ۱۵/۱۸۷۔

(2) شرح ابن ابی الحدید ۱۵/۷۴، بحار الانوار ۳۳/۱۱۲-۱۱۳۔

تم نے خلفاء سے میرے حسد، ان سے (بیعت میں) تاخیر اور ان کے خلاف میری بغاوت کی بات کی۔ جہاں تک شورش کی بات ہے تو اس سے خدا کی پناہ (میں نے ایسا کبھی نہ کیا) رہی بات ان سے اتفاق کرنے میں میری تاخیر اور ان کے کام سے ناراضگی کی تو میں اس سلسلے میں، میں کسی سے معافی نہیں مانگوں گا۔

جیسا کہ ہم اس طرح کے معاملات [1] میں دیکھتے ہیں، جناب امیر علیہ السلام گزشتہ خلفاء اور ان کے دور اقتدار کے بارے میں اپنی ناراضگی کی تصدیق کرتے ہیں اور اس معاملے میں معاویہ کی باتوں کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ یہ سب ہمارے عقائد کی تصدیق کرتے ہیں اور ہمارے دعوے کو محکم تائید فراہم کرتے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام نے سابقہ حکمرانوں کے پورے دورِ حکومت و خلافت میں اپنی ناراضگی کے اظہار اور حکومت کے معاملے میں اپنی حقانیت کے اعلان سے کبھی بھی ہاتھ نہیں کھینچا اور ہمیشہ اس کا اظہار کرتے رہے۔ [2] جناب امیر علیہ السلام کی اس مخالفت و ناراضگی کی بنیاد کو چاہے ہم ان کا الٰہی حق یا پھر چاہے ان کی افضلیت مانیں، شروعاتی دور سے ہی ان کی اس قدر مخالفت کے پیش نظر کسی طور پر یہ قبول نہیں کیا جاسکتا کہ آپ کسی رکاوٹ کے بغیر خلافت کو قبول کرنے سے انکار کردیں گے۔ لہذا، ہمیں جناب امیر علیہ السلام کے بیان کی صحیح تاویل کرنی چاہیے۔ اس لحاظ سے ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ لوگوں پر حجت تمام کرنے اور ان کے شدید اصرار کو ظاہر کرنے کے لیے شروعات میں حکومت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں تاکہ لوگوں پر ثابت ہوجائے کہ خود انھوں نے جناب امیر علیہ السلام کو حکومت قبول کرنے پر مجبور کرکے ان سے بیعت کی ہے۔ لہذا، حضرت کے احکامات کی

---

[1] اسی سے ملتے جلتے معاملات سے آگاہی کے لیے رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۲۹/باب شکایتہ من الغاصبین، گزشتہ حوالہ ۳۳/باب ماکتب علیہ السلام الی معاویہ۔

[2] اس بارے میں ہمارے مخالف افراد بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ رجوع فرمائیں: شرح ابن ابی الحدید ۱۷/۲۵۵-۲۵۶، خط نمبر ۶۴ کے ذیل میں، اسی طرح رجوع فرمائیں: حکومت در اسلام/۱۴۷-۱۴۸، بحار الانوار سے منقول ۲۹/۵۷۸، ح ۱۴، امالی مفید سے منقول۔

خلاف ورزی کرنے اور بیعت کو توڑنے کا کوئی عذر ان کے پاس باقی نہیں رہ جائے گا اور ایسا کرنے پر وہ قابل مذمت اور سزا کے مستحق ہوں گے۔ اگلے سبق میں ہم اپنے نظریے کو ٹھوس دلائل کے ساتھ ثبوت کے طور پر پیش کریں گے۔[1]

---

[1] اس پورے بیان کا ایک اور پہلو بھی قابلِ فرض ہے اور وہ یہ کہ گزشتہ خلفاء کی حکمرانی کے نتیجے میں لوگ جناب امیر علیہ السلام کی مطلوبہ صورت حال سے بہت دور ہو گئے تھے۔ خاص طور پر عثمان کے زمانے میں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیشتر اصحاب دنیا پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ نیز حکومتی معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت و سنت کو پسِ پشت ڈال دیا گیا تھا اور سابقہ حکمرانوں نے معاشرے کا انتظامی نظام بدل دیا تھا۔ ایسی صورتحال میں عوام امیر المؤمنین علیہ السلام کی حکمرانی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا امام علیہ السلام نے فرمایا: اب جبکہ معاملات ہاتھ سے نکل چکے ہیں تو میری حکومت تمہارے لیے مشکل کے سوا کچھ نہیں ہوگی اور تم نہیں جانتے کہ میں اپنی حکومت کو گزشتہ خلفاء کی سیرتوں کی بنیاد پر تشکیل نہیں دوں گا۔ جن دنیوی مفادات کے تم خواہاں ہو وہ میری حکومت میں تمہارے ہاتھ آنے والے نہیں ہیں اس لیے میرا تمہارے حق میں وزیر رہنا اس بات سے بہتر ہے کہ تمہارا امیر بنوں۔

سبق ۲۱

خطبہ نمبر ۹۲ کا جائزہ-۲

پچھلے سبق میں ہم نے بیان کیا: امیر المؤمنین علیہ السلام کے اس وقت کے خطبے کی، جب لوگ آپؑ کی بیعت کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے، تأویل بہر صورت ضروری ہے اور پھر خطبے کے کس حصے پر اعتراض ہے اسے معین کرنا بھی ضروری ہے۔ ساتھ ہی حضرتؑ کا ارشاد فرمایا ہوا یہ خطبہ بظاہر نصّ کے ہوتے ہوئے تعارض کا شکار نظر آتا ہے اور خطبے کا ظاہر جناب امیر المؤمنین علیہ السلام کی خلافت پر موجود محکم شواہد و دلائل سے متصادم دکھائی پڑتا ہے جبکہ اگر اس خطبے کی تأویل حضرت کی افضلیت کے لیے کی جائے تب بھی درست نہیں ہے۔ اس سبق میں، ہم وہ شواہد پیش کریں گے جو واضح کرتے ہیں کہ امیر المؤمنین علیہ السلام نے، لوگوں پر حجت تمام کرنے کے لیے پہلے حکومت کو قبول کرنے سے انکار کیا تاکہ خود ان پر ان کے اصرار کو واضح کیا جائے اور اس طرح ان کے ہاتھ سے کسی بھی طرح کی نافرمانی اور عہد شکنی کا بہانہ لے لیا جائے۔

امیر المومنین علیہ السلام کے حقیقی رُتبے سے عام لوگوں کی ناواقفیت

تمہید کے طور پر اور یہ بتانے کے لیے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے لوگوں پر کیوں حجت تمام کرنا چاہی ضروری ہے کہ ہم واضح کریں کہ جو لوگ امیر المومنین علیہ السلام کی بیعت کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے وہ صحیح معنوں میں آپؑ کے حقیقی مقام و مرتبے سے واقف نہ تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ اس وقت کے لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور وہ امیر المومنین علیہ السلام کی مظلومیت کو سمجھتے ہوئے الٰہی حق کو اس کے حقدار تک پہنچانے کے لیے حضرتؑ کے ہاتھوں پر بیعت کرنا چاہتے تھے۔ سبق: ۲۱-خطبہ نمبر ۹۲ کا جائزہ (۲)

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

«... فَتَأَكَّدَ عِنْدَ النَّاسِ نَبَاهَةُ قَوْمٍ وَ خُمُولُ آخَرِينَ وَ كُنَّا نَحْنُ مِمَّنْ خَمَلَ ذِكْرُهُ وَ خَبَتْ نَارُهُ وَ انْقَطَعَ صَوْتُهُ و صيتُهُ حَتَّى أَكَلَ الدَّهْرُ عَلَيْنَا وَ شَرِبَ وَ مَضَتِ السِّنُونَ و الاحقَابُ بِمَا فِيهَا وَ مَاتَ كَثِيرٌ مِمَّنْ يُعْرَفُ وَ نَشَأَ كَثِيرٌ مِمَّنْ لايُعْرَفُ.»[1]

... چنانچہ لوگوں میں ایک گروہ کی شہرت بڑھ گئی اور دوسرے گروہ کی گمنامی شدت اختیار کر گئی۔ ہم ان لوگوں میں شامل تھے جن کی یاد بھلا دی گئی تھی اور ان کی آگ بجھ گئی تھی اور ان کی آواز اور شہرت کا گلا کاٹ دیا گیا یہاں تک کہ زمانے نے ہم سے خوب کھیل کھیلا، (حالات دوسروں کے حق میں ہو گئے) اور کئی سال حوادث کے شکار ہو گئے اور ان میں سے بہت سے لوگ جو مشہور تھے (اور مجھے جانتے تھے) وہ مر گئے اور جو مشہور نہیں تھے (اور مجھے نہیں جانتے تھے) وہ بڑے ہو گئے۔

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ۲۰/۲۹۹، مزید: گزشتہ حوالہ ۲۰/۳۲۹، ق ۷۳۳، نہج السعادہ ۱/۲۵۳، خطبہ ۷۷۔

جندب بن عبداللہ کہتے ہیں: عثمان کی بیعت ہونے کے بعد میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کے پاس گیا اور پوچھا: آپ لوگوں کو اپنا حق واپس لینے کی دعوت کیوں نہیں دیتے؟ جناب امیر علیہ السلام یہ کہتے ہوئے کہ سو میں سے دو لوگ بھی میری بیعت نہیں کریں گے، جندب سے فرماتے ہیں: ابھی اس اقدام کا وقت نہیں ہے۔ پھر جندب عراق کی طرف چلے جاتے ہیں اور وہاں امیرالمؤمنین علیہ السلام کے فضائل و مناقب بیان کرنا شروع کرتے ہیں لیکن لوگ ان کی طرف توجہ نہیں دیتے، وہ انھیں اپنے یہاں سے بھگا دیتے ہیں یہاں تک کہ انھیں ولید بن عقبہ کے ہاتھوں قید کر لیا جاتا ہے۔[1]

ایک دوسرے مقام پر اس سوال کے جواب میں کہ کیوں عثمان کے بعد امیرالمؤمنین علیہ السلام جیسی عظیم شخصیت کے موجود ہونے کے باوجود، طلحہ اور زبیر کے سر میں حکومت کرنے کا سودا سمایا ہوا تھا، وہ اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اسلامی معاشرے پر حکومت کی اپنی دعویداری کا دروازہ کھلا ہوا محسوس کر رہے تھے؟ ابن ابی الحدید اپنے استاد کے حوالے سے کہتے ہیں:

« لِأَنَّ عَلِيّاً (ع) دَحَضَهُ الأَوَّلَانِ وَ أَسْقَطَاهُ وَ كَسَرَا نَامُوسَهُ بَيْنَ النَّاسِ. وَ صَارَ نَسْياً مَنْسِيّاً. »[2]

اس لیے کہ پہلے دو خلفاء نے علی علیہ السلام کو مسترد کر دیا (آپ کی حجت کو باطل کر دیا)، انھیں نیچا دکھایا اور آپ کے مقام و مرتبے کو لوگوں کے درمیان توڑ دیا اور اس طرح آپ کو پوری طرح بھلا دیا گیا۔

حضرت خود اس بارے میں فرماتے ہیں:

---

(۱) بحار الانوار ۲۹/۴۳۳، ح ۱۷، امالی، طوسی ۱/۲۳۴، المجلس التاسع، ح ۷ اور شرح ابن ابی الحدید ۱/۵۸ سے منقول اور اسی سے مشابہ: بحار الانوار ۲۹/۴۳۳ اور گزشتہ حوالہ ۳۲/۶۱، مدائنی سے منقول۔

(۲) شرح ابن ابی الحدید ۹/۲۸-۲۹۔

«حَتّٰى اِذَا مَضٰى لِسَبِيْلِهٖ جَعَلَهَا فِيْ جَمَاعَةٍ زَعَمَ اَنِّيْ اَحَدُهُمْ. فَيَالَلّٰهِ وَ لِلشُّوْرٰى! مَتَى اعْتَرَضَ الرَّيْبُ فِيَّ مَعَ الْاَوَّلِ مِنْهُمْ. حَتّٰى صِرْتُ اُقْرَنُ اِلٰى هٰذِهِ النَّظَآئِرِ!.»[1]

یہاں تک کہ دوسرا (عمر) بھی اپنی راہ لگا (چل بسا) اور خلافت کو ایک جماعت میں محدود کر گیا اور مجھے بھی اس جماعت کا ایک فرد خیال کیا۔ اس شوریٰ سے اللہ کی پناہ! ان کے پہلے کے مقابلے ہی میں میرے استحقاق و فضیلت میں کب شک تھا جو اب ان جیسوں میں میرا بھی شمار ہونے لگا ہے؟!

معاشرے میں پہلے دو خلفاء کا اثر و رسوخ ایسا تھا کہ جس نے آپ کو بھی ان کی بدعتوں کو ٹھیک کرنے سے روک دیا۔ آپؑ اپنے ایک خطبے میں گزشتہ خلفاء کی تیس سے زیادہ بدعتوں کو گنوانے کے بعد فرماتے ہیں:

«وَاللّٰهِ لَقَدْ أَمَرْتُ النَّاسَ أَنْ لاَ يَجْتَمِعُوا فِي شَهْرِ رَمَضَانَ إِلاَّ فِي فَرِيضَةٍ وَ أَعْلَمْتُهُمْ أَنَّ اِجْتِمَاعَهُمْ فِي النَّوَافِلِ بِدْعَةٌ فَتَنَادَى بَعْضُ أَهْلِ عَسْكَرِي مِمَّنْ يُقَاتِلُ مَعِي يَا أَهْلَ الْإِسْلاَمِ غُيِّرَتْ سُنَّةُ عُمَرَ يَنْهَانَا عَنِ الصَّلاَةِ فِي شَهْرِ رَمَضَانَ تَطَوُّعاً وَ لَقَدْ خِفْتُ أَنْ يَثُورُوا فِي نَاحِيَةِ جَانِبِ عَسْكَرِي.»[2]

خدا کی قسم! میں نے لوگوں کو حکم دیا کہ ماہِ رمضان میں سوائے نمازِ واجب کے اکٹھا نہ ہوں [صرف واجب نمازوں کو جماعت سے پڑھیں] اور میں نے ان کے درمیان

---

(1) نہج البلاغہ/ خطبہ ۳ اور اسی سے مشابہ: گزشتہ حوالہ، خط نمبر ۹، بحار الانوار ۲۹/۵۵۱-۵۵۲ اور گزشتہ حوالہ ۳۳/۸۸-۸۹، ابن ابی الحدید سے منقول اور گزشتہ حوالہ ۳۸/۱۷۶۔

(2) کافی ۸/۶۲-۶۳، ح ۲۱، خطبہ امیر المومنین علیہ السلام فی الفتن والبدع اور اسی سے مشابہ: شرح ابن ابی الحدید ۱۲/۲۸۳، بحار الانوار ۳۴/باب علۃ عدم تغییر امیر المومنین علیہ السلام بعض البدع فی زمانہ۔

اعلان کیا کہ نافلہ نمازوں کے لیے جماعت قائم کرنا بدعت ہے لیکن میری ہی فوج میں شامل سپاہیوں کے ایک گروہ کی فریاد بلند ہوئی اور انھوں نے چیخ کر کہا: اے مسلمانو! عمر کی سنت بدل گئی ہے! علی ہمیں ماہِ رمضان کی مستحبی نماز پڑھنے سے روک رہے ہیں! اور مجھے تشویش ہوئی کہ کہیں وہ میری فوج کے کسی حصے میں بغاوت کی لہر نہ دوڑا دیں۔

یہ ثبوت اور اس جیسے دیگر شواہد بتاتے ہیں کہ زیادہ تر لوگ امیرالمؤمنین علیہ السلام کو "امام" کے طور پر نہیں جانتے تھے اور آپ کے لیے زیادہ سے زیادہ جس مقام و منزلت کے قائل تھے وہ یہ تھی کہ آپ گزشتہ تین خلفاء کے بعد حکومت سنبھالیں اور ان کی سیرت کے مطابق عمل کریں۔[1]

ان حالات میں آپ کے لیے بالکل یہی مناسب ہے کہ لوگوں پر حجت تمام کر دیں کیونکہ آپ جانتے تھے کہ یہ لوگ حقیقت کی تلاش میں نہیں آئے ہیں اور یہ آپ کی الٰہی اور عادلانہ حکمرانی کو برداشت نہیں کریں گے لیکن اب جب کہ وہ خود - کسی بھی وجہ سے - آپ کی حکمرانی چاہتے ہیں تو پھر ان پر حجت تمام ہو جائے تاکہ خلاف ورزی کی صورت میں ان کے پاس کوئی عذر نہ رہے۔

خود امیرالمؤمنین علیہ السلام لوگوں کی حالت سے باخبر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«ثُمَّ اِسْتَخْرَجْتُمُونِي أَيُّهَا اَلنَّاسُ مِنْ بَيْتِي فَبَايَعْتُمُونِي عَلَى شَنْأٍ مِنِّي لِأَمْرِكُمْ وَ فِرَاسَةٍ تَصْدُقُنِي عَمَّا فِي قُلُوبِ كَثِيرٍ مِنْكُمْ.»[2]

پھر اے لوگو! خود تم نے مجھے میرے گھر سے باہر نکالا اور مجھ سے بیعت کی، اس کے باوجود کہ میں تم پر حکومت کرنے سے کترا رہا تھا اور تم سب کے دل کا حال میری تیز نگاہی بیان کر رہی تھی، (کہ تم کیا گل کھلانے والے ہو اور دشمنی و نفرت پر اتر آؤ گے)۔

---

[1] بحار الانوار ۳۰/۱۷۔

[2] بحار الانوار ۳۲/۶۱، شرح ابن ابی الحدید ۷/۳۰، مدائنی سے منقول، حضرت کے اس خطبے کا تعلق آپ کے دورِ حکومت سے ہے۔

اِتمامِ حجت

جب امیر المؤمنین علیہ السلام نے معاویہ کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کیں تو لوگوں کو جنگ کے سلسلے میں جوش دلاتے ہوئے ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے گزشتہ واقعات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

«... فَجِئْتُمُونِي رَاغِبِينَ إِلَيَّ فِي أَمْرِكُمْ حَتَّى اسْتَخْرَجْتُمُونِي مِنْ مَنْزِلِي لِتُبَايِعُونِي فَالْتَوَيْتُ عَلَيْكُمْ لِأَبْلُوَ مَا عِنْدَكُمْ فَرَادَدْتُمُونِيَ الْقَوْلَ مِرَاراً وَ رَادَدْتُكُمْ وَ تَدَاكَكْتُمْ عَلَيَّ تَدَاكَّ الْإِبِلِ الْهِيمِ عَلَى حِيَاضِهَا حِرْصاً عَلَى بَيْعَتِي حَتَّى خِفْتُ أَنْ يَقْتُلَ بَعْضُكُمْ بَعْضاً.»[1]

تم اپنی حکومت کے سلسلے میں بہت اصرار و رغبت سے میرے پاس آئے یہاں تک کہ مجھے اپنے گھر سے باہر لے آئے تاکہ میری بیعت کرو۔ تو میں تم سے کتراتا رہا تاکہ جو (اصرار اور پایداری) تمھارے پاس ہے اسے آزما سکوں۔ تم نے بار بار اپنی بات دوہرائی اور میں بھی تمھیں وہی جواب دیتا رہا۔ تم ان اونٹوں کی طرح میرے اطراف جمع ہوئے جو پانی کی خاطر حوض پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ پھر تم نے بہ اصرار مجھ سے بیعت کا تقاضا کیا اور ایک دوسرے کو دھکّے دیے یہاں تک کہ مجھے خوف ہوا کہ کہیں تم ایک دوسرے کو قتل نہ کردو۔

---

(1) احتجاج ۱/۱۷۲، باب احتجاجہ علیہ السلام فی الحث علی السیر الی الشام و بحار الانوار ۳۲/۳۸۷، ارشاد، مفید ۱/۲۵۵، فصل و من کلامہ لما عمل علی السیر الی الشام.....

اس بیان میں، جناب امیر علیہ السلام نے لوگوں کی پیشکش کو قبول کرنے میں تاخیر کی وجہ، ان کی آزمائش بتائی ہے جس کے نتیجے میں حضرت کی بیعت پر لوگوں کا اصرار نمایاں ہوتا ہے اور وہ لوگ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں اور ان کی حکمرانی کے لیے شدید خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام نے اپنے اس عمل سے لوگوں پر اتمامِ حجت کی بہت ہی اہم دلیل حاصل کرلی، اسی وجہ سے جہاں کہیں بھی لوگوں کی سستی اور خلاف ورزی کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ، ان کے اصرار اور بیعت کی خواہش کو یاد دلاتے ہیں اور ان کے سامنے ہر قسم کی عذر تراشی کا سدِّباب کرتے ہیں۔ اسی تقریر میں وہ فرماتے ہیں:

«يَا مَعْشَرَ اَلْمُهَاجِرِينَ وَ اَلْأَنْصَارِ وَ جَمَاعَةِ مَنْ سَمِعَ كَلَامِي أَمَا أَوْجَبْتُمْ لِي عَلَى أَنْفُسِكُمُ اَلطَّاعَةَ؟ أَمَا بَايَعْتُمُونِي عَلَى اَلرَّغْبَةِ؟ أَمَا أَخَذْتُ عَلَيْكُمُ اَلْعَهْدَ بِالْقَبُولِ لِقَوْلِي؟ أَمَا بَيْعَتِي لَكُمْ يَوْمَئِذٍ أَوْكَدَ مِنْ بَيْعَةِ أَبِي بَكْرٍ وَ عُمَرَ فَمَا بَالُ مَنْ خَالَفَنِي لَمْ يَنْقُضْ عَلَيْهِمَا حَتَّى مَضَيَا وَ نَقَضَ عَلَيَّ وَ لَمْ يَفِ لِي ...»[1]

اے مہاجرین و انصار! کیا تم نے میری اطاعت کرنے اور میرے حکم کے بجالانے کا عہد و پیمان نہیں کیا؟ کیا تم نے اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے میری بیعت نہیں کی؟ کیا میں نے تم سے پیمان نہیں لیا تھا کہ تم میری پیروی کرو گے؟ یاد رکھو! میری بیعت ابوبکر و عمر کی بیعت سے زیادہ محکم و مضبوط ہوئی ہے، تم سب نے نہایت رغبت و خواہش اور مکمل اختیار و آزادی سے میری بیعت کی ہے۔ تم ان دونوں کی خلافت کے

[1] اسی مضمون سے مشابہ جناب امیر علیہ السلام کا بیان طلحہ و زبیر کی عہد شکنی کے سلسلے میں بھی ملتا ہے: نہج البلاغہ/ خطبہ ۸، خطبہ ۱۳۷، خطبہ ۲۱۳، خطبہ ۲۲۹، ک ۵۴، بحار الانوار ۳۲/ باب بیعۃ امیر المومنین علیہ السلام و ما جری بعدھا۔

وفادار اور اس پر ثابت قدم رہے لیکن تم نے میری بیعت توڑ دی اور وفاداری، استقامت و پائیداری نہیں دکھائی۔

اسی طرح امیر المومنین علیہ السلام بیعت کے شروع سے ہی لوگوں کو خبردار کرتے رہے کہ مجھ سے بیعت پچھلے خلفاء کی بیعت کی طرح نہیں ہے اور خود تم نے مجھ سے بیعت کی ہے لیکن تم کچھ اور ڈھونڈ رہے ہو اور میرا مقصد کچھ اور ہے اور جان لو کہ میں تمہاری خواہشات کی وجہ سے اپنا فرض نہیں چھوڑوں گا:

«لَمْ تَكُنْ بَيْعَتُكُمْ إِيَّايَ فَلْتَةً. وَلَيْسَ أَمْرِي وَأَمْرُكُمْ وَاحِدًا. إِنِّي أُرِيدُكُمْ لِلّٰهِ وَأَنْتُمْ تُرِيدُونَنِي لِأَنْفُسِكُمْ. أَيُّهَا النَّاسُ! أَعِينُونِي عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ. وَايْمُ اللّٰهِ! لَأُنْصِفَنَّ الْمَظْلُومَ مِنْ ظَالِمِهِ. وَلَأَقُودَنَّ الظَّالِمَ بِخِزَامَتِهِ حَتّٰى أُورِدَهُ مَنْهَلَ الْحَقِّ وَإِنْ كَانَ كَارِهًا.»(1)

تم نے میری بیعت اچانک اور بے سوچے سمجھے نہیں کی تھی اور نہ میرا اور تمہارا معاملہ یکساں ہے۔ میں تمہیں اللہ کے لیے چاہتا ہوں اور تم مجھے اپنے ذاتی فوائد کے لیے چاہتے ہو۔ اے لوگو! اپنی نفسانی خواہشوں کے مقابلے میں میری اعانت کرو۔ خدا کی قسم! میں مظلوم کا اس کے ظالم سے بدلہ لوں گا اور ظالم کی ناک میں نکیل ڈال کر اسے سرچشمۂ حق تک کھینچ کرلے جاؤں گا اگرچہ اسے یہ ناگوار کیوں نہ گزرے۔

لہٰذا اپنی حکمرانی و امارت کے شروعاتی دور میں ہی جناب امیر علیہ السلام نے لوگوں کے سامنے ایک مشکل مستقبل کی تصویر کھینچ دی:

---

(1) نہج البلاغہ/خطبہ ۱۳۶ اور اسی سے مشابہ: بحار الانوار ۳۲/۳۳، ح ۱۹، ارشاد، مفید ۱/ ۲۳، فصل و من کلامہ عین تخلف عن بیعتہ...۔

«... اَلَا وَ اِنَّ بَلِيَّتَكُمْ قَدْ عَادَتْ كَهَيْئَتِهَا يَوْمَ بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيَّكُمْ (ص)، وَ الَّذِيْ بَعَثَهُ بِالْحَقِّ لَتُبَلْبَلُنَّ بَلْبَلَةً، وَ لَتُغَرْبَلُنَّ غَرْبَلَةً وَ لَتُسَاطُنَّ سَوْطَ الْقِدْرِ حَتّٰى يَعُوْدَ اَسْفَلُكُمْ اَعْلَاكُمْ، وَ اَعْلَاكُمْ اَسْفَلَكُمْ. وَلَيَسْبِقَنَّ سَابِقُوْنَ كَانُوْا قَصَرُوْا، وَ لَيَقْصُرَنَّ سَبَّاقُوْنَ كَانُوْا سَبَقُوْا. وَاللّٰهِ! مَا كَتَمْتُ وَشْمَةً وَّ لَا كَذَبْتُ كِذْبَةً، وَ لَقَدْ نُبِّئْتُ بِهٰذَا الْمَقَامِ وَ هٰذَا الْيَوْمِ.»[1]

یاد رکھو کہ تمہارے لیے وہی آزمائشیں پلٹ آئی ہیں جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت موجود تھیں۔ اس ذات کی قسم جس نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق و صداقت کے ساتھ بھیجا! تم بری طرح تہ و بالا کیے جاؤ گے اور اس طرح چھانٹے جاؤ گے جس طرح چھلنی سے کسی چیز کو چھانا جاتا ہے اور اس طرح خلط ملط کئے جاؤ گے جس طرح (چمچے سے) دیگ کے اندر کی غذا ملائی جاتی ہے، یہاں تک کہ تمہارے ادنیٰ، اعلیٰ اور اعلیٰ، ادنیٰ ہو جائیں گے۔ جو پیچھے تھے، وہ آگے بڑھ جائیں گے اور جو ہمیشہ آگے رہتے تھے، وہ پیچھے چلے جائیں گے۔ خدا کی قسم! میں نے کوئی بات پردے میں نہیں رکھی، نہ کبھی غلط بیانی سے کام لیا۔ مجھے (رسول اللہ کی طرف سے) اس مقام اور اس دن کی پہلے ہی خبر دی جا چکی ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ/خطبہ ۱۶ اور اسی سے مشابہ: کافی ۸/۶۷-۶۸، ح ۶۳، بحار الانوار ۳۲/۴۶، نہج السعادہ ۱/۲۰۱، خطبہ ۵۸۔

یہ ساری باتیں اس وجہ سے تھیں کہ عمر و عثمان کے دورِ حکومت میں لوگوں کی مالی حالت بہتر ہوگئی تھی اور لوگوں کا دنیا اور اس کی مادیات سے لگاؤ بڑھ چکا تھا اور مختلف فتوحات سے حاصل ہونے والے غنائم و اموال لوگوں کے مختلف گروہوں میں تقسیم ہوئے تھے۔

جناب امیر علیہ السلام کے دور حکومت کے آغاز سے ہی لوگوں کے جو امتحانات ہوئے ان میں سے ایک بیت المال کی مساوی تقسیم کا مسئلہ تھا۔ خاص طور پر جن افراد کے حصے میں خلیفۂ دوم و سوم کے زمانے میں بیت المال سے زیادہ مال آتا تھا اور انھوں نے کافی دولت اکٹھا کرلی تھی ان سے جناب امیر علیہ السلام کا یہ اقدام برداشت نہیں ہوسکا اور انھوں نے ان کی مخالفت اور بیعت شکنی شروع کردی۔ یہ بات اور ہے کہ جس دن عوام نے امیر المومنین کی بیعت کی تھی، اسی دن آپؑ نے بیت المال کی مساوی تقسیم کے سلسلے میں اپنے واضح رویّے اور اس پر اپنی ثابت قدمی کا سب کے سامنے اعلان کردیا تھا۔[1]

خطبہ نمبر ۹۲ سے ثبوت کی فراہمی

نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۹۲ میں، جسے مخالفوں نے اپنی بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، ہمیں ایسے ثبوت نظر آجاتے ہیں جو واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ حضرت نے یہ خطبہ لوگوں پر حجت تمام کرنے کے لیے ارشاد فرمایا تھا۔

شروع میں لوگوں سے یہ فرمانے کے بعد کہ مجھے چھوڑ دو اور کسی اور کے پاس جاؤ، جناب امیر علیہ السلام اپنے اس کلام کی وجہ ایک تاریک مستقبل سے سامنا بتاتے ہیں جس میں دل استوار نہیں رہیں گے اور عقلیں اسے سمجھنے سے عاجز ہو جائیں گی۔ یہ بیان کنایۃً واضح کرتا ہے کہ ان

---

[1] رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۳۲/۱۷-۱۳۳ اور گزشتہ حوالہ ۳۴/۲۰۳-۲۰۹ اور نہج البلاغہ/خطبہ ۱۳۹ اور خطبہ ۲۰۵۔

لوگوں میں جناب امیر علیہ السلام کی حکمرانی کو برداشت کرنے کی طاقت نہ ہوگی اور ان کے نزدیک امیرالمؤمنین علیہ السلام کی حکمرانی دوسروں کی حکمرانی سے بہتر نہیں ہے۔ اسی لیے جناب امیر علیہ السلام اپنے آپ کو بچاتے ہوئے کہتے ہیں کہ جاؤ پہلے ہی کی طرح کسی اور کو اس عہدے کے لیے ڈھونڈھ لو کیونکہ اگر وہ حاکم ہوجاتے ہیں تو ان کی مخالفت، عہد شکنی کہلائے گی اور یہ بہت بڑا گناہ ہوگا اور جناب امیر علیہ السلام عہد شکنی کرنے والوں سے جنگ کریں گے۔ ہاں اگر جناب امیر علیہ السلام ایک وزیر اور مشیر کی حیثیت سے رہتے ہیں تو پھر آپؑ کی مخالفت عہد شکنی کے زمرے میں نہیں آئے گی، لہذا جناب امیر علیہ السلام کا ہاتھ ان کے ساتھ جنگ کے لیے کھلا نہیں ہوگا اور امیرالمومنین کو ان کے ساتھ جنگ نہیں کرنا پڑے گی۔

پھر جناب امیر علیہ السلام زیادہ واضح انداز میں کہتے ہیں: اگر میں تم پر حکمرانی کے عہدے کو قبول کرتا ہوں تو پھر میں اپنے علم کے مطابق اور جیسا کہ میں جانتا ہوں، عمل کروں گا اور کوئی بھی چیز مجھے اپنے فرائض پر عمل کرنے سے نہیں روک پائے گی چاہے معاشرہ خانہ جنگی کا شکار ہی کیوں نہ ہوجائے۔

جناب امیر علیہ السلام مزید فرماتے ہیں: اگر تم کسی اور کو خود پر حکومت کرنے کے لیے منتخب کرلیتے ہو تو پھر جیسا کہ پچھلے حکمرانوں کے زمانے میں، میں نے اپنے حق کے غاصبوں سے جنگ نہیں کی تھی اور اپنے مخالفین سے نہیں لڑا تھا، اِس وقت بھی میں کسی دوسرے کی حکومت کے سامنے ساکت رہوں گا اور میرا مخالفت اور جنگ کا ارادہ نہیں ہوگا۔ بہرحال تم لوگوں کے حق میں، جو الٰہی احکامات نہیں بلکہ دنیاوی مفادات کے حصول کے خواہاں ہو، میری وزارت، میری امامت اور حکومت سے بہتر ہوگی۔

لہٰذا عمومی طور پر یہ خطبہ اور دیگر بیانات جو ہم نے اس سے پہلے پیش کیے ہیں، اس بات کا ثبوت ہیں کہ لوگوں پر پوری طرح سے حجت کو تمام کرنے اور لوگوں کے اپنے بارے میں

اصرار اور دلچسپی کو ظاہر کرنے کے لیے کہ جناب امیر علیہ السلام پہلے مرحلے میں بیعت کی پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اس طرح عہد شکنی اور اطاعت سے منہ پھیرنے کے تمام تر راستوں کو لوگوں پر بند کر دیتے ہیں اور انھیں ان کے نازیبا افعال پر بلا جھجک ڈانٹنے پھٹکارنے اور خلاف ورزی کی صورت میں ان سے جنگ کے لیے اپنے ہاتھوں کو کھلا رکھتے ہیں۔ بنابریں ان خطبات کو بطور دلیل پیش کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرنا کہ امیر المومنین علیہ السلام کی حکمرانی پر کوئی الٰہی نص نہیں ہے، ایک غیر معقول اور بلا دلیل بات ہے۔

سبق ۲۲

خطبہ نمبر ۱۶۲ کا جائزہ[1]

امیرالمومنین علیہ السلام کی ایک اور تقریر، جسے مخالفین بطور دلیل پیش کرتے ہیں، نہج البلاغہ کا خطبہ ۱۶۲ ہے۔ اس خطبے کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ صفین کی جنگ میں، جناب امیر علیہ السلام کے سپاہیوں میں سے ایک نے آپ سے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ لوگوں نے آپ کو اس منصبِ حکومت سے الگ رکھا، حالانکہ آپ اپنی قابلیت و حقانیت کی وجہ سے اس کے زیادہ حقدار تھے؟ جناب امیر علیہ السلام پہلے تو اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس وقت ایسا سوال مناسب نہیں ہے، پھر فرماتے ہیں: چونکہ تمہیں قرابت اور سوال کرنے کا حق حاصل ہے، لہذا میں تمھاری بات کا جواب دیتا ہوں:

«... اَمَّا الْاِسْتِبْدَادُ عَلَيْنَا بِهٰذَا الْمَقَامِ وَ نَحْنُ الْاَعْلَوْنَ نَسَبًا، وَ الْاَشَدُّوْنَ بِالرَّسُوْلِ(ص) نَوْطًا، فَاِنَّهَا كَانَتْ اَثَرَةً شَحَّتْ عَلَيْهَا

---

[1] نہج البلاغہ کے مختلف نسخوں کے لحاظ سے اس خطبے کا نمبر مختلف بھی ہوسکتا ہے جیسے فیض الاسلام کے نسخے میں اس کا نمبر ۱۶۰ ہے جبکہ ابن ابی الحدید کے نسخے میں ۱۶۳ ہے۔

نُفُوْسُ قَوْمٍ، وَ سَخَتْ عَنْهَا نُفُوْسُ اٰخَرِيْنَ. وَ الْحَكَمُ اللهُ. وَ الْمَعُوْدُ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ...»

... جہاں تک اس منصب (خلافت) پر (ہمارے استحقاق کے باوجود ان لوگوں کی) آمریت کی بات ہے جبکہ ہم نسب کے اعتبار سے بلند تھے اور پیغمبر ﷺ سے ہمارا قرابت بھی قوی تھی، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خلافت ایک برگزیدہ چیز تھی جس پر کچھ لوگوں کی حریصانہ نظریں تھی اور انھوں نے اس میں بخل سے کام لیا اور کچھ لوگوں نے اس سے چشم پوشی کی اور فیصلہ کرنے والا تو اللہ ہی ہے اور قیامت کے روز اسی کی طرف بازگشت ہے۔

وہ چیز جس کی وجہ سے ہمارے مخالفوں کو گمان گزرا ہے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام غاصبانِ خلافت سے راضی تھے؛ ان کا اپنے اس کلام میں ایک لفظ کو استعمال میں لانا ہے جس کی وجہ سے رضایت کا توہم پیدا ہوا ہے اور وہ لفظ ہے "سَخَتْ" جو کہ سخاوت کے مصدر سے ہے۔ اس لیے ہمارے مخالفین کہتے ہیں: امیرالمؤمنین علیہ السلام نے رضایت کے ساتھ اور سخاوتمندانہ طریقے سے حکومت سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اس لیے اگر اختلاف تھا بھی تو وہ ختم ہوگیا اور امیرالمؤمنین علیہ السلام نے آخرکار اپنی طرف سے دوسروں کی خلافت کے جواز پر ہامی بھرلی۔ اس لیے شیعوں کو بھی چاہیے کہ وہ تفرقہ بازی سے کام نہ لیں اور اپنے امام کی اطاعت کرتے ہوئے تینوں خلفاء پر لعن و طعن سے باز رہیں۔

تجزیہ

جناب امیر علیہ السلام کے بیان سے اخذ کیے گئے نتائج کے تجزیے میں کچھ نکات پر توجہ دینا ضروری ہے:

اوّل: جیسا کہ ہم نے اس تحریر کے دوران بیان کیا ہے: امیرالمومنین علیہ السلام معاشرے پر حکمرانی کے معاملے میں خلافت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کو اپنا الٰہی حق سمجھتے تھے اور انھوں نے کبھی بھی اپنے حق کے غاصبوں اور ظالموں سے اپنی رضایت کا اظہار نہیں کیا۔ نہ تو آپؑ کے الفاظ میں اور نہ ہی آپؑ کے طرزِ عمل میں اس کی کوئی علامت نظر آتی ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے پچھلے سبق میں ثبوت پیش کیے، امامؑ نے اپنے دورِ حکومت میں بھی پچھلے خلفاء کے اقدامات پر عدم رضایت کا اظہار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے لے کر اپنے دورِ حکومت تک خود پر ہوئے ظلم کے تسلسل کا شکوہ کیا ہے۔ لہٰذا، ان شواہد کو نظر انداز کرنا، جو جناب امیر علیہ السلام کے الٰہی حق کے غاصبوں سے آپؑ کی عدم رضایت پر نصِ جلی ہیں، سوائے تجاہلِ عارفانہ اور ایک غیر علمی عمل کے کچھ نہیں کہلائے گا۔

دوم: نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۶۲ میں غور و فکر ہمیں ایسے مزید شواہد فراہم کرتا ہے جو امامؑ کے اس بیان سے رضایت، اطمینان اور بخشش کے معنی کو منسوب اور اسے ظاہر پر محمول کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ جناب امیر علیہ السلام خلافت پر لوگوں کے ناجائز قبضے اور اس کی کیفیت کا ذکر کر کے اس پر خدا کو قاضی بناتے ہیں۔ اس معاملے کو خدا پر چھوڑنا اور وہ بھی روزِ قیامت کے لیے، جو اعمال کے حساب کتاب اور جزا و سزا کا وقت ہے، ظاہر کرتا ہے کہ خدا کی بارگاہ میں شکایت اور خدا کے عدل و انصاف کا معاملہ ابھی باقی ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ امامؑ نے اپنی مرضی سے اپنے حق دوسروں کو بخش دیا اور اپنے حق کے غاصبوں اور ظالموں کو معاف کر دیا تو پھر ایسی صورت میں ایسا کوئی مسئلہ ہی باقی نہیں بچے گا جس کے بارے میں خدا فیصلہ کرے۔ معاملہ کو خدا کے حوالے کرنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یا تو کوئی الٰہی حق ہے جس کا فیصلہ خدا خود کرے گا، ایسی صورت میں جناب امیر علیہ السلام کا خدا کے حق کو معاف کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یا اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی الٰہی حق کا نہیں بلکہ کسی ذاتی مسئلے کا معاملہ ہے، تب بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ ابھی تک رضامندی حاصل نہیں ہوئی

ہے، ورنہ معاملہ کو خدا کے حوالے کرنا عبث ٹھہرے گا۔ لہٰذا یہ شواہد و قرائن واضح کرتے ہیں کہ اس معاملے میں نہ تو کسی طرح کی کوئی رضایت ہے اور نہ ہی بخشش یا معافی ہے۔

ایک دوسرا قرینہ امیرالمومنین علیہ السلام کا اپنے کلام میں "اَلْاِسْتِبْدَادُ. اَثْرَةٌ. شَحَّتْ" جیسے کچھ الفاظ استعمال کرنا ہے۔ أثرة، استأثر کا اسم مصدر ہے جس کے معنی ہیں «الاِخْتِصَاصُ بِالشَّيْءِ دُوْنَ مُسْتَحَقِّهِ» یعنی حق کو اس کے حقدار کو دینے کے بجائے خود ہی دبالینا۔ اِسْتِبْدَاد بھی اَثرۃ کے معنوں میں اور «الانفرادُ بالشيء» کے معنوں میں استعمال ہے۔[1] یہ لفظ آمریت اور کسی کی قابلیت اور حق کی پاسداری نہ کرنے کے مترادف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی کسی معاملے میں، کسی ایسے شخص کو جو اس کا مستحق ہو- چاہے وہ حقدار کے معنی میں ہو یا اہلیت کے معنی میں - زبردستی اس کے حق سے محروم کر دیا جائے اور اس چیز کو اپنا بنا لیا جائے اور اسے مستحق کو دینے کے بجائے خود اپنے پاس رکھ لیا جائے۔ اسی طرح شَحَّتْ کا لفظ ہے جو کہ شُحّ سے نکلا ہے۔ جس کے معنی لالچ اور بخل کے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کا اپنے اس بیان میں اس لفظ کو استعمال کرنا واضح کرتا ہے کہ غصبِ خلافت کے معاملے میں، وہ افراد جنھوں نے لالچ میں پڑ کر اور شدید قسم کے طمع میں گرفتار ہو کر خلافت پر جھپٹ پڑے اور اس پر قبضہ جمانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا، یعنی مستحق سے اس کا حق چھیننے میں اپنے لالچ پر قابو نہ رکھ سکے اور لالچ میں آ کر خلافت کو ہڑپ کر گئے۔ پھر خلافت پر ناجائز قبضہ جمانے کے باوجود غاصبوں نے جناب امیر علیہ السلام کے حق میں بخل سے کام لیا اور آپؑ کے حق سے منہ موڑے رکھا اور آپؑ کے حق کا لحاظ نہ کیا۔

لہٰذا یہ بہت واضح بات ہے کہ خلافت پر قبضہ جناب امیر علیہ السلام کی رضامندی سے نہیں تھا اور ایسا نہیں تھا کہ انھوں نے جناب امیر علیہ السلام سے درخواست کی ہو اور امام نے ان کو بخوشی رضامندی

---

[1] لسان العرب اور المنجد۔

دے دی ہو کہ ہاں تم خلافت اپنے ہاتھ میں لے لو، ایسا نہیں تھا بلکہ انھوں نے لالچ میں پڑ کر حکومت پر قبضہ جمالیا۔

سوم: پچھلے نکتے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس معاملے میں جناب امیر علیہ السلام کا طرزِ عمل بخوشی حکومت کو کسی اور کے سپرد کرنے پر مبنی نہیں ہے بلکہ اپنے حق سے چشم پوشی اختیار کرنے پر استوار ہے، جس کا مطلب ہرگز غاصبوں کے عمل پر رضامندی کا اظہار نہیں ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ہم لغت کا سہارا لیتے ہیں جہاں بیان ہوا ہے: «سَخَيْتُ عَنِ ٱلشَّيْءِ أَي تَرَكْتُهُ وَلَمْ تُنَازِعْنِي إِلَيْهِ نَفْسِي»[1] اگرچہ سخاوت کے معنی عطا و بخشش کے ہیں لیکن جب اس کا استعمال لفظ «عن» کے ساتھ ہو تو معنی ہوں گے: ترک کر دینا اور دل میں کشمکش نہ ہونا یعنی اس طرح سے چھوڑ دینا اور ترک کر دینا کہ اس پر کوئی پچھتاوا نہ ہو اور نہ ہی کوئی اندرونی کشمکش پیدا ہو۔ بنابریں "سَخَيْتُ عَنِ ٱلشَّيْءِ" کا ترجمہ: "عطا و بخشش، رضا و رغبت کے ساتھ" غلط ترجمہ ہوگا جب کہ جناب امیر علیہ السلام کے کلام میں اس کا استعمال لفظ "سَخَتْ" کے ساتھ ہوا ہے جو یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ جب جناب امیر علیہ السلام نے خلافت پر ان کی للچائی نظروں کو دیکھا کہ وہ کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح اسے اپنے پنجے میں جکڑنے کے لیے بے تاب ہیں اور جناب امیر علیہ السلام کی جان خطرے میں ہے تو انھوں نے اپنے حق کو آسانی سے چھوڑ دیا اور ایسا کرنے میں ضمیر کی ملامت اور ذہنی عذاب کا شکار نہیں ہوئے۔ اس لیے امامؑ کے اس بیان میں موجود اس لفظ کا مناسب ترجمہ نظر انداز کرنا اور ترک کرنا ہے۔[2]

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کی اس چشم پوشی اور ناراضگی کے اظہار، ظالموں کے ظلم کے اعلان اور انھیں غاصب بتانے میں کسی طرح کا کوئی تضاد نہیں ہے۔ ایسا

---

[1] رجوع فرمائیں: شرح ابن ابی الحدید ۲۰۸/۱۶۔
[2] رجوع فرمائیں: شرح ابن ابی الحدید ۲۰۸/۱۶۔

نہیں ہے کہ چونکہ حضرت نے چشم پوشی کی ہے تو پھر ناراضگی کا اظہار بھی نہ کریں بلکہ جیسا کہ لفت سے بھی ظاہر ہے کہ عدم تنازعہ بیرونی نہیں، اندرونی چیز ہے، یعنی امامؑ نے ان تمام حالات کا صبر و بردباری سے مقابلہ کیا اور وہی کیا جو خدا اور اس کے رسول ﷺ نے آپؑ سے چاہا تھا۔ حکومت ہاتھ سے نکل جانے پر آپؑ نے نہ تو بے صبری دکھائی اور نہ ہنگامہ آرائی کی۔ زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا جائے تو جناب امیر علیہ السلام نے جس چیز پر رضامندی ظاہر کی اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا وہ خدائی مرضی تھی نہ کہ غاصبوں کا ظلم۔ چونکہ امیر المومنین علیہ السلام ان تمام واقعات میں اللہ کو ناظر مان رہے تھے اس لیے جو کچھ بھی ہوا اسے آپؑ نے برداشت کیا اور بے صبری و بے چینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی الٰہی ذمہ داریوں عہدِ نبوی کی تکمیل سے پیچھے نہیں ہٹے۔ پوری طرح واضح ہے کہ اس انداز میں تسلیم ہونا کسی بھی صورت میں غاصبوں کے ظلم پر راضی ہونے کے معنی میں نہیں ہے بالکل ویسے ہی جیسے سید الشہداء امام حسین علیہ السلام نے اپنی جان قربان کر دی، بے شمار جانکاہ مصائب برداشت کیے اور الٰہی فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے «رِضًى بِقَضَائِكَ» کا نعرہ لگایا لیکن الٰہی مشیت کے سامنے امام حسین علیہ السلام کا یہ سرِ تسلیم خم کرنا یزید و شمر اور ان جیسے افراد کے ظلم و جرم میں کمی نہیں کرتا اور آخرت میں ان کے کیے عذاب پوری شدت سے باقی رہے گا۔

آخری نکتہ: جو کچھ بیان کیا گیا وہ اس مفروضے کی بنیاد پر ہے کہ «نُفُوسُ آخَرِينَ» سے مراد، جو جناب امیر علیہ السلام کے مذکورہ خطبہ میں سَخَت کا فاعل ہے، خود امیر المومنین علیہ السلام یا اہل بیت علیہم السلام کو لیا جائے اور جیسا کہ بیان کیا گیا داخلی و خارجی شواہد و دلائل، امامؑ کے کلام سے رضایت اور میل و رغبت کا تصور پوری طرح سے ختم کر دیتے ہیں۔ اسی طرح سخاوت کے فاعل کے سلسلے میں کچھ دوسرے امکانات بھی پائے جاتے ہیں جو مخالفین کے نتائج کو پوری طرح غلط ثابت کر دیتے ہیں۔

جناب امیر علیہ السلام کے اس خطبے کا مطلب یہ نکالا جاسکتا ہے کہ آپؑ غصبِ حکومت کے معاملے کو اس طرح بیان فرماتے ہیں: سقیفہ میں دو گروہ جمع ہوئے، کچھ مہاجرین، جو لالچ اور حرص و

ہوس کے زیرِ اثر حکومت ہتھیانے کی کوشش میں تھے اور اسے کسی نہ کسی طرح انصار سے لے اُڑے اور کچھ انصار، جن میں قبیلۂ اَوس کے بشیر بن سعد اور اُسید بن حضیر جیسے لوگ تھے، اس خوف سے کہ کہیں سعد بن عبادہ اور خزرج قبیلے والے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حکومت پر قابض نہ ہو جائیں، تیزی سے ابوبکر کی بیعت کر بیٹھے اور حکومت ان کے حوالے کر دی۔

اس وجہ سے جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: کچھ لوگوں نے اپنی طرف سے منصوبہ بندی کر کے حکومت کو آپس میں تقسیم اور حکومت کو اپنے لیے مختص کر لیا جو کہ ہمارا حق تھا اور ہم اس کے مستحق تھے، ہمیں انھوں نے چھوڑ دیا۔

ایک اور امکان جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ امامؑ فرماتے ہیں: خلافت پر قبضہ کرنے کے معاملے میں کچھ لوگوں نے زور زبردستی اور ظالمانہ طور پر لالچ کا شکار ہو کر اسے ہم سے لے لیا اور لوگوں نے بھی اس معاملے پر اتفاق کیا اور ہماری مدد کرنے میں استقامت واستحکام کو ہاتھ سے جانے دیا اور ہمارے حق کی بات تک نہ کی اور ان کی حکمرانی کو قبول کرتے ہوئے، انھوں نے ہمارے حق کو ان کے سپرد کر دیا۔

یہ امکان « نُفوسُ آخَرِینَ» کے جمع کی صورت میں اور « سَخَت » کے بطور صیغۂ مجہول استعمال کیے جانے سے مزید قوی ہو جاتا ہے کیونکہ خطبے کے آغاز میں امیر المؤمنین علیہ السلام لفظِ متکلم کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور « علینا » اور « نحن » جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اس کے بعد دو گروہِ غائب کی جانب اشارہ فرماتے ہیں۔

کل ملا کر مذکورہ بالا نِکات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس خطبے کے بارے میں مخالفین کے تأثرات اور ان کے اخذ کیے گئے نتائج اور اس بنیاد پر امیر المؤمنین علیہ السلام کی طرف غصب کرنے والوں کے عمل سے رضایت کی نسبت ایک غلط نسبت ہے اور امیر المؤمنین علیہ السلام کے کلام کے داخلی و خارجی شواہد کو نظر انداز کرنا ایک غیر عقلی عمل ہے۔

آخر میں ہم امیر المؤمنین علیہ السلام کے ایک اور کلام کو پیش کرتے ہیں کہ یہ کلام بھی اُس دور کے حالات سے ان کی ناراضگی کی صاف عکاسی کرتا ہے:

«لَنَا حَقٌّ. فَإِنْ أُعْطِينَاهُ. وَ إِلَّا رَكِبْنَا أَعْجَازَ الْإِبِلِ وَ إِنْ طَالَ السُّرَى.»[1]

ہمارا ایک حق ہے اگر وہ ہمیں دے دیا گیا تو ہم لے لیں گے، ورنہ ہم اونٹ کے پچھوں پر سوار ہوں گے چاہے شب روی طویل ہی کیوں نہ ہو۔

---

[1] نہج البلاغہ/قول نمبر ۲۱، یعنی ہم حق سے دستبردار ہونے والے نہیں ہیں اور جہاں تک غاصبانہ دباؤ کا سامنا کرنا پڑے گا، کرتے رہیں گے۔ بعض شارحین نے اس معنی کے علاوہ اور معنی بھی تحریر کیے ہیں اور وہ یہ کہ اگر ہمیں ہمارے مرتبہ سے گرا کر پیچھے ڈال دیا گیا اور دوسروں کو ہم پر مقدم کر دیا گیا تو ہم صبر سے کام لیتے ہوئے پیچھے ہٹنا گوارا کر لیں گے۔ اونٹ کے پُٹھے پر سوار ہونے سے یہی مراد ہے، کیونکہ جو اونٹ کے پٹھے پر سوار ہوتا ہے وہ پیچھے ہوتا ہے اور جو پشت پر سوار ہوتا ہے وہ آگے ہوتا ہے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اگر ہمارا حق دے دیا گیا تو ہم اسے لے لیں گے اور اگر نہ دیا گیا تو ہم اس سوار کی مانند نہ ہوں گے کہ جو اپنی سواری کی باگ دوسرے کے ہاتھ میں دے دیتا ہے کہ وہ جدھر اسے لے جانا چاہے لے جائے، بلکہ اپنے مطالبۂ حق پر برقرار رہیں گے چاہے لمبا عرصہ ہی کیوں نہ گزر جائے اور کبھی اپنے حق سے دستبردار ہو کر غصب کرنے والوں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں گے۔ بیشتر مفسرین نے اس کلام کو حق کی بحالی کے انکار میں پیش آنے والے مصائب اور مشکلات کی جانب کنایہ مانا ہے اور کچھ نے اونٹ کی دم کے قریب پٹھے پر سوار ہونے کو سماجی لحاظ سے اہمیت کے کم ہو جانے کی علامت سمجھا ہے کیونکہ اونٹ کے اس حصے پر اسیروں اور غلاموں کو سوار کیا جاتا تھا۔ رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۲۹/ ۶۳۲-۶۲۵۔

سبق ۲۳

محمد بن ابو بکر کی شہادت کے بعد امیر المؤمنین علیہ السلام کا خط

عمرو عاص کے ہاتھوں فتح مصر کے بعد،[۱] جنگ نہروان اور مصر میں امام کے گورنر محمد بن ابی بکر کی شہادت کے فوراً بعد لوگوں نے امیر المؤمنین علیہ السلام سے پچھلے تین خلفاء کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر جاننا چاہا۔ امام عالی مقام علیہ السلام نے اس سوال کے بے موقع اٹھائے جانے پر ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے اپنے کاتب عبید اللہ بن ابی رافع کو حکم دیا کہ وہ امام کے دس قابل بھروسہ افراد کو بطور گواہ جمع کریں اور پھر یہ خط تحریر فرمایا اور حکم دیا کہ اسے ہر جمعے کو لوگوں کے سامنے پڑھیں اور گزشتہ تین خلفاء کے بارے میں ان کے سوال کا جواب دیں۔[۲]

---

[۱] مصر پہلی بار عمر کے زمانے میں عمرو عاص کے ہاتھوں فتح ہوا۔

[۲] قابل ذکر ہے کہ اس خط کا کچھ حصہ نہج البلاغہ کے خط نمبر ۶۲ اور «الیٰ أَهْلِ مِصْرَ مَعَ مَالِكٍ الأَشْتَرِ لَمَّا وَلَّاهُ إِمَارَتَهَا» کے عنوان سے مذکور ہے، لیکن بحار الانوار میں سید بن طاؤس کی کتاب کشف المحجہ کے حوالے سے منقول ہے اور اسے محمد بن ابی بکر کی شہادت کے وقت سے متعلق بتایا گیا ہے۔

حسب عادت مخالفین نے غیر علمی طریقے سے اس خط کے کچھ جملوں کے ذریعے سعیٔ لاحاصل کی ہے کہ غاصبانِ خلافت کو جناب امیرؑ کی طرف سے رضایت کی سند دلوادیں:

«... ورنہ خود مولائے متقیانؑ جب اپنے زمانے کے خلفاء کو دیکھتے کہ وہ مقام مفضولیت پر ہونے کے باوجود شریعت کے راستے پر چل رہے ہیں تو وہ ان کے بہترین فرمانبردار، ساتھی اور معاون ہوتے تھے، جیسا کہ اس مشہور خط میں، جو انھوں نے گورنروں اور ذمہ داروں کو دیا تھا کہ اسے ہر جمعہ کو لوگوں کے سامنے پڑھیں، وہ ابوبکر کے بارے میں کہتے ہیں: "وَ أَطَعْتُهُ فِيمَا أَطَاعَ اللَّهَ فِيهِ جَاهِداً" یعنی ان چیزوں میں، جن میں ابوبکر نے خدا کی اطاعت کی، میں نے بھی پوری کوشش سے ان کی اطاعت کی۔ پھر اسی خط میں لکھتے ہیں: "فَلَمَّا احْتَضَرَ بَعَثَ إِلَى عُمَرَ فَوَلاَّهُ فَسَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا" جب ابوبکر حالت احتضار میں تھے تو انھوں نے کسی کے ذریعے عمر کو بلا بھیجا اور انھیں ولایت و حکومت سونپ دی، ہم نے ان کے حکم کو سنا اور اطاعت کی۔»[1]

ایک اور شخص، مرحوم کاشف الغطاء کی کتاب مستدرک نہج البلاغہ کے حوالے سے اس خط کو پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

«اس دستاویز کے مطابق، جس کی تائید دوسری روایات بھی کرتی ہیں، علیؑ نے کچھ مصلحتوں کی بنا پر شیخین کی حکومت کی موافقت اور ان سے بیعت کی ہے۔»[2]

اسی طرح اس خط کے دوسرے ثبوت کو بطور حوالہ پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

---

[1] حکومت در اسلام/۱۵۳-۱۵۴ اور اسی سے مشابہ: گزشتہ حوالہ/۱۲۹۔

[2] راہی بہ سوی وحدت اسلامی/۱۶۷۔

« جیسا کہ شیعہ عالم سید ابن طاوؤس نے اپنی کتاب کشف المحجۃ اور محمد بن یعقوب کلینی نے بھی اپنی کتاب الرّسائل میں لکھا ہے کہ علی علیہ السلام نے اپنے خط میں ابوبکر کے رویّے کے بارے میں فرمایا ہے: فَوُلِّيَ اَبُو بَكْرٍ فَقَارَبَ وَ اِقْتَصَدَ. یعنی: "ابوبکر نے ولایت کو سچی نیت کے ساتھ ہاتھوں میں لیا اور اعتدال کی راہ کو اپنایا۔" انھوں نے عمر بن خطاب کے طرزِ عمل کے بارے میں فرمایا ہے: وَ كَانَ عُمَرُ مَرْضِيَّ السِّيرَةِ مِنَ النَّاسِ عِنْدَ النَّاسِ. یعنی: "لوگوں کے درمیان سے عمر کا رویّہ عام لوگوں کی نظروں میں مطلوبہ اور اطمینان بخش تھا۔"

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "علی علیہ السلام کی امامت کا مقام و مرتبہ اپنی جگہ پر محفوظ تھا لیکن خلفاء سے ان کی رضایت و بیعت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے ان کی حکومت علی علیہ السلام کے نظریے سے غیر قانونی اور ناجائز نہیں مانی گئی ہے۔"[1]

تجزیہ

معاملے کو واضح کرنے اور مخالفین کے غیر علمی طریقے کو بے نقاب کرنے کے لیے کہ کس طرح انھوں امیر المؤمنین علیہ السلام کے کلام کے بعض حصوں کو لے کر ان کے کلام کے داخلی قرائن و شواہد کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی ہے، ہم یہاں

[1] راہی بہ سوئے وحدت اسلامی/۱۷۵-۱۷۶۔

امیرالمؤمنین علیہ السلام کے مذکورہ خط کے کچھ فقرے پیش کر رہے ہیں جو امام کے مقصد کو واضح کرنے میں مؤثر ہیں:[1]

«فَمَضَى لِسَبِيلِهِ صَلَّى ٱللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ وَ تَرَكَ كِتَابَ ٱللّٰهِ وَ أَهْلَ بَيْتِهِ إِمَامَيْنِ لاَ يَخْتَلِفَانِ.... فَوَ ٱللّٰهِ مَا أَدْرِي إِلَى مَنْ أَشْكُو؟ فَإِمَّا أَنْ يَكُونَ ٱلْأَنْصَارُ ظَلَمَتْ حَقَّهَا، وَ إِمَّا أَنْ يَكُونُوا ظَلَمُونِي حَقِّي. بَلْ حَقِّيَ ٱلْمَأْخُوذُ وَ أَنَا ٱلْمَظْلُومُ.»

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کتاب اللہ اور اپنے اہل بیت کو لوگوں کے درمیان چھوڑ کر انتقال کر گئے جو دونوں ہی امام ہیں اور ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں... خدا کی قسم! میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ کس سے فریاد کروں؟ یا انصار کے حق میں ظلم ہوا یا میرے حق میں انھوں نے ظلم کیا، البتہ انھوں نے میرے حق پر ڈاکا ڈالا اور انھوں نے میرا حق چھین لیا اور میں مظلوم ہوں۔

«... فَلَمَّا رَأَيْتُ ٱلنَّاسَ قَدِ ٱنْثَالُوا عَلَى أَبِي بَكْرٍ لِلْبَيْعَةِ أَمْسَكْتُ يَدِي وَ ظَنَنْتُ أَنِّي أَوْلَى وَ أَحَقُّ بِمَقَامِ رَسُولِ ٱللّٰهِ صَلَّى ٱللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ مِنْهُ وَ مِنْ غَيْرِهِ، وَ قَدْ كَانَ نَبِيُّ ٱللّٰهِ أَمَرَ أُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ عَلَى جَيْشٍ وَ جَعَلَهُمَا فِي جَيْشِهِ، وَ مَا زَالَ ٱلنَّبِيُّ صَلَّى ٱللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ إِلَى أَنْ فَاضَتْ نَفْسُهُ يَقُولُ: أَنْفِذُوا جَيْشَ أُسَامَةَ.»

---

[1] اس روایت کو بحار الانوار ۳۰/۷-۲۶ سے سید ابن طاؤس کی کتاب کشف المحجہ سے نقل کرتے ہیں جسے انھوں کلینی کی کتاب رسائل کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اس خط کے بعض جملے ہم نے گزشتہ دروس بالخصوص سبق نمبر آٹھ میں نقل کیے ہیں، اس لیے ہم ان کے بارے میں یہاں بحث نہیں کریں گے۔

... اور جب میں نے لوگوں کو دیکھا جو ابوبکر سے بیعت کے لیے ٹوٹے پڑتے تھے تو میں نے اپنے آپ کو روک لیا جبکہ مجھے یقین تھا میں ابوبکر یا کسی اور سے مسند پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زیادہ حقدار ہوں۔ یہ ایسے عالم میں تھا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسامہ بن زید کو ایک لشکر کا امیر بنایا تھا اور ان دونوں (ابوبکر و عمر) کو اسامہ کے لشکر میں شامل رہنے کا حکم دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی آخری سانس تک کہتے رہے لشکرِ اسامہ کو روانہ کرو۔

«فَلَمَّا رَأَيْتُ رَاجِعَةً مِنَ ٱلنَّاسِ قَدْ رَجَعَتْ عَنِ ٱلْإِسْلاَمِ تَدْعُو إِلَى مَحْوِ دِينِ مُحَمَّدٍ وَ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِمَا ٱلسَّلاَمُ خَشِيتُ إِنْ أَنَا لَمْ أَنْصُرِ ٱلْإِسْلاَمَ وَ أَهْلَهُ أَرَى فِيهِ ثَلْماً وَ هَدْماً تَكُ ٱلْمُصِيبَةُ عَلَيَّ فِيهِ أَعْظَمَ مِنْ فَوْتِ وِلاَيَةِ أُمُورِكُمُ ٱلَّتِي إِنَّمَا هِيَ مَتَاعُ أَيَّامٍ قَلاَئِلَ... فَنَهَضْتُ مَعَ ٱلْقَوْمِ فِي تِلْكَ ٱلْأَحْدَاثِ حَتَّى زَهَقَ ٱلْبَاطِلُ وَ كَانَتْ كَلِمَةُ ٱللهِ هِيَ ٱلْعُلْيَا وَ إِنْ زَعَمَ ٱلْكَافِرُونَ.»

پھر جب میں نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک گروہ دین سے منہ موڑ رہا ہے اور لوگوں کو دینِ محمدؐ کی نابودی اور دینِ ابراہیمی کے خاتمے کی دعوت دے رہا ہے تو مجھے خوف محسوس ہوا کہ اگر میں نے اسلام کی مدد نہ کی تو اس میں ایسا شگاف پڑ جائے گا اور اسے ایسا نقصان پہنچے گا جس کی مصیبت میرے لیے تم پر حکمرانی کھونے کی مصیبت سے کہیں بڑی ہوگی جبکہ وہ کچھ ہی دنوں کا معمولی سامان ہے... چنانچہ ان نازک حالات میں لوگوں کے ساتھ دین کی حفاظت کی خاطر میں کھڑا ہوگیا یہاں تک کہ باطل محو اور کلمۂ خدا غالب آگیا حالانکہ کافروں کو یہ پسند نہ آیا۔

پھر امیر المؤمنین علیہ السلام سعد بن عبادہ اور فروہ بن عمر انصاری کی جانب سے ابوبکر کی بیعت کی مخالفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«فَوَلِيَ أَبُو بَكْرٍ فَقَارَبَ وَ اِقْتَصَدَ فَصَحِبْتُهُ مُنَاصِحاً. وَ أَطَعْتُهُ فِيمَا أَطَاعَ اَللَّهَ فِيهِ جَاهِداً. حَتَّى إِذَا اُحْتُضِرَ. قُلْتُ فِي نَفْسِي: لَيْسَ يَعْدِلُ بِهَذَا اَلْأَمْرِ عَنِّي، وَ لَوْ لاَ خَاصَّةٌ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ عُمَرَ وَ أَمْرٌ كَانَا رَضِيَاهُ بَيْنَهُمَا. لَظَنَنْتُ أَنَّهُ لاَ يَعْدِلُهُ عَنِّي وَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ اَلنَّبِيِّ صَلَّى اَللَّهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ لِبُرَيْدَةَ اَلْأَسْلَمِيِّ.... فَقَالَ: يَا بُرَيْدَةُ! حَظُّهُ فِي اَلْخُمُسِ أَكْثَرُ مِمَّا أَخَذَ. إِنَّهُ وَلِيُّكُمْ بَعْدِي. سَمِعَهَا أَبُو بَكْرٍ وَ عُمَرُ. وَ هَذَا بُرَيْدَةُ حَيٌّ لَمْ يَمُتْ. فَهَلْ بَعْدَ هَذَا مَقَالٌ لِقَائِلٍ؟!.»

تو ابو بکر کو حکومت مل گئی اور انھوں نے اعتدال کی راہ اختیار کی۔ میں نے ان کے ساتھ سچائی اور بھلائی کا رویّہ اپنایا اور جس کام میں انھوں نے خدا کی اطاعت کی، اس میں، میں نے ان کی پیروی کی، یہاں تک کہ ان کی موت کا وقت آپہنچا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: اب وہ خلافت کے اس عہدے کو مجھ سے دور نہیں رکھیں گے لیکن اگر ان کے اور عمر کے درمیان وہ خاص رشتہ اور آپسی معاہدہ نہ ہوتا جو اس سے پہلے آپسی رضامندی کے ساتھ ہوا تھا تو مجھے یقین تھا کہ وہ اس (خلافت) کو واپس مجھے لوٹادیں گے کیونکہ انھوں نے (جنگِ یمن کے موقع پر) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بریدۂ اسلمی سے بیان کیا ہوا فرمان سن رکھا تھا... رسول اللہ نے فرمایا تھا: اے بریدہ! خمس میں اس (علی علیہ السلام) کا حصہ اس سے زیادہ ہے جو اس نے لیا ہے۔ بے شک وہ میرے بعد تم سب کا سرپرست ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کو ابو بکر اور عمر نے بھی سنا تھا اور خود بریدہ تو ابھی زندہ ہی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود کیا کسی کے پاس کچھ کہنے کو باقی بچتا ہے؟!

«فَبَايَعَ عُمَرَ دُونَ اَلْمَشُورَةِ فَكَانَ مَرْضِيَّ اَلسِّيرَةِ مِنَ اَلنَّاسِ عِنْدَهُمْ. حَتَّى إِذَا اُحْتُضِرَ قُلْتُ فِي نَفْسِي: لَيْسَ يَعْدِلُ بِهَذَا اَلْأَمْرِ

عَنِّي، لِلَّذِي قَدْ رَأَى مِنِّي فِي ٱلْمَوَاطِنِ، وَ سَمِعَ مِنَ ٱلرَّسُولِ صَلَّى ٱللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ.»

پھر ابوبکر نے لوگوں سے مشورے کے بغیر ہی عمر کی بیعت کر لی اور عمر کا رویہ لوگوں کو پسند آیا، یہاں تک کہ ان کی بھی موت کا وقت قریب آگیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا: عمر، میرے کارناموں کے سبب، جنھیں انھوں نے مختلف مقامات پر خود دیکھا ہے اور خود رسول اللہ ﷺ سے میرے بارے میں جو کچھ سنا ہے، اس کی بنا پر اس خلافت کا عہدہ مجھے لوٹا دیں گے۔

امیرالمؤمنین علیہ السلام اپنے اسی خط میں خلیفہ مقرر کرنے کے طریقۂ کار میں ابوبکر و عمر کے درمیان اختلاف پر تعجب کا اظہار فرماتے ہیں۔ اسی طرح ابو طلحہ انصاری کو عمر کے اس حکم پر بھی حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر چھے رکنی شوریٰ خلیفہ معین کرنے میں ناکام رہے تو اس کے سبھی اراکین کو قتل کر دیا جائے: کس طرح عمر ایسے افراد کے قتل کا حکم دے سکتے ہیں جنھیں، خود ان کے ہی مطابق، رسول خدا ﷺ نے جنت کی بشارت دی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی حقانیت کی جانب ایک بار پھر اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«... وَ إِنَّمَا حُجَّتِي أَنِّي وَلِيُّ هَذَا ٱلْأَمْرِ مِنْ دُونِ قُرَيْشٍ، أَنَّ نَبِيَّ ٱللّٰهِ صَلَّى ٱللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ قَالَ: ٱلْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ.... فَكَانَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى ٱللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ وَلَاءُ هَذِهِ ٱلْأُمَّةِ، وَ كَانَ لِي بَعْدَهُ مَا كَانَ لَهُ... بِقَوْلِ ٱلنَّبِيِّ صَلَّى ٱللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ يَوْمَ غَدِيرِ خُمٍّ: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهَذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ.»

... اور اس پر میری ٹھوس دلیل کہ اس امر (حکومت) کا سرپرست میں ہوں، قریش نہیں؛ پیغمبر اکرم ﷺ کا قول ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں: ولایت اس کے لیے ہے

جس نے آزاد کیا ہے... لہٰذا اس امت کی ولایت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے تھی اور آپؐ کے بعد جو کچھ بھی آپؐ کے لیے تھا وہ میرے لیے ثابت ہے... اس قول کی بنیاد پر جو آپؐ نے غدیر کے دن میرے حق میں فرمایا تھا کہ جس جس کا میں مولا ہوں، یہ علی اس کے مولا ہیں۔

«... فَدَعَوْنِي إِلَى بِيعَةِ عُثْمَانَ فَبَايَعْتُ مُسْتَكْرِهاً. وَ صَبَرْتُ مُحْتَسِباً. وَ عَلَّمْتُ أَهْلَ الْقُنُوتِ أَنْ يَقُولُوا: اَللَّهُمَّ لَكَ أَخْلَصَتِ الْقُلُوبُ. وَ إِلَيْكَ شَخَصَتِ الْأَبْصَارُ. وَ أَنْتَ دُعِيتَ بِالْأَلْسُنِ. وَ إِلَيْكَ تُحُوكِمَ فِي الْأَعْمَالِ. فَافْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ. اَللَّهُمَّ إِنَّا نَشْكُو إِلَيْكَ غَيْبَةَ نَبِيِّنَا. وَ كَثْرَةَ عَدُوِّنَا. وَ قِلَّةَ عَدَدِنَا. وَ هَوَانَنَا عَلَى النَّاسِ. وَ شِدَّةَ الزَّمَانِ. وَ وُقُوعَ الْفِتَنِ بِنَا. اَللَّهُمَّ فَفَرِّجْ ذَلِكَ بِعَدْلٍ تُظْهِرُهُ. وَ سُلْطَانِ حَقٍّ تَعْرِفُهُ.»

... چنانچہ مجھے عثمان سے بیعت کی دعوت دی گئی اور میں نے بادلِ ناخواستہ ان کی بیعت کر لی، میں نے خدا کے اجر کے انتظار میں صبر سے کام لیا اور میں نے اہل دعا اور اہل قنوت کو تعلیم دی کہ وہ کہیں: خدایا! قلوب تیرے لیے خالص ہو چکے، آنکھیں تیرے در پر لگی ہوئی ہیں، زبانیں تیرے ذکر سے معطر ہیں اور اعمال کو فیصلے کے لیے تیرے حضور پیش کیا جا چکا ہے تو، تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان صاف صاف فیصلہ سنا دے، اے معبود! ہم تجھ سے فریاد کرتے اپنے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اٹھ جانے کی اور دشمنوں کی کثرت اور اپنی قلت کی، لوگوں کی نظروں میں رسوائی کی اور زمانے کی مشکلات اور فتنوں کے ہم پر ٹوٹ پڑنے کی۔ لہٰذا (اس غم و شکوے کو) اس عدل سے کہ جو تو ظاہر کرنے والا ہے اور اس برحق حاکم سے کہ جسے تو متعارف کروانے والا ہے، دور فرما اور اس طرح آسانیاں کرامت فرما۔

«... اَللَّهُمَّ إِنِّي أَسْتَعْدِيكَ عَلَى قُرَيْشٍ فَإِنَّهُمْ قَطَعُوا رَحِمِي وَ أَضَاعُوا أَيَّامِي، وَ دَفَعُوا حَقِّي، وَ صَغَّرُوا قَدْرِي وَ عَظِيمَ مَنْزِلَتِيَ، وَ أَجْمَعُوا عَلَى مُنَازَعَتِي حَقّاً كُنْتُ أَوْلَى بِهِ مِنْهُمْ، فَاسْتَلَبُونِيهِ.»

خدایا! میں قریش (کے لوگوں) کے خلاف تجھ سے فریاد کرتا ہوں کیونکہ انھوں نے میری قرابت کے بندھن توڑ دیے، میری زندگی میں آگ بھردی، میرے حق کا لحاظ نہ کیا، میرے وقار کو حقیر سمجھا، میرے مرتبے کی بلندی کو پست جانا اور اس حق (خلافت) پر، جو میرے لیے مخصوص تھا، ملی بھگت کی اور اسے مجھ سے چھین لیا۔

«... وَ اَيْمُ اَللَّهِ لَوِ اِسْتَطَاعُوا أَنْ يَدْفَعُوا قَرَابَتِي كَمَا قَطَعُوا سَبَبِي فَعَلُوا، وَ لَكِنَّهُمْ لاَ يَجِدُونَ إِلَى ذَلِكَ سَبِيلاً، إِنَّمَا حَقِّي عَلَى هَذِهِ اَلْأُمَّةِ كَرَجُلٍ لَهُ حَقٌّ عَلَى قَوْمٍ إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ، فَإِنْ أَحْسَنُوا وَ عَجَّلُوا لَهُ حَقَّهُ قَبِلَهُ حَامِداً، وَ إِنْ أَخَّرُوهُ إِلَى أَجَلِهِ أَخَذَهُ غَيْرَ حَامِدٍ، وَ لَيْسَ يُعَابُ اَلْمَرْءُ بِتَأْخِيرِ حَقِّهِ، إِنَّمَا يُعَابُ مَنْ أَخَذَ مَا لَيْسَ لَهُ.»

... خدا کی قسم! اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ میری قرابت کو بھی قطع کر دیتے جس طرح انھوں نے میری سببی قرابت کو قطع کر دیا لیکن ایسا کرنے کا انھیں کوئی راستہ نہ سوجھا،[1] بے شک اس امت پر میرا حق اس شخص کی طرح ہے کہ جس کا ایک معینہ مدت تک کے لیے حق ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر قوم نیکی کا راستہ اپناتے ہوئے اس کے حق کو جلدی اس تک

---

[1] شاید سببی قرابت سے مراد یہ ہو کہ میری زوجہ کو شہید کر کے میرے اور پیغمبر ﷺ کے درمیان دامادی کا جو رشتہ تھا اسے ان لوگوں نے قطع کر دیا لیکن انھیں کوئی ایسا راستہ نہ مل پایا جو مجھے قتل کر کے میرے خونی رشتے کو پیغمبر ﷺ سے جدا کر دیتے (کہ میں پیغمبر ﷺ کا چچازاد بھائی ہوں) یا شاید اس سے مراد یہ ہو کہ ان لوگوں نے پیغمبر سے میرے اخوت کے رشتے کا تو انکار کیا لیکن ان سے میری رشتہ داری کو ختم نہ کر پائے۔

پہنچادے تو وہ شکریے کے ساتھ قبول کرلیتا ہے اور اگر وہ اسے اس کا حق دینے میں تاخیر کرتی ہے تو وہ اسے بغیر شکریے کے لے لیتا ہے اور حق دیر سے ملنے پر کسی کی ملامت نہیں ہوتی بلکہ ملامت تو اس کی ہوتی ہے جو اس چیز کو لے لے جو اس کی نہیں ہے۔

«وَ قَدْ كَانَ رَسُولُ اَللَّهِ صَلَّى اَللَّهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ عَهِدَ إِلَيَّ عَهْداً فَقَالَ: يَا اِبْنَ أَبِي طَالِبٍ لَكَ وِلاَيَتِي فَإِنْ وَلَّوْكَ فِي عَافِيَةٍ وَ رَجَعُوا عَلَيْكَ بِالرِّضَا فَقُمْ بِأَمْرِهِمْ. وَإِنِ اِخْتَلَفُوا عَلَيْكَ فَدَعْهُمْ وَ مَا هُمْ فِيهِ. فَإِنَّ اَللَّهَ سَيَجْعَلُ لَكَ مَخْرَجاً.»

اور بے شک، خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے ایک عہد لیا اور فرمایا تھا: اے فرزند ابوطالب! میری ولایت و جانشینی تمہارے لیے ہے تو اگر لوگ پرامن طریقے سے تمہیں اپنا سرپرست قبول کرلیں اور وہ رضامندی سے تمھارے ساتھ ہوجائیں تو پھر ان کے امور کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اٹھالینا اور اگر وہ تم پر متفق نہ ہوں تو انھیں ان کی ہی حالت پر چھوڑ دینا کہ بے شک، خدا جلد ہی تمہارے لیے اس سے رہائی کے اسباب فراہم کردے گا۔

اس کے بعد امیر المومنین علیہ السلام اس بات کو واضح کرتے ہوئے کہ ان کا کوئی یار و مددگار نہ تھا، جس کے بھروسے وہ غاصبوں کے خلاف اقدام کرپاتے اور اگر ان کے ساتھ حمزہؑ و جعفرؓ ہوتے تو وہ ضرور اقدام کرتے مگر ان کے بجائے ان کے ساتھ عباس و عقیل جیسے افراد باقی بچے تھے، فرماتے ہیں:

«فَأَغْضَيْتُ عَيْنِي عَلَى اَلْقَذَى. وَ تَجَرَّعْتُ رِيقِي عَلَى اَلشَّجَا. وَ صَبَرْتُ عَلَى أَمَرَّ مِنَ اَلْعَلْقَمِ. وَ آلَمَ لِلْقَلْبِ مِنْ حَزِّ اَلشِّفَارِ.»

آنکھوں میں خس و خاشاک تھا مگر میں نے چشم پوشی کی، حلق میں (غم و رنج) کے پھندے تھے مگر میں لعاب دہن نگلتا رہا اور غم و غصہ پی لینے کی وجہ سے میں نے ایسے حالات پر

صبر کیا جو حنظل (اندرائن) سے زیادہ تلخ اور دل کے لیے چھریوں کے کچوکوں سے زیادہ المناک تھے۔

اس کے بعد ایک جملے میں عثمان کے بارے میں فرماتے ہیں:

«... وَ أَنَا جَامِعٌ أَمْرَهُ: اِسْتَأْثَرَ فَأَسَاءَ الْأَثَرَةَ، وَ جَزِعْتُمْ فَأَسَأْتُمُ الْجَزَعَ، وَ اللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُ.»[1]

میں ان کا معاملہ (ایک جملے میں) اکٹھا کر دیتا ہوں: انھوں نے نفس پرستی کی اور بری طرح کی اور تم نے بھی جلد بازی کی اور بر طرح جلد بازی کی اور تمھارے اور ان کے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا۔

اس کے بعد سے امیر المومنین علیہ السلام اپنی حکومت کے دوران پیش آنے والے واقعات و حالات کا ذکر کرتے اور اپنے گلے شکوے لوگوں کے سامنے دوہراتے ہیں۔

تھوڑی سی توجہ سے ہی ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اس پورے خط میں کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آتی جس سے اس بات کا شائبہ بھی پیدا ہو کہ جناب امیر علیہ السلام گزشتہ ادوار میں جو کچھ بھی پیش آیا، اس سے راضی تھے بلکہ معاملہ تو اس کے بالکل برخلاف نظر آتا ہے۔ اس خط میں ہر جگہ جناب امیر علیہ السلام اپنے خدائی حق کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اپنے صبر و تحمل اور تلخ سکوت کی وجہ، موجودہ حالات اور غاصبوں کی حکمرانی سے اطمینان و رضایت نہیں بلکہ اسلام کے تحفظ اور عہد نبوی کا پاس و لحاظ بتاتے ہیں۔

---

[1] اسی سے مشابہ: مستدرک، حاکم ۴/۶۴، ح ۴۶۱۳۔

جناب امیر علیہ السلام کے بیان کا صحیح مطلب

ان واضح قرائن و شواہد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جو سب کے سب جناب امیر علیہ السلام کے اسی کلام میں موجود ہیں، ہم امیر المؤمنین علیہ السلام کے بیان کے ان حصوں کے صحیح معنی بیان کریں گے جنھیں مخالفین نے دلیل کے طور پر پیش کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

اوّل: جہاں امیر المومنین علیہ السلام نے اس زمانے کے حوادث میں اپنی شرکت کی وجہ، اسلام کی حفاظت بتائی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ابوبکر کی حکومت دین کی حافظ و نگہبان تھی بلکہ جناب امیر علیہ السلام نے اسلام کی بھلائی اس میں دیکھی کہ پوری طرح معاشرے سے کٹ کر نہ رہا جائے یا مخالفت کی جائے۔ لہٰذا ابوبکر سے بیعت، ان کی حکمرانی سے امیر المؤمنین علیہ السلام کے راضی ہونے کی علامت نہیں ہے، بلکہ جناب انھوں نے ایسا کر کے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے گئے عہد کو پورا کیا اور اپنی حقّانیت کے باوجود تحفظ دین کی خاطر بہت زیادہ اصرار نہیں کیا۔

اسی طرح اس دھوکے میں بھی نہیں پڑنا چاہیے کہ جن ناگفتہ بہ حالات کا جناب امیر علیہ السلام نے ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ لوگ دین سے منحرف ہو رہے تھے، اس سے مراد مرتدین کے معاملات یا اہل رِدّۃ کے ساتھ جنگ ہے۔ کیونکہ اول تو یہ سب کے سب مرتد نہیں تھے اور ان میں سے کچھ، جیسے مالک بن نویرہ، نے ابوبکر کی حکمرانی کو قبول نہیں کیا تھا اور دوسرے یہ کہ مرتدوں کے خلاف جنگ میں جناب امیر علیہ السلام کی شرکت کے بارے میں کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے[1] جس سے ہم

---

[1] اس بیان کی تشریح میں ابن ابی الحدید نے تاریخ طبری سے ایک بیان نقل کیا ہے جو مرتدوں کے ساتھ جناب امیر علیہ السلام کی جنگ کو بیان کرتا ہے لیکن اس منقولہ روایت پر ذرا سی توجہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس واقعے میں جناب امیر علیہ السلام نے مرتدوں کے خلاف اکیلے جنگ کی ہے نہ کہ ابوبکر کی سرپرستی یا ان کی فوج میں شامل ہو کر۔ رجوع فرمائیں: شرح ابن ابی الحدید ۱۷/۱۵۴۔

یہ سمجھ سکیں کہ جناب امیرؑ کے بیعت کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ اہل رِدّہ کی طغیانیوں کو خاموش کرنے میں مدد ملی۔[1]

دوم: امیرالمومنینؑ نے جو یہ فرمایا ہے کہ «فَوَلِيَ أَبُو بَكْرٍ فَقَارَبَ وَ اِقْتَصَدَ»[2] تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابوبکر نے اپنی حکمرانی میں درمیانی راستہ اختیار کیا اور افراط و تفریط سے کام نہیں لیا کیونکہ ان کی حکمرانی کا زمانہ حضور ﷺ کی رسالت اور حکمرانی کے وقت سے قریب تھا اور چونکہ لوگوں اب بھی پیغمبر اسلام ﷺ کی طرز زندگی سے انسیت رکھتے تھے اور اس سے مانوس تھے اس لیے ابوبکر چاہ کر بھی اپنی حکمرانی کے طریقے میں زیادہ کچھ تبدیلی نہیں لا سکے، عمر کے برخلاف، جنھیں حکومت کا طریقہ بدلنے اور بہت سی بدعتیں ایجاد کرنے کا خوب موقع ملا؛ نتیجتاً مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو ابوبکر کے پاس ایک ایسی حکومت تھی جو لوگوں کے لحاظ سے متوازن تھی۔[3]

دوسرے الفاظ میں ممکن ہے کہ کسی حکومت کی بنیاد باطل اور غیر ہو لیکن کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کی جانب سے معاشرے کا انتظامی طریقۂ کار بھی ظالمانہ اور باطل ہی ہو۔ جناب امیرؑ بھی اسی جانب اشارہ فرماتے ہیں کہ اس حقیقت کے باوجود کہ مجھ سے میرا خدائی حق چھین لیا گیا اور مجھ پر ظلم کیا گیا لیکن ابوبکر نے معاشرے کو چلانے کے لیے متوازن راستہ اختیار کیا۔

---

[1] یہ ساری باتیں اس صورت میں قابل فرض ہیں کہ جناب امیرؑ نے یہ فرمایا ہو کہ «فبایعت ابابکر عند ذالك و نهضت معه فی تلك الاحداث» جیسا کہ مستدرک نہج البلاغہ کو معیار بناتے ہوئے کتاب "راہی بہ سوی وحدت" میں نقل کیا گیا ہے، ورنہ بحار الانوار، کشف المحجہ اور رسائل جیسی کتابوں میں بیعت کی بات تک نہیں ہے اور ہم نے سبق نمبر ۳ میں متعدد مثالیں پیش کی ہیں جن میں جناب امیرؑ معاشرتی معاملات میں مداخلت فرماتے نظر آتے ہیں۔

[2] قارب فلانٌ في اموره: اقتصد۔ اقتَصَدَ فلانٌ في امرِ: استقام۔ رجوع فرمائیں: لسان العرب۔

[3] نہج السعادہ ۱/۲۹۳، خطبہ ۹۱ میں آیا ہے: «وَ وَلِيَ أَبُو بَكْرٍ فَسَارَ بِسِيرَةٍ رَضِيَهَا الْمُسْلِمُونَ.»

سوم: نصح کے معنی خلوص کے ہیں، جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ابوبکر کے ساتھ میرا رویہ فریب اور چالبازی پر مبنی نہیں تھا بلکہ میں نے مخلصانہ برتاؤ روا رکھا۔ اسی لیے جس چیز میں انھوں نے خدا کی اطاعت کی، میں نے بھی ان کی پیروی کی۔ یہ جملہ بھی بخوبی ظاہر کرتا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے ابوبکر کی مطلقاً اطاعت نہیں کی بلکہ صرف خدا کے قوانین کی اطاعت کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابوبکر کی حکومت دین کے مطابق نہیں تھی۔ یوں ایک بار پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام کا یہ عمل ابوبکر کی حقانیت اور ان کی حکمرانی پر حضرتؑ کی رضایت کی علامت نہیں ہے اور وہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ میں فریب کاری یا چالبازی کی وجہ سے معاشرے کے امور میں دخل اندازی نہیں کر رہا ہوں بلکہ چونکہ میں نے عدم محاذ آرائی کی روش اختیار کی ہے تو میں اپنی اسی روش پر قائم ہوں اور میں نے معاشرے کو اختلاف اور افراتفری میں نہیں ڈالا ہے۔[1]

چہارم: عمر کے بارے میں بھی جناب امیر علیہ السلام کے الفاظ کافی دلچسپ ہیں۔ اس سلسلے میں وہ عمر کی روش کو لوگوں کے درمیان مطلوبہ بتاتے ہیں، یہ نہیں کہتے کہ میرے نقطۂ نظر سے بھی وہ پسندیدہ ہے۔ اگرچہ عمر نے پچھلے خلیفہ کے مقابلے میں زیادہ جدت عمل کا مظاہرہ کیا تھا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرز حکومت ان کی سیرت سے ہٹ کر امور انجام دیے تھے۔ بالخصوص بیت المال کی تقسیم میں۔ لیکن انھوں نے ایسا طرز عمل اختیار کیا جس سے لوگ راضی اور خوش تھے، عثمان کے برخلاف جنھوں نے لوگوں کے حالات اور ان کے مقام و مرتبے کا بھی لحاظ نہیں کیا اور آخر میں ان کی انھیں بے اعتدالیوں نے لوگوں کو ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا۔

---

[1] ابن اثیر نے «النصيحة لأئمة المسلمين» کا مطلب: "أن يُطيعَهم في الحقّ ولا يَرَى الخروجَ عليهم اذا جارُوا" بتایا ہے۔

بہر صورت، ابوبکر اور عمر لوگوں کے نزدیک مقبول تھے اور انھوں نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی اور جناب امیر علیہ السلام اس چیز کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے اپنے دور حکومت میں بھی وہ، عمر کی بدعتوں کو پوری طرح تبدیل نہیں کر پائے۔ اس خط میں بھی امام نشاندہی کرتے ہیں: جب لوگ میرے پاس بیعت کے لیے آئے تو وہ ابوبکر اور عمر کا ہی طریقہ چاہتے تھے۔ چنانچہ بیعت کے وقت انھوں نے کہا:

«فَقَالُوا: بَايِعْنَا عَلَى مَا بُويِعَ عَلَيْهِ أَبُو بَكْرٍ وَ عُمَرُ. فَإِنَّا لَا نَجِدُ غَيْرَكَ وَلَا نَرْضَى إِلَّا بِكَ»

تو انھوں نے کہا: ہم آپ سے اسی بنیاد پر بیعت کرتے ہیں جس بنیاد پر ابوبکر اور عمر سے بیعت ہوئی تھی کیونکہ ہم سوائے آپ کے کسی اور کو نہیں پاتے اور ہم آپ کے علاوہ کسی پر راضی نہیں ہوں گے۔

اگرچہ اس کے جواب میں جناب امیر علیہ السلام اپنی بیعت کی بنیاد کو خدا کی کتاب اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرار دیتے لیکن لوگوں کے اس بیان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ گزشتہ دونوں خلفاء کی قدر و منزلت اب بھی ان کی نظروں میں باقی تھی۔[1]

مذکورہ بالا نکات کے مد نظر اگرچہ اس بیان میں پہلے اور دوسرے خلیفہ کی کوئی صریحی مذمت نہیں ہے لیکن ان دونوں حصوں کی اس طرح تشریح کی جانی چاہیے کہ وہ باقی فقرات کے ساتھ ہماہنگ ہوں۔ امام کے ذو معنی بیان کے داخلی و خارجی شواہد و قرائن کو نظر انداز کر کے اسے رضایت کی علامت سمجھ بیٹھنا ایک غیر علمی طریقہ ہے۔

---

[1] جیسا کہ اب بھی یہ سلسلہ باقی ہے اور عمر کا زہد اہل سنت کے نزدیک ضرب المثل اختیار کر چکا ہے یا ان کا ماننا ہے کہ عمر کو ایستادہ حالت میں دفن کیا گیا تاکہ عدل و انصاف ان کے ساتھ ختم نہ ہو جائے وغیرہ وغیرہ۔

سبق، ۲۴

دو اعتراض کا جائزہ

معاویہ کے جواب میں امیرالمومنین علیہ السلام کا خط

امیرالمومنین علیہ السلام کے جن بیانات کو مخالفین حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں ان میں سے ایک، معاویہ کو لکھا گیا آپ کا ایک خط ہے جس کے ایک حصے کو اپنے مطلب کا پاتے ہوئے مخالفوں نے اسے پیش کیا ہے۔ یہ وہی خط ہے جو ابودرداء اور ابوہریرہ کے ذریعے موصول ہونے والے معاویہ کے خط کے جواب میں حضرت نے لکھا تھا۔ اس خط کے فقرات کو دلیل قرار دیتے ہوئے مخالفین یہ ثابت کرنے کی کوشش میں ہیں کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام حکومت کے معاملے میں اپنا کوئی الٰہی حق نہیں سمجھتے تھے۔ مخالفوں کا بیان کچھ اس طرح ہے کہ امامؑ فرماتے ہیں:

«وَ اَلْوَاجِبُ فِي حُكْمِ اَللَّهِ وَ حُكْمِ اَلإِسْلاَمِ عَلَى اَلْمُسْلِمِينَ بَعْدَ مَا يَمُوتُ إِمَامُهُمْ أَوْ يُقْتَلُ ضَالاًّ كَانَ أَوْ مُهْتَدِياً مَظْلُوماً كَانَ أَوْ ظَالِماً حَلاَلَ اَلدَّمِ أَوْ حَرَامَ اَلدَّمِ أَنْ لاَ يَعْمَلُوا عَمَلاً وَ لاَ

يُحْدِثُوا حَدَثاً وَ لاَ يُقَدِّمُوا يَداً وَ لاَ رِجلاً وَ لاَ يَبْدَءُوا بِشَيْءٍ قَبْلَ أَنْ يَخْتَارُوا لِأَنْفُسِهِمْ إِمَاماً عَفِيفاً عَالِماً وَرِعاً عَارِفاً بِالْقَضَاءِ وَ اَلسُّنَّةِ يَجْمَعُ أَمْرَهُمْ وَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ وَ يَأْخُذُ لِلْمَظْلُومِ مِنَ اَلظَّالِمِ حَقَّهُ وَ يَحْفَظُ أَطْرَافَهُمْ وَ يَجْبِي فَيْئَهُمْ وَ يُقِيمُ حِجَّتَهُمْ وَ جُمُعَتَهُمْ وَ يَجْبِي صَدَقَاتِهِمْ ثُمَّ يَحْتَكِمُونَ إِلَيْهِ فِي إِمَامِهِمُ اَلْمَقْتُولِ ظُلْماً [وَ يُحَاكِمُونَ قَتَلَتَهُ إِلَيْهِ] لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ ...»

اللہ تعالیٰ کے حکم اور اسلام کے حکم میں جو چیز مسلمانوں پر واجب ہے وہ یہ ہے کہ ان کے حاکم کے مرنے یا قتل ہوجانے کے بعد، چاہے وہ گمراہ رہا ہو یا ہدایت یافتہ، مظلوم رہا ہو یا ظالم، اس کا خون بہانا حلال رہا ہو یا حرام، وہ لوگ تب تک کچھ نہ کریں اور کوئی کام نہ کریں، نہ ہاتھ آگے بڑھائیں نہ پاؤں اور نہ ہی کسی چیز کی شروعات کریں، جب تک اپنے لیے کوئی ایسا امام نہ چن لیں جو پاک دامن ہو، عفیف ہو، عالم اور متقی ہو، فیصلہ کرنے کا اہل اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شناسا ہو، جو ان کے امور کو منظم کردے اور ان کے درمیان حکومت کرے، مظلوم کو ظالم سے اس کا حق دلوائے، ان کی سرحدوں کی حفاظت کرے، ان کا ٹیکس وصول کرے، ان کے حج و جمعہ کو قائم کرے، ان کے مالی امور کو مجتمع کرے۔ اس کے بعد لوگ، ظلم کے ساتھ مارے گئے اپنے پیشوا کے بارے میں فیصلے کے لیے اس نئے پیشوا کے پاس جائیں تاکہ وہ ان کے درمیان صحیح فیصلہ کرے۔

خوب اچھی طرح سے (امیر المؤمنین علیہ السلام کے) ان لاجواب و آسمانی فقروں پر غور کیجیے اور اسلام کے ابدی قانون کو باب مدینۃ العلم کی زبانی سنیے !![1]

جناب امیر علیہ السلام کے بیان کے اس حصے کو لے کر مصنف لوگوں کے سامنے یہ نتیجہ رکھنے کی کوشش میں ہے کہ حکمِ خدا اور حکمِ اسلام کے مطابق حاکم اور حکمراں کا انتخاب لوگوں کے سپرد کیا گیا ہے۔ اسی لیے امیر المؤمنین علیہ السلام بھی اپنے لیے کسی الٰہی حق یا نص کے قائل نہ تھے۔

تجزیہ

اس خط کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے درج ذیل نکات پر غور کیجیے:

معاویہ کے ساتھ جناب امیر علیہ السلام کی خط و کتابت میں سے یہ ایک خط ہے جس کا تبادلہ ابو الدرداء اور ابوہریرہ کے توسط سے انجام پایا۔ معاویہ ان دونوں کو جناب امیر علیہ السلام کی خدمت میں بھیجتا ہے اور جناب امیر علیہ السلام کو پیغام دیتا ہے اور پھر امیر المؤمنین علیہ السلام بھی معاویہ کا جواب دیتے ہیں، ان میں سے کچھ پیغامات زبانی اور کچھ تحریری شکل میں پہنچائے گئے ہیں۔ ان مکالمات و بیانات میں معاویہ کا بنیادی دعویٰ عثمان کی خونخواہی کا دعویٰ یا ان کے خون کا بدلہ لینا ہے۔ وہ اس بہانے سے کہ عثمان بنی امیہ میں سے تھے، ان کے قاتلوں کو اپنے حوالے کیے جانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ جواب میں جناب امیر علیہ السلام بھی دوٹوک الفاظ میں بیان فرماتے ہیں کہ قاتلوں کا انجام کیا ہو؟ اس کا فیصلہ معاشرے کے حکمراں کی ذمہ داری ہے۔

اس خط میں امام پہلے فرماتے ہیں کہ ایک حکمراں کا وجود ایک قطعی اور یقینی معاملہ ہے اور سماج بغیر حاکم کے نہیں رہ سکتا۔ سماج کے معاملات کی گردش ایک حاکم کے وجود پر منحصر ہوتی ہے،

---

[1] حکومت در اسلام/۲-۷۳ اور اسی سے مشابہ گزشتہ حوالہ: ۲۵۵۔

لوگوں پر بھی یہی فرض ہے کہ وہ اپنے معاملات اس پر چھوڑ دیں اور افراتفری کی صورت حال کو روکیں اور اس کے فیصلے اور حکم کو تسلیم کریں۔[1] در حقیقت امام فرماتے ہیں: حاکم کا وجود ضروری ہے اور عوام کو اس کے تابع ہونا چاہیے، نہ یہ کہ اسلام میں حکمراں کا انتخاب لوگوں پر فرض ہے۔ لہٰذا ایسا نہیں ہو سکتا کہ معاویہ، عثمان کی خونخواہی کے بہانے میری حکمرانی کو قبول نہ کرے بلکہ اسے میری حکمرانی قبول کرنا چاہیے اور معاملہ مجھ پر چھوڑ دینا چاہیے۔

اہم نکتہ یہ ہے کہ جناب امیر علیہ السلام یہ کہنے کے بعد، اشارہ فرماتے ہیں کہ یہ حاکم یا تو خود لوگوں کی پسند سے ہوتا ہے یا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتخاب سے اور ہر صورت میں وہ، جو ابھی معاشرے کا حکمران ہے (یعنی امیر المومنین علیہ السلام) دونوں ہی لحاظ سے امت کا حاکم ہے اور معاویہ کو چاہیے کہ وہ اس حقیقت کو قبول کر لے اور عثمان کی خونخواہی کو حاکم کی بیعت ترک کرنے کے لیے بہانے کے طور پر استعمال نہ کرے:

«فَإِنْ كَانَ اَللّٰهُ جَلَّ اِسْمُهُ جَعَلَ اَلاِخْتِيَارَ إِلَى اَلْأُمَّةِ وَ هُمُ اَلَّذِينَ يَخْتَارُونَ وَ يَنْظُرُونَ لِأَنْفُسِهِمْ وَ اِخْتِيَارُهُمْ لِأَنْفُسِهِمْ وَ نَظَرُهُمْ لَهَا خَيْرٌ لَهُمْ مِنِ اِخْتِيَارِ اَللّٰهِ وَرَسُولِهِ لَهُمْ وَ كَانَ مَنِ اِخْتَارُوهُ وَ بَايَعُوهُ بَيْعَتُهُ بَيْعَةُ هُدًى وَ كَانَ إِمَاماً وَاجِباً عَلَى اَلنَّاسِ طَاعَتُهُ وَ نُصْرَتُهُ فَقَدْ تَشَاوَرُوا فِيَّ وَ اِخْتَارُونِي بِإِجْمَاعٍ مِنْهُمْ»

اگر امام کا انتخاب اللہ نے لوگوں کے سپرد کر دیا ہے تو اپنے لیے (امام) منتخب کرنے والے وہی ہیں اور وہی رائے دینے والے ہیں۔ اور اگر ایسا ہے کہ ان کا اپنے لیے

---

[1] اس حقیقت کو جناب امیر علیہ السلام نے دوسری جگہوں پر بھی بیان کیا ہے: «وَ إِنَّهُ لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ أَمِيرٍ بَرٍّ أَوْ فَاجِرٍ» نہج البلاغہ/خطبہ ۴۰۔

کسی خلیفہ کو منتخب کرنا اور رائے دینا، اللہ اور اس کے رسول کے انتخاب سے بہتر ہے، تو ان لوگوں نے جسے منتخب کیا ہے اور جس کی بیعت کی ہے وہ ہدایت کی بیعت ہے اور وہ ایسا امام ہے جس کی اطاعت اور مدد لوگوں پر واجب ہے تو بلاشبہ لوگوں نے میرے بارے میں مشورہ کیا اور تمام لوگوں نے اجماع سے مجھے خلیفہ منتخب کیا۔

«وَ إِنْ كَانَ اَللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ هُوَ اَلَّذِي [يَخْتَارُ لَهُ اَلْخِيَرَةَ فَقَدِ] اِخْتَارَنِي لِلْأُمَّةِ وَ اِسْتَخْلَفَنِي عَلَيْهِمْ وَ أَمَرَهُمْ بِطَاعَتِي وَ نُصْرَتِي فِي كِتَابِهِ اَلْمُنْزَلِ وَ سُنَّةِ نَبِيِّهِ صَلَّى اَللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ فَذَلِكَ أَقْوَى لِحُجَّتِي وَ أَوْجَبُ لِحَقِّي.»[1]

اور اگر خلیفہ منتخب کرنا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یقیناً انتخاب کا اختیار صرف اسی کے ہاتھ میں ہے، تو اس نے مجھے امت کے لیے خلیفہ منتخب کر لیا ہے، مجھے ان کا خلیفہ مقرر کیا ہے اور انھیں میری اطاعت و نصرت کا حکم دیا ہے اور یہ چیز خدا کی کتاب اور اس کے نبی ﷺ کی سنت میں واضح ہے، بنابریں یہ چیز میری دلیل کو مزید مضبوط بناتی اور میرے حق کو زیادہ تقویت عطا کرتی ہے۔

جیسا کہ دیکھا جا سکتا ہے امیر المومنین علیہ السلام، عثمان کے خون کا بدلہ مانگنے کے معاویہ کے بہانے کے جواب میں اسے اپنی اطاعت کا پابند رہنے کا حکم دیتے ہیں اور یہ بھی واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ نے امت پر حکمرانی کے لیے انھیں منتخب کیا ہے۔ حالانکہ

(۱) کتاب سلیم/۲۹۱-۲۹۲، ح۲۵ اور تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ: بحار الانوار ۳۳/۱۴۴، ح۴۲۱، سبق نمبر ۷ میں بھی اس بیان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شوریٰ اور ووٹنگ والے نظریے کو مان کر بھی معاویہ کے پاس امام کے فیصلے اور ان کی حکومت کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔

اسی طرح ان خطوط میں بھی، امامؑ نے جابجا اپنے الٰہی حق کو بیان کیا ہے اور غدیر خم کے میدان میں اپنی الٰہی تنصیب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ انھوں نے خلافت غصب کیے جانے کے خلاف ردعمل میں رسول خدا کے عہد و پیمان کا ذکر کیا ہے اور ہم نے پچھلے اسباق میں ان حصوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔

لہٰذا امام کے حکم کا ایک حصہ لینا اور باقی کو اپنے مفاد کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے چھوڑ دینا ایک غیر علمی طریقہ یا دوسرے الفاظ میں علمی خیانت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد امت کے طریقۂ کار کے باطل ہونے پر آپؐ کے صریح ارشادات کو درکنار کر دینا، جناب امیر علیہ السلام سے بغض و عداوت کی علامت ہے۔

برادرانہ اختلافات!

مخالفین اور یہاں تک کہ بعض نادان شیعوں کی طرف سے اٹھایا جانے والا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام، اپنے دور حکومت تک میں، جب وہ اپنے مخالفین سے جنگ کر رہے تو اپنے مخالف کو مسلمان سمجھتے تھے اور اپنے کے اور ان کے درمیان اختلاف کو برادرانہ اختلاف قرار دیتے تھے تو پھر گزشتہ خلفاء کے زمانے کی تو بات ہی جدا ہے جہاں آپؐ اور دیگر مسلمانوں کے درمیان اختلافات جنگ اور تصادم کی سطح تک نہیں پہنچے تھے۔

«... وہ نکتہ یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد والے اسلامی معاشرے کی طرح کسی سماج کے اندر اختلافات دو طرح کے ہو سکتے ہیں اور ان کی دو طرح سے تشریح کی جا سکتی ہے، ایک برادرانہ اختلاف اور دوسرا معاندانہ اختلاف۔

اسلام کے آغاز میں مسلمانوں خاص طور پر امام علی □ اور پیغمبر ﷺ کے نامور صحابہ کے درمیان رسول اللہ کی وفات کے بعد جو کچھ ہوا، وہ یقینی طور پر دوستانہ نوعیت کا اختلاف تھا۔

... کیسے ممکن ہے کہ امام علیہ السلام ایک ایسی حکمرانی کے لیے، جسے آپؑ ایک جوتے سے بھی زیادہ بے وقعت سمجھتے تھے، کسی مسلمان کے تئیں کینہ دل میں رکھیں۔ امام علی علیہ السلام نے جنگ جمل کے خاتمے کے بعد جنگ کی آگ بھڑکانے والوں کے بارے میں فرمایا تھا: «اخوانُنا بَغَوْا عَلَينا» یہ ہمارے بھائی تھے جنھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی اور ہم پر ظلم کیا! کتنی عجیب بات ہے کہ حضرت علی علیہ السلام، جو جنگ بھڑکانے اور اپنے خلاف ہتھیار اٹھانے والوں کے بارے میں اتنے برادرانہ طریقے سے بات کرتے ہیں، خلیفۂ دوم کی تعریف کے دوران ان کے منفی پہلوؤں کا بھی ذکر کریں!

اس طرح کی باتیں کرنے والے کا ارادہ ہے کہ امام علیہ السلام کے کلام میں[1] بیان شدہ اخوّت کو، ایمانی اخوت قرار دیتے ہوئے ان کے اور دوسروں کے درمیان اختلافات کو قرآن مجید کی اس آیت کا مصداق بتایا جائے:

﴿وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ * إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾[2]

---

[1] رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۳۲/۳۲۴، ح ۲۹۸، قرب الاسناد سے منقول، اسی سے مشابہ: نہج البلاغہ/ خطبہ ۱۲۲۔
[2] حجرات (۴۹)/۹-۱۰۔

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو تو اگر ان میں سے ایک، دوسرے پر ظلم کرے تو اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے... بے شک مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں تو اپنے بھائیوں میں صلح کرا دو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

تجزیہ

مذکورہ بالا بیان کے جواب میں دو نکات پر توجہ دینا ضروری ہے:

اوّل: جہاں کہیں بھی اُخوّت کا ذکر ہو وہاں ضروری نہیں کہ اس کا مطلب ایمانی بھائی چارہ ہی ہو۔

اسی طرح کا ایک اعتراض، ایک شامی نے امام سجادؑ کیا تھا اور کہا تھا: کیا تمہارا باپ وہی ہے جس نے مومنین کو قتل کیا؟ مرد شامی کی یہ بات سن کر امام کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور انھوں نے فرمایا: تم اتنے یقین سے میرے والد کی طرف اس طرح کی تہمت کیسے منسوب کر سکتے ہو؟!! شامی جواب دیتا ہے:

«إلى قَوْلِهِ: «إِخْوَانُنَا قَدْ بَغَوْا عَلَيْنَا، فَقَاتَلْنَاهُمْ عَلَى بَغْيِهِمْ». فَقَالَ: «وَيْلَكَ أَمَا تَقْرَأُ الْقُرْآنَ؟» قَالَ: بَلَى. قَالَ: «فَقَدْ قَالَ اللَّهُ: ﴿وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْباً﴾[1] ﴿وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحاً﴾[2] فَكَانُوا إِخْوَانَهُمْ فِي دِينِهِمْ أَوْ فِي عَشِيرَتِهِمْ؟» قَالَ لَهُ الرَّجُلُ: لَا بَلْ

---

[1] اعراف (۷)/۸۵، ھود (۱۱)/۸۴، عنکبوت (۲۹)/۳۶۔

[2] اعراف (۷)/۷۳، ھود (۱۱)/۶۱۔

فِي عَشِيرَتِهِمْ. قَالَ: «فَهَؤُلاَءِ إِخْوَانُهُمْ فِي عَشِيرَتِهِمْ، وَ لَيْسُوا إِخْوَانَهُمْ فِي دِينِهِمْ». قَالَ: فَرَّجْتَ عَنِّي فَرَّجَ اَللَّهُ عَنْكَ.»[1]

ان (امیرالمؤمنین) کے اس بیان کی وجہ سے: "یہ ہمارے بھائی ہیں جنھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی، لہذا ہم نے ان کی زیادتی و بغاوت کی وجہ سے ان سے جنگ کی۔" امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں: وائے ہو تم پر! کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ شامی نے کہا: کیوں نہیں، پڑھتا ہوں۔ امام نے کہا: قرآن مجید میں خداوند عالم فرماتا ہے: "اور مدیَن والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔" یا "اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔" یہ بتاؤ کہ حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام ان کے دینی بھائی تھے یا ان کے قبیلے والے اور ہمشہری؟ اس شخص نے کہا: وہ ان کے قبیلے والے اور ہمشہری تھے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: تو پھر یہ بھی (جنگ جمل والے) امیرالمومنین علیہ السلام کے ایمانی بھائی نہیں بلکہ ساتھی، ہمشہری اور قبیلے والے تھے۔ شامی شخص نے کہا: آپ نے میرا مسئلہ حل کر دیا خدا آپ کے معاملات میں آسانی فراہم کرے۔

جیسا کہ دیکھا جا سکتا ہے، امام سجاد علیہ السلام قرآن مجید کی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے - کہ جن میں انبیائے الٰہی اور مشرکین کے درمیان اخوّت اور بھائی چارے کے تعلق کا ذکر ہے - بیان فرماتے ہیں: ہر جگہ اخوّت کا مطلب ایمانی اخوّت نہیں ہے بلکہ قوم و قبیلے اور شہری ساتھیوں کو بھی بھائی کہا جاتا ہے۔ لہذا امیرالمؤمنین علیہ السلام کے کلام میں جس برادری و اخوّت کا تذکرہ ہے اس سے لازمی طور پر اہل جمل کے ساتھ آپؑ کی ایمانی اخوّت کے معنی کو ہی اخذ کرنا صحیح نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر عیاشی ۲/۲۰، ح ۵۳، برہان ۲/۲۵، بحار الانوار ۳۲/۳۴۵، ح ۳۲۹، اسی سے مشابہ: علل الشرائع ۱/۲۶۳ باب ۱۹۰۔

دوم: یہی سوال جنگ جمل کے دوران جناب امیرؑ سے پوچھا گیا تھا اور آپؑ نے اپنے اور اپنے مخالفین کے درمیان تعلقات کو-سورہ الحجرات میں مذکور ایمانی اخوّت سے-الگ انداز میں بیان کیا۔

« اصبغ بن نباتہ کہتے ہیں: میں جنگ جمل میں امامؑ کے ساتھ تھا جب ایک آدمی نے آکر پوچھا: اے امیرالمؤمنینؑ! ان لوگوں نے تکبیر کہی اور ہم نے بھی کہی، انھوں نے تہلیل کہی اور ہم نے بھی، انھوں نے نماز پڑھی اور ہم نے بھی، تو ہم کس لیے اور کس بنیاد پر یہ جنگ لڑ رہے ہیں؟ جناب امیرؑ نے جواب میں فرمایا:

«علی هذه الآية: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۘ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ ۖ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۚ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِن بَعْدِهِم ؛«فَنَحْنُ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ» مِّن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَٰكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ وَمِنْهُم مَّن كَفَرَ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ﴾[1] فَنَحْنُ الَّذِي آمَنَّا وَ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَقَالَ الرَّجُلُ كَفَرَ الْقَوْمُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ ثُمَّ حَمَلَ فَقَاتَلَ حَتَّى قُتِلَ رَحِمَهُ اللَّهُ.»

اس آیت کی بنیاد پر: "یہ سب رسول (جو ہم نے مبعوث فرمائے) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، ان میں سے کسی سے اللہ نے (براہِ راست) کلام فرمایا اور کسی کو درجات میں (سب پر) فوقیت دی (یعنی حضور نبی کریم ﷺ کو تمام درجات میں سب پر بلندی عطا فرمائی) اور ہم نے مریم کے فرزند عیسیٰ کو واضح نشانیاں عطا کیں اور

---

[1] بقرہ(۲)/۲۵۳۔

ہم نے پاکیزہ روح کے ذریعے ان کی مدد فرمائی اور اگر اللہ چاہتا تو ان رسولوں کے پیچھے آنے والے لوگ اپنے پاس کھلی نشانیاں آجانے کے بعد آپس میں کبھی بھی نہ لڑتے جھگڑتے۔" (پھر جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا:) چنانچہ ہم وہ ہیں جو رسولوں کے بعد آئے۔ (اس کے بعد امیر المومنین علیہ السلام نے آیت کی تلاوت کا سلسلہ جاری رکھا:) "مگر انھوں نے واضح نشانیاں آنے کے بعد بھی اختلاف کیا تو ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ نے کفر اختیار کیا، (اور یہ بات یاد رکھو کہ) اگر اللہ چاہتا تو وہ کبھی بھی باہم نہ لڑتے لیکن اللہ جو چاہتا ہے، وہی کرتا ہے۔" چنانچہ ہم وہ ہیں جو کہ جو ایمان لائے اور وہ لوگ، وہی کافر ہیں۔ اس شخص نے کہا: ربِّ کعبہ کی قسم! وہ قوم کافر ہو چکی ہے اور یہ کہتے ہوئے اس نے دشمن کی فوج پر حملہ کیا اور مرتے دم تک جنگ کرتا رہا، خدا اس پر اپنی رحمت نازل فرمائے"۔

جس آیت کریمہ کو جناب امیر علیہ السلام نے بطور حوالہ پیش کیا ہے اس میں غور و فکر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے؛

اوّل: معاملہ اس طرح نہیں کہ جناب امیر علیہ السلام نے سب سے پہلے برادر کشی کا ارتکاب کیا بلکہ انبیاء کی امت کے درمیان اختلافات اور ان کے درمیان جنگ کی مثال ماضی میں بھی ملتی ہے اور خدا کا حکم اور اس کی مشیّت بھی ان جنگوں سے وابستہ رہی ہے۔

دوم: یہ جنگیں برادر کشی نہیں تھیں، بلکہ یہ جنگیں ایمان اور کفر کی جنگیں تھیں اور امیر المؤمنین علیہ السلام نے بھی اپنے اور اہل جمل کے درمیان جنگ کو ایمان اور کفر کے درمیان جنگ کے طور پر بیان کیا ہے؛ مومنوں کے دو گروہوں میں اختلاف کے طور پر نہیں!

لہٰذا امیر المومنین علیہ السلام کے بیان کی صحیح تشریح وہی ہے جو امام سجاد علیہ السلام نے کی ہے، جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ امیر المؤمنین علیہ السلام کا اخوّت سے مطلب ہم قبیلہ اور ہم شہری ہونا ہے نہ کہ ایمانی برادر ہونا جس کو بہانہ بنا کر تمام غاصبوں اور ظالموں کے ظلم اور جناب امیر علیہ السلام کے الٰہی حق پر

ناجائز قبضہ جمانے والوں کو بری الذمہ کرتے ہوئے ان کے ظالمانہ اقدام اور وحشیانہ کارناموں پہ پردہ ڈالا دیا جائے اور صدرِ اسلام میں رونما ہونے والے واقعات واختلافات کو دو بھائیوں کا اختلاف ثابت کر کے معاملے کی سنگینی کو کم کرنے کا جرم کیا جائے۔ اس طرح امیر المؤمنین علیہ السلام کے تمام بیانات، شکایات اور فریادوں کو معمولی سمجھنے کی بھول کرتے ہوئے اسے بس جناب امیر علیہ السلام کی طرف سے خلفاء کے مثبت اور منفی نکات گنوانے تک ہی محدود کر دیا جائے!

خطبہ نمبر ۱۲۲ کا جائزہ

مذکورہ بالا بحث کو مزید کھینچتے ہوئے ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ جناب امیر علیہ السلام کے کلام کے سلسلے میں بیان کی گئی آپ کی تشریح، نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۲۲ پر لاگو نہیں ہوتی کیونکہ اس خطبے میں جناب امیر علیہ السلام خوارج کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«... وَلٰكِنَّآ اِنَّمَآ اَصْبَحْنَا نُقَاتِلُ اِخْوَانَنَا فِی الْاِسْلَامِ عَلٰی مَا دَخَلَ فِيْهِ مِنَ الزَّيْغِ وَالْاِعْوِجَاجِ، وَالشُّبْهَةِ وَالتَّاْوِيْلِ ...»[1]

... مگر اب ہم کو ان لوگوں سے، جو اسلام کی رُو سے ہمارے بھائی کہلاتے ہیں، جنگ کرنا پڑ گئی ہے، چونکہ (ان کی وجہ سے) اس میں گمراہی، کجی، شبہات اور غلط تاویلات داخل ہو گئی ہیں...

جواب میں ہم کہتے ہیں:

اولاً: خطبے کے آغاز میں ہی، امام علیہ السلام نے خوارج کو یاد دلایا: جب معاویہ کے ساتھیوں نے قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کیا تو یہ تم ہی تھے جنھوں نے مجھ سے کہا: یہ ہمارے بھائی اور

---

[1] اس خطبے کا نمبر مختلف نسخوں کے مطابق الگ الگ بھی ہو سکتا ہے جیسے خطبہ نمبر ۱۲۰۔

ہمارے مذہب والے ہیں، ہمیں ان کی دعوت قبول کرنی ہوگی اور ہمیں ان کی معافی کو ماننا ہی ہوگا اور میں نے تم سے کہا تھا: یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے ظاہر میں ایمان اور باطن میں دشمنی ہے۔

یہ بیان واضح کرتا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام اہل شام کی طرف سے قرآن مجید کو حکم بنائے جانے کے دعوے کو قبول نہیں کرتے تھے اور شامیوں کے معاملے میں اپنے ساتھیوں کے نظریات سے متفق نہیں تھے، لہٰذا اس خطبے کا ابتدائی حصہ مخالف گروہ کے کفر کو بیان کرتا ہے۔

ثانیاً: جناب امیر علیہ السلام اسی خطبے میں اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں: ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اس وقت بھی جنگ کرتے تھے جب مقابلے پر خاندانوں کے بزرگ بچے، بھائی بند اور رشتہ دار ہوتے تھے لیکن ہر مصیبت و شدت پر ہمارے ایمان میں اضافہ ہوتا تھا... مگر افسوس کہ اب ہمیں مسلمان بھائیوں سے جنگ کرنا پڑ رہی ہے۔

یہ دو نکات ہمارے لیے اس حقیقت کو عیاں کر سکتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام کے کلام کو دوسرے معنی پر بھی حمل کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں، ہم اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کے ساتھ لڑتے تھے جو شرک کے لباس میں تھے لیکن اب ہم ان سے اسلام کے پرچم تلے لڑ رہے ہیں۔ لہٰذا امام علیہ السلام کے اس کلام میں بھی اخوت کو رشتہ داری کے معنوں لیا جا سکتا ہے۔[1]

---

[1] ایک دوسرا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب اِس زمانے میں کہ جب اسلام کا بول بالا ہے ان سے لڑ رہے ہیں جب کہ پہلے ہماری جنگ ہمارے قبیلے اور بھائی بندوں سے پرچم اسلام کی سربلندی کے لیے تھی۔

ثالثاً: ایک دوسرا نکتہ جو اس خطبے میں توجہ طلب ہے وہ جناب امیر علیہ السلام کی طرف سے اسلام کے نام کا مخالفوں پر اطلاق ہے کیونکہ خطبے کے ابتدائی حصے کو دیکھتے ہوئے، جہاں امیرالمومنین علیہ السلام ان کے ایمان کو ظاہری ایمان بتاتے ہیں، کہا جاسکتا ہے کہ اسلام اور ایمان کے درمیان فرق کے مدنظر- کہ جس میں پہلا ظاہری اور دوسرا باطنی ہے- زیادہ سے زیادہ جو بات امیرالمؤمنین علیہ السلام کے بیان سے اخذ کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ انھیں مسلمان سمجھا جائے اور یہ بات یقینی ہے کہ معاویہ اور اس کے ساتھی زبان سے شہادتین کہنے کے بعد بظاہر مسلمان ہو گئے تھے لیکن اس سے ان کا حقیقی ایمان ثابت نہیں ہوتا، معاملے کو واضح کرنے کے لیے دو نکات قابل غور ہیں:

پہلا: یہاں تک کہ اہلسنت کے عقیدوں کے مطابق بھی، اس زمانے میں امیرالمؤمنین علیہ السلام ہی امام تھے اور امام کے خلاف کسی بھی طرح کا خروج کفر ہے۔ چنانچہ ابن ابی الحدید کے مطابق امام علیہ السلام نے «فی الاسلام» کی قید لگا کر انھیں مشرکوں اور بت پرستوں سے الگ کیا ہے نہ یہ کہ آپؑ ان کی تعریف کر رہے ہوں۔[1] دوسرے الفاظ میں: یہ شناختی کارڈ والے مسلمان ہیں، ورنہ حقیقت میں کافر ہی ہیں۔

دوسرا: شیعوں اور سنیوں کے درمیان متواتر احادیث و روایات سے ثابت ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: «يَا عليُّ! حُبُّكَ إِيمَانٌ و بُغضُكَ كفرٌ» اور «حَرْبُكَ

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ۷/۲۹۹

حَرْبِي»[1] تو یقیناً وہ لوگ جو امیر المؤمنین علیہ السلام کے خلاف کھڑے ہوئے اور آپؑ کے ساتھ لڑے ان کا ایمان حقیقی نہیں تھا اور وہ امام علیہ السلام کے ایمانی بھائی نہیں مانے جاسکتے۔ سورۂ الحجرات کی آیات بھی مومنین کے دو گروہوں کے بارے میں بتاتی ہیں جس کے مطابق امام علیہ السلام کے مخالفین اپنی دشمنی اور نفرت ظاہر کرتے ہوئے ایمان کے دائرے سے خارج ہوگئے ہیں۔[2]

لہٰذا جناب امیر علیہ السلام کے اس طرح کے کلام سے بھی مخالفین کے ساتھ آپؑ کی رضایت کی نہ تو تائید ہوتی ہے اور نہ ہی اسے مخالفوں سے آپؑ کی رضامندی کی علامت سمجھا جاسکتا ہے چاہے وہ آپؑ کی خاموشی اور خانہ نشینی کا دور ہو یا پھر وہ دور ہو جب آپؑ برسرِ اقتدار آئے۔

---

[1] رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۳۹/۳۱۰-۳۴۶، باب أن حبہ ایمن و بغضہ کفر و نفاق، الغدیر ۳/۱۸۹-۱۸۱، باب علامۃ المؤمن والمنافق، شرح ابن ابی الحدید ۱/۳۶۴ اور گزشتہ حوالہ ۲/۴۵۱-۲۸۴ اور گزشتہ حوالہ ۸/۱۱۹ خطبہ نمبر ۱۲ کے ذیل میں، بحار الانوار ۳۲/۳۴۲-۳۱۹، باب حکم من حارب علیاً۔

[2] رجوع فرمائیں: بحار الانوار ۳۲/۳۲۵-۳۱۹۔

سبق ۲۵

خطبہ نمبر ۲۲۸ کا جائزہ [1]

نہج البلاغہ کا ایک اور خطبہ، جسے خلفاء سے آپؑ کی رضامندی کا وہم پھیلانے کے لیے پیش کیا جاتا ہے، خطبہ نمبر ۲۲۸ ہے جس کے بارے میں اس سبق میں گفتگو ہوگی:

«وَمِنْ كَلَامِهِ عليه السلام يُرِيدُ بِهِ بَعْضَ أَصْحَابِهِ: لِلَّهِ بَلَاءُ فُلَانٍ فَلَقَدْ قَوَّمَ الأَوَدَ وَدَاوَى الْعَمَدَ وَأَقَامَ السُّنَّةَ وَخَلَّفَ الْفِتْنَةَ ذَهَبَ نَقِيَّ الثَّوْبِ قَلِيلَ الْعَيْبِ أَصَابَ خَيْرَهَا وَسَبَقَ شَرَّهَا أَدَّى إِلَى اللَّهِ طَاعَتَهُ وَاتَّقَاهُ بِحَقِّهِ رَحَلَ وَتَرَكَهُمْ فِي طُرُقٍ مُتَشَعِّبَةٍ لَا يَهْتَدِي بِهَا الضَّالُّ وَلَا يَسْتَيْقِنُ الْمُهْتَدِي.»

---

[1] اس خطبے کا نمبر مختلف نسخوں کے مطابق الگ الگ بھی ہو سکتا ہے جیسے خطبہ نمبر ۲۲۵۔

اللہ فلاں شخص [1] کا بھلا کرے کہ اس نے کجی کو سیدھا کیا اور مرض کا علاج کیا، سنت کو قائم کیا اور فتنوں کو چھوڑ کر چلا گیا، دنیا سے اس عالم میں گیا کہ اس کا لباس حیات پاکیزہ تھا اور اس کے عیب بہت کم تھے، اس نے دنیا کے خیر کو حاصل کر لیا اور اس کے شر سے آگے بڑھ گیا۔ اللہ کی اطاعت کا حق ادا کر دیا اور اس سے مکمل طور پر خوفزدہ رہا، وہ دنیا سے اس عالم میں رخصت ہوا کہ لوگ متفرق راستوں پر تھے جہاں نہ گمراہ ہدایت پا سکتا تھا اور نہ ہدایت یافتہ منزل یقین تک جا سکتا تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ خطبہ خلیفۂ دوم کی موت کے وقت کا ہے اور جناب امیر علیہ السلام کا اس طرح سے عمر کی تعریف کرنا شیعہ عقائد کے ساتھ میل نہیں کھاتا اور یہ کلام اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حضرتؑ، خلیفہ سے راضی و خوشنود تھے۔

جناب امیر علیہ السلام کا کلام یا کسی اور کا بیان

اس خطبے کی جانچ پڑتال کے لیے سب سے پہلے ہمیں اس کے مآخذ پر نظر ڈالنی ہوگی۔ اس خطبے کا اکلوتا مآخذ تاریخ طبری ہے کہ جس میں کچھ اس طرح منقول ہے:

---

[1] ابن ابی الحدید نے ساتویں صدی ہجری میں یہ انکشاف کیا کہ ان فقرات میں فلاں سے مراد حضرت عمر ہیں اور پھر اس کی وضاحت میں ۸۷ صفحے سیاہ کر ڈالے حالانکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ سید رضیؒ کے دور کے نسخوں میں اس کا کوئی تذکرہ ہے اور پھر اسلامی دنیا کے سربراہ کی تعریف کے لیے لفظ فلاں کے کوئی معنی نہیں ہیں خطبہ شقشقیہ میں لفظ فلاں کا امکان ہے لیکن مدح میں لفظ فلاں عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے۔ اس نکتے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی ایسے صحابی کا تذکرہ ہے جسے عام لوگ برداشت نہیں کر سکتے ہیں اور امیر المومنین علیہ السلام اس کی تعریف ضروری سمجھتے ہیں۔

«عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ، قَالَ: لَمَّا مَاتَ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ بَكَتْهُ ابْنَةُ اَبِي حَثْمَةَ. فَقَالَتْ: وَا عُمَرَاهُ! اَقَامَ الْاَوَدَ. وَ اَبْرَاَ الْعَمَدَ. اَمَاتَ الْفِتَنَ. وَ اَحْيَا السُّنَنَ. خَرَجَ نَقِيَّ الثَّوْبِ. بَرِيْئًا مِّنَ الْعَيْبِ.

مغیرہ ابن شعبہ سے روایت ہے کہ جب حضرت عمر انتقال کر گئے تو ابی حثمہ کی بیٹی نے روتے ہوئے کہا: ہائے عمر! تو وہ تھا جس نے کجی کو سیدھا کیا، بیماریوں کو دور کیا، فتنوں کو مٹایا اور سنتوں کو زندہ کیا، پاکیزہ دامن اور عیبوں سے بچ کر چل بسا۔

قَالَ: وَ قَالَ الْمُغِيْرَةُ بْنُ شُعْبَةَ: لَمَّا دُفِنَ عُمَرُ اَتَيْتُ عَلِيًّا عليه السلام وَ اَنَا اُحِبُّ اَنْ اَسْمَعَ مِنْهُ فِيْ عُمَرَ شَيْئًا. فَخَرَجَ يَنْفُضُ رَاْسَهٗ وَلِحْيَتَهٗ وَقَدِ اغْتَسَلَ. وَ هُوَ مُلْتَحِفٌ بِثَوْبٍ. لَا يَشُكُّ اَنَّ الْاَمْرَ يَصِيْرُ اِلَيْهِ. فَقَالَ: يَرْحَمُ اللهُ ابْنَ الْخَطَّابِ! لَقَدْ صَدَقَتِ ابْنَةُ اَبِيْ حَثْمَةَ. لَقَدْ ذَهَبَ بِخَيْرِهَا. وَ نَجَا مِنْ شَرِّهَا. اَمَا وَاللهِ! مَا قَالَتْ. وَلٰكِنْ قُوِّلَتْ.»[1]

مغیرہ نے بیان کیا کہ جب حضرت عمر دفن ہو گئے تو میں حضرت علی علیہ السلام کے پاس آیا۔ میں چاہتا تھا کہ آپ سے حضرت عمر کے بارے میں کچھ سنوں۔ حضرتؑ باہر تشریف لائے اس حالت میں کہ آپ غسل فرما کر لباس زیب تن کیے ہوئے تھے اور سر اور داڑھی کے بالوں کو جھٹک رہے تھے۔ آپ کو اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ خلافت آپ ہی کی طرف پلٹے گی۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا: خدا ابن خطاب پر رحم کرے! ابی حثمہ کی بیٹی نے سچ کہا ہے کہ وہ خلافت کے فائدے اٹھا گئے اور بعد میں پیدا ہونے والے فتنوں سے بچ نکلے۔ خدا کی قسم! بنت ابی حثمہ نے کہا نہیں بلکہ اس سے کہلوایا گیا ہے۔

ان باتوں سے واضح ہو جاتا ہے:

---

[1] تاریخ طبری ۲۸۵/۳، باب من ندب عمر ورثاہ...۔

اولاً: نہج البلاغہ میں جس چیز کو جناب امیر علیہ السلام کے خطبے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، وہ دراصل ابی حثمہ کی بیٹی کے الفاظ ہیں، جس کی، مغیرہ کے مطابق جناب امیر علیہ السلام نے تصدیق کی ہے۔

ثانیاً: اس بیان کا راوی مغیرہ ابن شعبہ ہے، جو اپنی بدکاری کے لیے جانا جاتا ہے اور فاسق کے طور پر مشہور تھا۔ وہ امیر المؤمنین علیہ السلام کا دشمن اور آپؑ کے گھر پر حملہ کرنے والوں میں سے ایک ہے۔

ثالثاً: اس روایت کا ماخذ تاریخ طبری ہے جو شیعہ ماخذ میں سے نہیں ہے۔ لہٰذا اس خطبے کو شیعہ ماخذ سے ثبوت نہیں مانا جاسکتا۔ امیر المؤمنین علیہ السلام کی جانب اس خطبے کو منسوب کیا جانا کسی قطعی اور قابل قبول دلیل کی بنیاد پر نہیں ہے اور مغیرہ اور طبری کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں۔

تقریر کے مواد کی جانچ پڑتال

اس بیان کو امیر المؤمنین علیہ السلام سے منسوب کیے جانے میں حوالے اور ماخذ کی جو کمزوری ہے وہ تو اپنی جگہ ہے ہی، اس کے علاوہ اس کے مندرجات پر توجہ دینا بھی ضروری ہے جس سے اس کے مضمون سے غلط فائدہ اٹھانے کی مخالفین کی کوشش صاف طور پر باطل ہوتی نظر آئے گی۔

اس کلام کے اختتام پر ایک جملہ ہے جو عمر کی مذمت اور برائی پر دلالت کرتا ہے۔ جملہ کچھ اس طرح بیان ہوا ہے: "وہ دنیا سے اس عالم میں رخصت ہوا کہ لوگ متفرق راستوں پر تھے، جہاں نہ گمراہ ہدایت پا سکتا تھا اور نہ ہدایت یافتہ منزل یقین تک جا سکتا تھا۔" اس خطبے کا یہ حصہ مجموعی طور پر عمر کی حکومت کا پورا نقشہ کھینچتا ہے اور بتاتا ہے کہ عمر کی حکومت میں لوگ سرگرداں رہے۔ اسی طرح «خَلَّفَ الْفِتْنَةَ» کے الفاظ بھی اس نتیجے کی مزید تصدیق کرتے ہیں

کہ عمر نے اپنے بعد فتنے چھوڑے۔ ابن ابی الحدید کے بقول عمر کے فتنوں میں سے ایک شوریٰ کی تشکیل تھی جو ابد تک دنیا میں ہر فتنے کا سبب ہے۔[1]

اس بیان کے کچھ دوسرے حصے ایسے ہیں جن میں نہ ہی تعریف ہیں اور نہ ہی مذمت۔ وہ مقام کہ جہاں کہا گیا ہے: «ذَهَبَ نَقِيَّ الثَّوْبِ...» یہ اس بات کی علامت ہو سکتا ہے کہ عمر نے اس طرح برتاؤ کیا جو لوگوں کے لیے قابل قبول تھا۔ دوسرے الفاظ میں انھوں نے اپنے ظاہر کو بچا کر رکھا اور اس وجہ سے حُسنِ ظاہر سے آراستہ رہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حُسنِ باطن سے بھی آراستہ رہے ہوں۔[2]

اسی طرح «أَصَابَ خَيْرَهَا وَسَبَقَ شَرَّهَا» کی جیسے الفاظ میں بھی کوئی تعریف شامل نہیں ہے اور یہ صرف اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے کہ عمر نے خلافت کے مزے لوٹے اور جس لذت کا خواہاں تھے وہ انھیں مل گئی اور اس سے پہلے کہ خلافت کا شران کے دامن گیر ہوتا، وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ «أَدَّى إِلَى اللَّهِ طَاعَتَهُ» یہ جملہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ عمر نے بظاہر اپنی حکومت کی بنیاد براہ راست خدا کی مخالفت پر نہیں رکھی بلکہ نماز، روزہ، حج وغیرہ جیسی عبادات کو برقرار رکھا۔ (اگرچہ انھوں نے دین میں بدعتیں بھی ایجاد کیں لیکن بہرحال بہت سی چیزوں کی ظاہری شکل کی رعایت کی۔)

ان معاملات میں غور و فکر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ اس بیان کو امیرالمومنین علیہ السلام کی جانب منسوب کرنا مشکوک ہے اور یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بیان

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ۱۱/۵، عمر کے جن فتنوں کا ذکر کیا جاسکتا ہے، وہ وہی ہیں جن کا امیرالمومنین علیہ السلام نے مختلف مقامات پر اپنے کلام میں ذکر کیا ہے اور اس کی شکایت بیان کی ہے۔ رجوع فرمائیں: کافی ۵۸/۸، ح ۲۱، کتاب سلیم/۲۲۴، ح ۱۴۔

[2] «مَرْضِيَّ السِّيرَةِ مِنَ النَّاسِ عِندَ النَّاسِ» جیسے جملے۔

جناب امیر علیہ السلام کا ہی ہے کیونکہ اس کا مأخذ قوی نہیں ہے، لیکن بالفرض اگر اس خطبے کو جناب امیر علیہ السلام کا مان بھی لیا جائے تب بھی یہ صرف مدح و ثنا پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ بیان میں مذمت اور دو طرفہ تأثرات بھی شامل ہیں اور زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام علیہ السلام نے اس انداز میں تقیے اور توریے کے طور پر بات کی ہے تاکہ مغیرہ بن شعبہ کے ہاتھ کوئی بہانہ نہ لگ جائے کہ وہ اس بہانے کوئی فتنہ و فساد نہ کھڑا کردے اور وہ اپنے خیال خام میں رہے کہ اس نے امام علی علیہ السلام سے عمر کی تعریف سن رکھی ہے۔

سبق ۲۶

دو دیگر بیانات کا جائزہ

خطبہ نمبر ۱۶۲[1]

عثمان کے دور خلافت کے آخری ایام میں جب عوام، ان کے رویے سے تنگ آگئے تھے تو وہ امیرالمؤمنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، عثمان کی شکایت کرتے تھے اور ان سے عثمان کی فہمائش اور تنبیہ کا مطالبہ کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر آپ عثمان کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے بات چیت کی۔[2]

---

[1] اس خطبے کا نمبر مختلف نسخوں کے مطابق الگ الگ بھی ہو سکتا ہے۔

[2] امیرالمومنین کے علاوہ اگر کوئی دوسرا انسان ہوتا تو اس موقع کو غنیمت تصور کر کے احتجاج کرنے والوں کے حوصلے مزید بلند کر دیتا اور لحموں میں عثمان کا خاتمہ کرا دیتا لیکن آپ نے اپنی شرعی ذمہ داری کا خیال کر کے انقلابی جماعت کو روکا اور چاہا کہ پہلے حجت تمام کر دی جائے تا کہ عثمان کو اصلاح امر کا موقع مل جائے۔ عثمان کے دور کے مظالم عالم آشکار تھے اور ان کے بارے میں کسی تحقیق کی ضرورت نہیں تھی۔

ایک بار پھر مخالفوں نے جناب امیر علیہ السلام کے اس کلام پر توجہ نہیں دی اور اسے بھی سابقہ خلفاء کی تائید اور رضامندی کی علامت سمجھ لیا:

«... اور نہج البلاغہ کے دیگر خطبات واقوال میں یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ علی علیہ السلام، ابوبکر اور عمر کے رویے پر رضامندی کا اظہار کرتے ہیں۔ جیسا کہ وہ عثمان کو نصیحت کرتے ہوئے انھیں شیخین کے اچھے کاموں کی یاد دہانی کراتے ہیں اور فرماتے ہیں:[1]

وَ وَاللهِ! مَآ اَدْرِیْ مَآ اَقُوْلُ لَکَ! مَآ اَعْرِفُ شَیْئًا تَجْهَلُهٗ. وَلَا اَدُلُّکَ عَلٰی اَمْرٍ لَّا تَعْرِفُهٗ. اِنَّکَ لَتَعْلَمُ مَا نَعْلَمُ. مَا سَبَقْنَاکَ اِلٰی شَیْءٍ فَنُخْبِرَکَ عَنْهُ، وَ لَا خَلَوْنَا بِشَیْءٍ فَنُبَلِّغَکَهٗ. وَ قَدْ رَاَیْتَ کَمَا رَاَیْنَا. وَ سَمِعْتَ کَمَا سَمِعْنَا. وَ صَحِبْتَ رَسُوْلَ اللهِ(ص) کَمَا صَحِبْنَا. وَمَا ابْنُ اَبِیْ قُحَافَةَ وَلَا ابْنُ الْخَطَّابِ بِاَوْلٰی بِعَمَلِ الْحَقِّ مِنْکَ.

خدا کی قسم! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تم سے کیا کہوں؟ جب کہ میں (اس سلسلے میں) ایسی کوئی بات نہیں جانتا کہ جس سے تم بے خبر ہو اور نہ کوئی ایسی چیز بتا سکتا ہوں جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ جو ہم جانتے ہیں، وہ تم جانتے ہو۔ نہ تم سے پہلے ہمیں کسی چیز کی خبر تھی کہ تمہیں بتائیں اور نہ (پیغمبر سے) علیحدگی میں کچھ سنا ہے کہ تم تک پہنچائیں۔ جیسے ہم نے دیکھا، ویسے تم نے بھی دیکھا اور جس طرح ہم نے سنا، اسی طرح تم نے بھی سنا۔ جس طرح ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں رہے، تم بھی رہے اور حق پر عمل پیرا ہونے کی ذمہ داری ابوبکر اور عمر پر اس سے زیادہ نہ تھی جتنی تم پر ہے۔

[1] راہی بہ سوی وحدت اسلامی/۱۷۴-۱۷۵۔

تجزیہ

اس غلط طرز فکر کے جواب میں چند نکات پر غور ضروری ہے:

پہلا: جیسا کہ اس خطبے کے آغاز سے ہی واضح ہے، یہ گفتگو لوگوں کی درخواست پر انجام پائی اور خود جناب امیر علیہ السلام کے اپنے بیان کے مطابق:

«اِنَّ النَّاسَ وَرَآئِیْ. وَ قَدِ اسْتَسْفَرُوْنِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهُمْ»

لوگ میرے پیچھے (منتظر) ہیں اور انھوں نے مجھے تمہارے اور ان کے درمیان سفیر اور ثالث بنایا ہے۔

چونکہ لوگ عثمان اور اس کے کارندوں کے مظالم سے عاجز آچکے تھے اور ان کے نمائندے مدینے میں اکٹھا ہو کر اپنی آواز خلیفہ تک پہنچانا اور ہر صورت میں اپنا معاملہ واضح کرنا چاہتے تھے اس لیے ہمیشہ کی طرح انھوں نے امیر المؤمنین علیہ السلام کو واسطہ بنایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ عثمان تک ان کی بات پہنچائیں اور ان سے اپنے اور اپنے کارندوں کے رویے پر نظر ثانی کریں۔[1]

بیان کیا جاتا ہے کہ ایسے ہی ایک معاملے میں امیر المؤمنین علیہ السلام نے امام حسن علیہ السلام کو عثمان کے پاس بھیجا تاکہ آپ لوگوں کی شکایتوں ان کے گوش گزار کردیں، عثمان نے امام حسن علیہ السلام کی بات سننے کے بعد کہا:

---

[1] اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عثمان کی کارکردگی نے تمام عالم اسلام کو ناراض کردیا تھا۔ حضرت عائشہ انھیں یہودی قرار دے کر لوگوں کو قتل پر آمادہ کر رہی تھیں، طلحہ انھیں واجب القتل قرار دے رہا تھا، زبیر ان کے مخالفوں کی حمایت کر رہا تھا لیکن ان سب کا مقصد امت اسلامیہ کو نااہل سے نجات دلانا نہیں بلکہ آئندہ خلافت کی راہ ہموار کرنا تھا اور حضرت علی علیہ السلام اس حقیقت سے مکمل طور پر باخبر تھے۔ اس لیے جب انقلابی گروہ نے آپ کو خلافت کی پیشکش تو آپ نے انکار کردیا۔

«إِنَّ أَبَاكَ يَرَىٰ أَنَّ أَحداً لَا يَعْلَمُ مَا يَعْلَمُ. وَنَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا نَفْعَلُ...»[1]

تمہارے والد کا خیال ہے کہ جو کچھ بھی وہ جانتے اس سے کوئی اور آگاہ نہیں ہے جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں، اس سے بخوبی واقف ہیں۔

اس کے بعد امیر المؤمنین علیہ السلام خود تشریف لے جاتے ہیں اور عثمان سے گفتگو کرتے ہیں۔

اس لیے اب بات عثمان کے طرز حکومت کے بارے میں ہے اور وہ یہ کہ اب عثمان کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اپنی معلومات پر عمل کریں اور لوگوں کی ناراضگی مول نہ لیں۔

دوسرا: جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا، پہلے دو خلفاء نے اگر چہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمرانی کے طریقوں میں تبدیلیاں کیں اور خدا کے دین میں بدعتیں ایجاد کیں لیکن وہ لوگوں کی رضامندی حاصل کرنے اور ان کے درمیان اپنی حکومت کو مقبول بنانے میں کامیاب رہے یوں انھوں نے اپنے لیے خلیفۂ رسول کا عنوان کسی صورت باقی رکھا۔

لیکن جب عثمان اقتدار میں آئے تو انھوں نے اپنے خاندان - بنی امیہ - کے لوگوں کو مختلف عہدوں پر مقرر کیا، انھیں جائیدادیں الاٹ کر دیں اور لوگوں کے ساتھ ہر طرح کے رویے کے لیے ان کا ہاتھ کھلا رکھا۔ مثال کے طور پر جب لوگوں نے سابقہ خلفاء سے ان کے گورنروں کے بارے میں شکایت کی تو ابو بکر اور عمر نے اپنے گورنروں کو ڈانٹا پھٹکارا (سوائے معاویہ کے، جو شام کا مطلق العنان حکمراں تھا) لیکن عثمان نے الٹا شکایت کرنے والوں کو ڈانٹا ڈپٹا اور انھیں سزا تک دی۔

---

[1] الغدیر ۹/۱۷، منقول: الامامۃ والسیاسۃ ۱/۳۰ اور العقد الفرید ۲/۲۷۴۔

لہٰذا عثمان کے مقابل ابوبکر و عمر نے عدل و انصاف پسندی کا بظاہر زیادہ مظاہرہ کیا اور انھوں نے عثمان کے نسبت دین کے زیادہ تر احکام و قوانین کا لحاظ کیا۔

تیسرا: پچھلے دو نکات کے مطابق دو امور کا ایک دوسرے سے الگ کیا جانا ضروری ہے؛ ایک یہ کہ کیا امیرالمؤمنین علیہ السلام غاصبوں کی حکومت کو برحق سمجھتے تھے؟ اور دوسرے یہ کہ کیا اس دلیل کی بنیاد پر کہ انھوں نے حکومت پر ناجائز قبضہ جما لیا تھا، ان کے سارے ہی کام غلط اور ناحق تھے؟

امام علیہ السلام اپنے اس کلام میں اس کوشش میں نہیں تھے کہ سابقہ حکومتوں کی قانونی یا غیر قانونی حیثیت کی وضاحت کریں بلکہ چونکہ لوگوں نے ثالثی کے لیے آپ سے گزارش کی تھی اس لیے آپ نے عثمان اور ان کارندوں کو ظلم جاری رکھنے سے روکنے کا فیصلہ کیا تاکہ یہ معاملہ عثمان کے قتل پر منتج نہ ہو۔ چنانچہ امیرالمؤمنین علیہ السلام، عثمان کے سامنے اس نکتے کو یاد دلاتے ہوئے کہ گزشتہ خلفاء نے کچھ معاملات کا لحاظ کرتے ہوئے لوگوں کو راضی رکھا تھا، فرماتے ہیں: تم خود بھی ویسا ہی کچھ کر سکتے ہو اور حق و انصاف کا لحاظ کرتے ہوئے لوگوں کے غم و غصے کا مداوا کر سکتے ہو اور انھیں راضی رکھ سکتے ہو۔

امیرالمؤمنین علیہ السلام اسی طرح عثمان کو سمجھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق ظالم و جابر حاکم کے برے انجام سے آگاہ کرتے ہیں اور متنبہ کرتے ہیں کہ تم اس اُمت کے ایسے پہلے مقتول سربراہ نہ بنو کہ بقول پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کی ہلاکت سے خلیفہ کشی کا دروازہ قیامت تک کے لیے کھل جائے گا۔

چوتھا: اس کلام کے آغاز کے جو باتیں امام علیہ السلام نے ذکر کی ہیں ان سے کسی کو اس وہم میں نہیں رہنا چاہیے کہ امام علیہ السلام اپنے علم کو عثمان کے برابر جانتے ہیں یا اپنے اس الٰہی علم کا انکار کرتے ہیں جو انھیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وراثت میں ملا ہے کیونکہ اس بیان میں امام علیہ السلام علمی لحاظ سے عثمان کے

ساتھ اپنا موازنہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے کیونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر تمام مسلمانوں کا متفقہ طور پر فیصلہ ہے کہ آپ افضل و اعلم ہیں اور آپ کو علم رسول، وراثت میں ملا ہے۔ یہاں امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ لوگوں میں بے چینی اور خفگی کی وجہ کیا ہے اور اس کے حل کا بھی تمھیں علم ہے۔ تم نے لوگوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رہن سہن اور ان کی سنت اور خاص طور پر بیت المال کی تقسیم میں تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقۂ کار کا مشاہدہ کیا ہے لہٰذا تمھیں کچھ بتانے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میرا یہ کہنے کا ارادہ ہے کہ میں ایسی چیزیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ (جیسا کہ تم نے گمان کیا ہے اور میرے بیٹے سے کہا ہے) بلکہ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ تم جو کچھ جانتے ہو اسی پر عمل کرو[1] کیونکہ تم پچھلے دو خلفاء کے مقابلے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے کے زیادہ لائق ہو اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تمھاری قرابتداری ان سے زیادہ ہے۔[2]

اس طرح امیرالمؤمنین علیہ السلام عثمان پر عذر تراشی اور بہانے بازی کے سارے دروازے بند کر دیتے ہیں اور جب عثمان نے امام علیہ السلام کی باتیں سننے کے بعد ان سے لوگوں کی فریادوں پر توجہ کے لیے مہلت مانگی تو امام علیہ السلام نے جواب دیا:

مَاکَانَ بِالْمَدِيْنَةِ فَلَا اَجَلَ فِيْهِ، وَمَا غَابَ فَاَجَلُهٗ وُصُوْلُ اَمْرِكَ اِلَيْهِ.

---

(۱) نہج السعادہ میں منقول ہے: «…… مَا أَعْرِفُكَ شَيْئاً تَجْهَلُهُ وَلَا أَدُلُّكَ عَلَىٰ أَمْرٍ لَا تَعْرِفُهُ» یہ جملہ ہمارے اخذ کیے گئے نتائج پر مہر تائید ثبت کرتا ہے۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرزندِ عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف تھے اور عثمان فرزندِ عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف کہلاتے ہیں۔ لیکن ابوبکر و عمر کی ظاہری نسبت کعب تک پہنچتی ہے کیونکہ عبد مناف قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب کے بیٹے تھے۔

جن چیزوں کا تعلق مدینے سے ہے ان میں مہلت (ضروری) نہیں ہے اور جو چیزیں مدینے سے باہر کی ہیں ان کی مہلت یہ ہے کہ تمہارا فرمان وہاں تک پہنچ جائے۔

دوسرے الفاظ میں مزید موقع کی گنجائش نہیں ہے، تم جو بھی کرنا چاہتے ہو، اس کا وقت ابھی اور اسی وقت ہے کیونکہ لوگ ابھی یہاں موجود ہیں اور تمہارے لیے بھی کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

اس لیے امیرالمؤمنین علیہ السلام کے اس بیان میں پچھلے خلفاء کی کوئی تعریف و توصیف اور کسی بھی طرح کی مدح و ثنا نہیں ہے اور ان کے اس کلام میں صرف اور صرف عثمان پر حجت تمام کی گئی ہے تاکہ انھیں اپنی بداعمالیوں کے خلاف کوئی بہانہ نہ ملے اور ان کی سرزنش بھی ہو جائے۔

قصار الحکم ۴۶۷ کا جائزہ [1]

امیرالمؤمنین علیہ السلام کا ایک اور بیان موجود ہے جس کا حوالہ دیتے ہوئے مخالفوں نے اسے گزشتہ خلفاء سے آپ کی رضامندی کی دلیل مان لیا ہے۔ چنانچہ نہج البلاغہ کے ایک حصہ قصار الحکم یعنی حکمت و مواعظ والے باب میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کے ایک خطبے کا ایک ٹکڑا موجود ہے جس میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

«وَوَلِيَهُمْ وَالٍ فَأَقَامَ وَاسْتَقَامَ حَتَّى ضَرَبَ الدِّينُ بِجِرَانِهِ.» [2]

---

[1] نہج البلاغہ کے اس حصے میں امیرالمؤمنین علیہ السلام کے منتخب حکمت آمیز اقوال و نصائح، سوالات کے جوابات اور مختصر خطبے نقل ہوئے ہیں۔ اس حکمت کا نمبر مختلف نسخوں میں الگ الگ ہے۔

[2] جِران، اونٹ کی گردن کے اگلے حصے کو کہتے ہیں اور «ضَرَبَ الابِلُ بِجِرانِه» سے مراد اونٹ کا زمین پر آرام سے بیٹھ جانا ہے۔ شیخ محمد عبدہ کا خیال ہے کہ یہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار کے طرف اشارہ ہے کہ جب آپ کا اقتدار قائم ہو گیا تو آپ نے تمام لوگوں کو حق کے راستہ پر چلانا شروع کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نے اپنا سینہ ٹیک دیا اور اسے استقرار حاصل ہو گیا۔

لوگوں کے امور کا ذمہ دار ایک ایسا حاکم بنا جو خود بھی سیدھے راستہ پر چلا اور اس نے لوگوں کو بھی اسی راستے پر چلایا، یہاں تک کہ دین نے اپنا سینہ ٹیک دیا۔

اس بیان کے پیش نظر مخالفین کا کہنا ہے: امیرالمؤمنین علیہ السلام کے نقطہ نظر سے، عمر کی حکمرانی کا نتیجہ دین اسلام کا قیام واستحکام تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام ان کی حکمرانی سے راضی تھے۔

اس بیان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا جانا چاہیے کہ ابن میثم اور ابن ابی الحدید نے امیرالمؤمنین علیہ السلام کے اس کلام کو حضرت کے دور حکومت میں ارشاد فرمائے گئے آپ کے ایک طویل خطبے کا ایک ٹکڑا مانا ہے۔ ابن ابی الحدید نے اس خطبے کو کچھ یوں نقل کیا ہے:

«فَاخْتَارَ ٱلْمُسْلِمُونَ بَعْدَهُ بِآرَائِهِمْ رَجُلاً مِنْهُمْ فَقَارَبَ وَسَدَّدَ حَسْبَ اِسْتِطَاعَتِهِ عَلَى ضَعْفٍ وَ حِدٍّ كَانَا فِيهِ. وَلِيَهُمْ بَعْدَهُ وَالٍ فَأَقَامَ وَاسْتَقَامَ حَتَّى ضَرَبَ الدِّينُ بِجِرَانِهِ عَلَى عَسْفٍ وَ عَجْرَفِيَّةٍ كَانَا فِيهِ ثُمَّ اخْتَلَفُوا ثَالِثاً لَمْ يَكُنْ يَمْلِكُ مِنْ أَمْرِ نَفْسِهِ شَيْئاً غَلَبَ عَلَيْهِ أَهْلُهُ فَقَادُوهُ إِلَى أَهْوَائِهِم.....»[1]

تو مسلمانوں نے نبی کے بعد اپنی رائے سے اپنے میں سے ہی ایک کو منتخب کیا جس نے اپنی کمزوری اور تند خوئی کے باوجود اپنی صلاحیت کے مطابق اعتدال کا راستہ اختیار کیا۔ اس کے بعد ایک دوسرے حاکم نے باگ ڈور سنبھالی، چنانچہ اس نے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اس وقت تک ثابت قدم رہا جب تک دین میں قرار و سکون نہ ہو گیا، اس کے باوجود کہ اس میں ظلم وستم جبر واستبداد اور تکبر وحماقت کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ پھر انھوں نے ایک تیسرے شخص کو جانشین بنا دیا جو اپنی طرف سے کسی چیز کا مالک نہیں تھا (اس کی اپنی کوئی

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ۲۱۸/۲۰۔

مرضی نہیں تھی) اس کے خاندان نے اسے اپنی مٹھی میں لے لیا اور اسے اس کی ہوا و ہوس اور خواہشات کی طرف دھکیل دیا۔

اس بیان پر غور کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ امام علی علیہ السلام، اپنے دوسرے کلاموں کی طرح، پچھلے خلفاء کی بظاہر تعریف کرتے ہوئے، اپنی ناراضگی کے پہلوؤں کو خلفاء کی مذمت کے ساتھ عیاں کرتے ہیں۔

عمر کے بارے میں، اگرچہ شروع میں آپ فرماتے ہیں کہ ان کے زمانے میں، دین پر سکون ہوا، لیکن اس بیان سے پہلے اور بعد کے جملوں پر توجہ دینا، امام کے معنی و مراد کو بہتر طور پر واضح کرتا ہے۔

اس کے بعد امیر المؤمنین علیہ السلام عمر کی دو صفات بیان کرتے ہیں: ایک عَسْفٍ جو ظلم و ستم اور استبداد کے معنی میں ہے اور دوسرے: عَجرَفِيَّة. اس لفظ کے معنی کے لیے ہم جب لغت پر نظر ڈالتے ہیں، تو ملتا ہے:

عَجرَفِيَّة: الجَفوَةُ فِي الْكَلامِ ... الخُرْقُ فِي الْعَمَلِ ... السُّرْعَةُ فِي الْمَشْيِ. فِيهِ عَجْرَفِيَّةٌ: كَانَ فِيهِ خُرْقاً وَ قِلَّةَ مُبَالَاةٍ لِسُرْعَتِهِ. تَعَجْرَفَ عَلَيَّ: تَكَبَّرَ.»[1]

عجرفیہ، کے معنی ہیں بات کرنے میں رُوکھائی، کردار میں حماقت، عمل میں لاپرواہی، نتیجہ نکالنے میں جلد بازی اور اسی طرح یہ تکبر کے معنوں میں بھی ہے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام نے عمر کے لیے جن دو صفات کا ذکر کیا ہے ان پر غور کرنے سے ہم متوجہ ہو جاتے ہیں کہ امام علیہ السلام کے الفاظ نہ صرف عمر کے لیے تعریفی جملے نہیں بلکہ مذمت پر مشتمل ہیں اور عمر کے کردار کو مشکوک بھی ٹھہراتے ہیں۔ یعنی اگر ہم عمر کی حکمرانی کے نتیجے کو دین کا استقرار و

---

[1] لسان العرب۔

استحکام مان بھی لیں تب بھی امام علیہ السلام اسے عمر کے ظلم و ستم اور جبر و تشدّد کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ کسی بھی عقلمند کو اس بیان سے مذمت کے علاوہ کوئی اور چیز سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کے علاوہ امیر المؤمنین علیہ السلام، عمر اور ابو بکر کا آپسی موازنہ کرتے ہوئے ابو بکر کو کمزور اور سست انسان کے طور پر متعارف کراتے ہیں جبکہ عمر کو مستحکم بتاتے ہیں، اور یہ بھی لازمی طور پر کوئی تعریف نہیں ہے جو امام علیہ السلام کی طرف سے عمر کی حکمرانی سے رضامندی کی طرف اشارہ کرتی ہو بلکہ یہ محض دو حکمرانوں کا موازنہ ہے جن میں سے ایک، دوسرے سے زیادہ طاقتور اور مقتدر رہا ہے اور یہ اقتدار بھی ظلم اور جبر کے ذریعے حاصل کیا گیا ہے۔

دین کے قیام[1] کا مطلب دین کے نام کا قیام بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ان خلفاء کی حکمرانی بظاہر اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ کے نام پر قائم کی گئی تھی اور انھیں بہر صورت اسلام کے نام کی ضرورت تھی۔

اس کے ساتھ ہی عمر کے زمانے میں اور ان کی فتوحات کے نتیجے میں، اسلام کا نام جزیرہ نمائے عرب سے باہر تک پہنچ گیا اور فارس کی سلطنت سمیت دیگر ممالک مسلم حکمرانی کے قلمرو میں آگئے۔ اگرچہ یہ جنگیں عمر کے لیے کسی طرح کی خوبی شمار نہیں ہوتیں اور امیر المؤمنین علیہ السلام کے بیان کے مطابق یہ ساری چیزیں ان کے ظلم و جبر کا نتیجہ ہیں، لیکن بہر حال اسلام برائے نام اور ظاہری طور پر ہی سہی، ایک لحاظ سے پھیلا اور استقرار پا گیا۔

یہ وہ نتیجہ ہے جسے امیر المؤمنین علیہ السلام کے بیان سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ پچھلے دلائل پر توجہ دیتے ہوئے کہ آپ کھل کر گزشتہ خلفاء کی مذمت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، یہ نتیجہ اس بحث کو مزید آگے بڑھانے سے روک دیتا ہے اور بقول شخصے، عقلمند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔

---

[1] حاکم نیشاپوری نے اس کلام کو کچھ اس طرح نقل کیا ہے: «حتیٰ ضَرَبَ الدَّھرُ بِجِرانِہِ» (المستدرک علی الصحیحین ۳/۹۴، ح ۴۶۱۴) اس میں دین کے استقرار و قیام کی بات بھی نہیں ہے۔

حرفِ آخر

خطبۂ شقشقیہ؛ مظلومیت کی لافانی سند

ہم نے اب تک جو کچھ بھی اس کتاب کے ذریعے قارئین کی نذر کیا ہے وہ، شیعہ عقائد پر حملہ کرنے کی مخالفین کی ایک نئی کوشش اور ایک نئی چال کو ناکام بناتے ہوئے اسے بے نقاب کرنا تھا، اور —رب العزت کی توفیق اور بارگاہ علوی کی عنایتوں سے— ہم نے کامیابی کے ساتھ یہ راستہ طے کیا اور دشمنوں کی تمام تر سازشوں کو طشت از بام کر دیا جو اس کوشش میں تھے کہ جناب امیر علیہ السلام کے کلام کو توڑ مروڑ کے اور آپ کے طرز زندگی کو غلط لبادہ اوڑھا کر کسی صورت یہ ثابت کر دیں کہ جناب امیر علیہ السلام، خلفاء اور ان کی حکمرانی سے راضی تھے اور گرچہ وہ اپنے آپ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی معاشرے کی حکمرانی کے قابل سمجھتے تھے اور دوسروں کو اس منصب پر فائز ہونے کے قابل نہیں جانتے تھے لیکن بہر صورت اس عہدے کے حصول سے مایوسی کے بعد انھوں نے دوسروں کی غلطیوں کو معاف کر دیا اور اپنے قول و عمل کے ذریعے خلفاء کی حکومت سے رضامندی ظاہر کی اور اس طرح آپ نے واضح کر دیا کہ آپ اپنے لیے کسی الٰہی حق اور نبوی نص کے قائل نہیں ہیں!!۔

اس طرح کے شبہے اور اعتراض کے جواب میں اور اس نظریے کی تردید کے لیے، ہم نے اس کتاب کے ذریعے درج ذیل نکات کو ثابت کیا ہے:

- امیر المؤمنین علیہ السلام نے اپنی بہت سی تقاریر اور خطبات میں خود کو (اور اپنی اولاد کو) اسلامی معاشرے پر حکومت کرنے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اور ان کے خلیفہ کے طور پر متعارف کیا ہے۔

- امام علیہ السلام نے حکومت کو اپنا الٰہی حق جانا ہے اور دوسروں کو ظالم اور ان کی حکومت کو ناحق، ناجائز اور باطل کے تسلط کا نمونہ قرار دیا ہے۔

- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جو حالات پیدا ہوئے، آپ ان میں بھی اپنے حقوق کے غصب کرنے والوں کے خلاف اپنی عدم رضایت اور شکایت کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھ پر ہونے والا یہ ظلم اس پورے عرصے میں جاری رہا ہے۔

- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تکفین اور ان کے حکم کے مطابق قرآن کو جمع کر لینے کے بعد امیرالمؤمنین علیہ السلام مہاجرین و انصار کے اہم افراد کے گھر جاتے ہیں اور ان سے اپنے الٰہی حق کی بحالی کے لیے مدد مانگتے ہیں۔

- عہدِ نبوی کی پہلی شق پر عمل کے لیے راہ ہموار نہ ہونے اور مددگار نہ ملنے کی صورت میں اس کی دوسری شق کی رو سے جناب امیر علیہ السلام غاصبوں کے خلاف عملی کارروائی ترک کر دیتے ہیں۔

- جناب امیر علیہ السلام اس بات کے علاوہ کہ اپنی خاموشی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے وعدے کی پاسداری بتاتے ہیں؛ مشرکوں اور منکروں کے مقابل گزشتہ انبیاء کی سیرت کو اپنے لیے نمونہ قرار دیتے ہیں اور اپنے سکوت کا نتیجہ، اسلام کا تحفظ، اپنی، اپنے اہل بیت اور بہت تھوڑے سے چاہنے والوں کی زندگی کی حفاظت کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ لوگوں کے علی الاعلان کافر و مرتد ہو جانے کی روک تھام اور کافروں کے صلبوں سے مؤمنوں کی پیدائش کے ارادۂ الٰہی کو عملی جامہ پہنانا، جناب امیر علیہ السلام کے سکوت کے دوسرے اسباب ہیں۔

- امیرالمؤمنین علیہ السلام نے سابقہ حکمرانوں سے اپنی بیعت کے جبری ہونے اور ان خلفاء کی جانب سے آپؑ کو موت کی دھمکیاں دیے جانے کی خبر دیتے ہوئے سابقہ خلفاء کی حکمرانی کا نتیجہ، اپنی الٰہی قدر و منزلت کی فراموشی، بدعتوں کا سامنے آنا اور دین میں انحراف پیدا ہونا قرار دیا ہے۔

- لوگوں کے سابقہ حکمرانوں کی روش کے عادی ہونے اور ان کے درمیان دنیا پرستی اور جہالت کے پھیلاؤ کی وجہ سے جناب امیر علیہ السلام نے اپنی بیعت کے لیے ٹوٹے پڑ رہے لوگوں کے سامنے اپنے نقطۂ نظر اور ان کی توقعات کے درمیان فرق کو واضح طور پر بیان فرماتے ہیں اور ان پر پوری طرح سے حجت تمام کرنے کے لیے حکومت کو ٹھکرا دیتے ہیں تاکہ اس طرح ان کی حکومت پر

ہم نے اب تک جو کچھ بھی اس کتاب کے ذریعے قارئین کی نذر کیا ہے وہ، شیعہ عقائد پر حملہ کرنے کی مخالفین کی ایک نئی کوشش اور ایک نئی چال کو ناکام بناتے ہوئے اسے بے نقاب کرنا تھا، اور -رب العزت کی توفیق اور بارگاہ علوی کی عنایتوں سے -ہم نے کامیابی کے ساتھ یہ راستہ طے کیا اور دشمنوں کی تمام تر سازشوں کو طشت ازبام کردیا جو اس کوشش میں تھے کہ جناب امیر علیہ السلام کے کلام کو توڑ مروڑ کے اور آپؑ کے طرز زندگی کو غلط لبادہ اوڑھا کر کسی صورت یہ ثابت کردیں کہ جناب امیر علیہ السلام، خلفاء اور ان کی حکمرانی سے راضی تھے اور گرچہ وہ اپنے آپ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی معاشرے کی حکمرانی کے قابل سمجھتے تھے اور دوسروں کو اس منصب پر فائز ہونے کے قابل نہیں جانتے تھے لیکن بہر صورت اس عہدے کے حصول سے مایوسی کے بعد انھوں نے دوسروں کی غلطیوں کو معاف کردیا اور اپنے قول و عمل کے ذریعے خلفاء کی حکومت سے رضامندی ظاہر کی اور اس طرح آپؑ نے واضح کردیا کہ آپ اپنے لیے کسی الٰہی حق اور نبوی نصّ کے قائل نہیں ہیں!!۔

اس طرح کے شبہے اور اعتراض کے جواب میں اور اس نظریے کی تردید کے لیے، ہم نے اس کتاب کے ذریعے درج ذیل نکات کو ثابت کیا ہے:

- امیر المؤمنین علیہ السلام نے اپنی بہت سی تقاریر اور خطبات میں خود کو (اور اپنی اولاد کو) اسلامی معاشرے پر حکومت کرنے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اور ان کے خلیفہ کے طور پر متعارف کیا ہے۔

- امام علیہ السلام نے حکومت کو اپنا الٰہی حق جانا ہے اور دوسروں کو ظالم اور ان کی حکومت کو ناحق، ناجائز اور باطل کے تسلط کا نمونہ قرار دیا ہے۔

- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد جو حالات پیدا ہوئے، آپ ان میں بھی اپنے حقوق کے غصب کرنے والوں کے خلاف اپنی عدم رضایت اور شکایت کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھ پر ہونے والا یہ ظلم اس پورے عرصے میں جاری رہا ہے۔

- پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تکفین اور ان کے حکم کے مطابق قرآن کو جمع کر لینے کے بعد امیر المؤمنین علیہ السلام مہاجرین و انصار کے اہم افراد کے گھر جاتے ہیں اور ان سے اپنے الٰہی حق کی بحالی کے لیے مدد مانگتے ہیں۔

- عہدِ نبوی کی پہلی شق پر عمل کے لیے راہ ہموار نہ ہونے اور مددگار نہ ملنے کی صورت میں اس کی دوسری شق کی رو سے جناب امیر علیہ السلام غاصبوں کے خلاف عملی کارروائی ترک کر دیتے ہیں۔

- جناب امیر علیہ السلام اس بات کے علاوہ کہ اپنی خاموشی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیے وعدے کی پاسداری بتاتے ہیں؛ مشرکوں اور منکروں کے مقابل گزشتہ انبیاء کی سیرت کو اپنے لیے نمونہ قرار دیتے ہیں اور اپنے سکوت کا نتیجہ، اسلام کا تحفظ، اپنی، اپنے اہل بیت اور بہت تھوڑے سے چاہنے والوں کی زندگی کی حفاظت کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ لوگوں کے علی الاعلان کافر و مرتد ہوجانے کی روک تھام اور کافروں کے صلبوں سے مؤمنوں کی پیدائش کے ارادۂ الٰہی کو عملی جامہ پہنانا، جناب امیر علیہ السلام کے سکوت کے دوسرے اسباب ہیں۔

- امیر المؤمنین علیہ السلام نے سابقہ حکمرانوں سے اپنی بیعت کے جبری ہونے اور ان خلفاء کی جانب سے آپؑ کو موت کی دھمکیاں دیے جانے کی خبر دیتے ہوئے سابقہ خلفاء کی حکمرانی کا نتیجہ، اپنی الٰہی قدر و منزلت کی فراموشی، بدعتوں کا سامنے آنا اور دین میں انحراف پیدا ہونا قرار دیا ہے۔

- لوگوں کے سابقہ حکمرانوں کی روش کے عادی ہونے اور ان کے درمیان دنیا پرستی اور جہالت کے پھیلاؤ کی وجہ سے جناب امیر علیہ السلام نے اپنی بیعت کے لیے ٹوٹے پڑ رہے لوگوں کے سامنے اپنے نقطۂ نظر اور ان کی توقعات کے درمیان فرق کو واضح طور پر بیان فرماتے ہیں اور ان پر پوری طرح سے حجت تمام کرنے کے لیے حکومت کو ٹھکرا دیتے ہیں تاکہ اس طرح ان کی حکومت پر

لوگوں کے اصرار و بے قراری کو ظاہر کردیں اور یوں ان پر ہر طرح کی بہانہ جوئی اور عذر تراشی کا راستہ بند کردیں۔

-چونکہ سابقہ حکمراں-خاص طور پر ابوبکر اور عمر-لوگوں میں مقبول تھے اور انھوں نے لوگوں کے درمیان اچھی خاصی پکڑ بنا رکھی تھی اور جناب امیرؑ کھلے الفاظ میں ان کی مذمت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے جب لوگ، امیرالمؤمنینؑ سے ان کے بارے میں سوال کرتے تھے تو وہ ہمیشہ ذومعنی الفاظ اور جملوں کا انتخاب کرتے تھے جن سے بظاہر لگتا تھا کہ خلفاء کی تعریف میں ہیں لیکن دراصل امام علی علیہ السلام حکومت کے سلسلے میں ان کے حرص و ہوس کی طرف اشارہ فرماتے تھے اور بتاتے تھے کہ کس طرح انھوں نے آپ کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی تھیں۔ ان جملوں کے ضمن میں امیرالمومنین اپنے آپ کو محض خدا کی مرضی کے سامنے تسلیم بتاتے تھے اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دینے کی بات کرتے تھے۔

اس کتاب کے آخر میں ہم پچھلے اسباق کے خلاصے اور حُسنِ ختام کے طور پر، امیرالمؤمنینؑ کی مظلومیت کی لافانی اور ابدی سَنَد خطبۂ شقشقیہ [1] کو پیش کرتے ہوئے خود جناب امیرؑ کی زبانی ان کی مظلومیت پر نظر ڈالتے ہیں تاکہ ایک بار پھر شک و شبہ پیدا کرنے والوں کو دنداں شکن جواب دیں اور ساتھ ہی غاصبوں کے ظلم و ستم پر ایک اور ٹھوس دلیل پیش کردیں:

---

[1] خطبہ شقشقیہ نہج البلاغہ کے مشہور خطبوں میں سے ایک ہے۔ امام علیؑ نے اس خطبے میں خلفائے ثلاثہ کے دور میں اسلامی حکومت میں پیش آنے والے واقعات پر تنقید کرتے ہوئے ان میں سے ہر ایک کی خلافت پر سوال اٹھایا ہے۔ اس خطبے میں آپ اس بات کی طرف بھی اشارہ فرماتے ہیں کہ کس طرح ابوبکر کی بیعت کرانے کے لیے آپ کو لوگوں کے درمیان لے جایا گیا۔ انھوں نے اپنی جانب سے حکومت قبول کرنے کے علل واسباب کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ یہ خطبہ اکثر نسخوں کی موجودہ ترتیب کے مطابق نہج البلاغہ کا تیسرا خطبہ ہے۔ اس خطبے کے براہ راست راوی ابن عباس ہیں جن کی روایت اہلسنت کے یہاں بھی معتبر ہے۔

«أَمَا وَ اللّٰهِ لَقَدْ تَقَمَّصَهَا فُلَانٌ [ابْنُ أَبِي قحَافَةَ] وَ إِنَّهُ لَيَعْلَمُ أَنَّ مَحَلِّي مِنْهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحَى يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ وَ لَا يَرْقَى إِلَيَّ الطَّيْرُ.»

جان لو کہ خدا کی قسم! فلاں شخص (ابوبکر ابن ابی قحافہ) نے قمیصِ خلافت کو کھینچ تان کر پہن لیا ہے حالانکہ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے کہ میرا خلافت میں وہی مقام ہے جو چکی کے اندر اس کی کیل کا ہوتا ہے۔ علم کا سیلاب میری ذات سے گزر کر نیچے جاتا ہے اور میری بلندی تک کسی کا طائر فکر بھی پرواز نہیں کر سکتا ہے۔

اس حصے میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: ابوبکر نے ایسی صورت میں خلافت سنبھالی جب کہ انھیں معلوم تھا کہ یہ عظیم عہدہ میرے علاوہ کسی اور کے ذریعے اپنے الٰہی نظام تک نہیں پہنچ سکتا اور صرف میں ہی معاشرے کے معاملات کو جیسا خدا اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے ہیں، ویسا ہی بلندیوں تک لے جا سکتا ہوں۔

اگرچہ غاصبوں نے میری کم عمری کو بہانہ بنایا اور اسے میرے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا جبکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جو علم مجھے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وراثت میں ملا ہے وہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ اسلامی معاشرے پر حکومت اور خلافتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لازمہ خدا کے دین، خدا کی رضا اور خدا کی ناراضگی سے آگاہی اور حُسنِ تدبیر ہے اور میرا اس میدان میں کوئی مقابلہ نہیں ہے۔

«فَسَدَلْتُ دُونَهَا ثَوْباً وَطَوَيْتُ عَنْهَا كَشْحاً وَطَفِقْتُ أَرْتَئِي بَيْنَ أَنْ أَصُولَ بِيَدٍ جَذَّاءَ أَوْ أَصْبِرَ عَلَى طَخْيَةٍ [ظُلْمَةٍ] عَمْيَاءَ. يَهْرَمُ فِيهَا الْكَبِيرُ وَيَشِيبُ فِيهَا الصَّغِيرُ. وَيَكْدَحُ فِيهَا مُؤْمِنٌ حَتَّى يَلْقَى رَبَّهُ.»

پھر بھی میں نے اپنے اور خلافت کے درمیان پردہ ڈال دیا اور اس سے پہلو تہی کر لیا اور یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کٹے ہاتھوں سے حملہ کردوں یا اسی بھیانک اندھیرے پر صبر کرلوں جس میں سن رسیدہ، بالکل ضعیف اور بچہ، بوڑھا ہو جاتا ہے اور مومن محنت کرتے کرتے پروردگار کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام بہت ہی خوبصورت تشبیہ کا استعمال کرتے ہوئے اپنی تنہائی اور بیکسی کا نقشہ کھینچتے ہیں اور فرماتے ہیں: میرے سامنے دو راستے تھے؛ ایک یہ کہ بغیر مددگاروں کے ہی اپنے حق کی بحالی کے لیے اٹھ کھڑا ہوں اور دوسرے یہ کہ ان کی حکومت پر صبر سے کام لوں جس کا نتیجہ ظلمت و جہالت اور مصائب و آلام کے علاوہ کچھ نہیں۔

اس بیان میں جناب امیر علیہ السلام اپنے مددگاروں کی کمی کی طرف بھی اشارہ فرماتے ہیں اور صراحت کے ساتھ ابوبکر کی حکومت (اور بعد کی حکومتوں) کو دین کے جمود اور لوگوں کی جہالت کے دور نیز مؤمنوں کے لیے مصائب و مشکلات کے زمانے کے طور پر بھی متعارف کراتے ہیں۔

«فَرَأَيْتُ أَنَّ الصَّبْرَ عَلَى هَاتَا أَحْجَى فَصَبَرْتُ وَفِي الْعَيْنِ قَذًى وَفِي الْحَلْقِ شَجًا أَرَى تُرَاثِي نَهْباً»

تو میں نے دیکھا کہ ان حالات میں صبر ہی قرین عقل ہے تو میں نے اس عالم میں صبر کرلیا کہ آنکھوں میں مصائب کی کھٹک تھی اور گلے میں رنج و غم کے پھندے تھے۔ میں اپنی میراث کو لٹتے دیکھ رہا تھا۔

اس حصے میں امام علیہ السلام نے اپنی خاموشی اور صبر کو واضح انداز میں تلخی کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: مجبوری ایسی تھی کہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح آنکھ میں کانٹا چبھ جاتا ہے تو نہ تو پلک بند کی جا سکتی ہے اور نہ ہی کھولی جا سکتی ہے اور اسی طرح جب کوئی ہڈی حلق میں پھنس جائے تو انسان نہ تو اسے آسانی سے نگل سکتا ہے اور نہ ہی اگل سکتا ہے اور نہ آسانی سے سانس لے سکتا ہے۔ ابوبکر کے دور حکومت میں میرا بھی حال ایسا ہی تھا؛ نہ ہی میں معاشرے کو چھوڑ کر دین کے

کاموں اور لوگوں کے کاموں سے بے اعتنائی برت سکتا تھا اور نہ ہی اس پر قادر تھا کہ دین کا بیڑا غرق کرنے والوں کو اکھاڑ پھینکوں اور جیسا کہ مجھے خدا کے دین اور معاشرے کے معاملات کو سنبھالنا چاہیے تھا سنبھال سکتا تھا، یہ سب میرے حقوق کی لوٹ مار کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ میرے ہمراہ تھا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے اپنا جانشین بنایا تھا اور مجھے اپنے بعد امت کی قیادت سونپی تھی، لیکن غاصبوں نے اسے برداشت نہ کیا اور مجھ سے میرے چچازاد کی حکمرانی چھین لی۔

«حَتَّی مَضَی الأَوَّلُ لِسَبِيلِه. فَأَدْلَى بِهَا إِلَى فُلَانٍ [عُمَرَ] بَعْدَه.

ثُمَّ تَمَثَّلَ بِقَوْلِ الأَعْشَى:

شَتَّانَ مَا يَوْمِي عَلَى كُورِهَا　　وَيَوْمُ حَيَّانَ أَخِي جَابِرِ

فَيَا عَجَباً! بَيْنَا هُوَ يَسْتَقِيلُهَا فِي حَيَاتِه. إِذْ عَقَدَهَا لِآخَرَ بَعْدَ وَفَاتِه لَشَدَّ مَا تَشَطَّرَا ضَرْعَيْهَا.»

یہاں تک کہ پہلے خلیفہ نے اپنا راستہ لیا اور خلافت کو اپنے بعد فلاں (عمر) کے حوالے کر دیا۔

پھر حضرتؑ نے بطور تمثیل اعشیٰ کا یہ شعر پڑھا:

"کہاں وہ دن جو گزرتا تھا میرا اونٹوں پر　　کہاں یہ دن کہ میں حیّان کے جوار میں ہوں"

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں استعفیٰ دے رہا تھا اور مرنے کے بعد خلافت دوسرے کے لیے طے کر گیا۔ بے شک دونوں نے مل کر شدت سے اس (خلافت کی گائے) کے تھنوں کو دوہا ہے۔

جناب امیر علیہ السلام، حکومت کے معاملے میں ابوبکر کی دوہری پالیسی پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے دیگر نکات بھی بیان فرماتے ہیں:

اوّل: ابوبکر (اور عمر) کے دور میں اور رسول اللہ ﷺ کی حیات میں اپنی حالت اور زندگی کا موازنہ کرتے ہیں اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد انھیں کس قدر مشکلات و مصائب، سختیوں، دشواریوں اور تلخیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ (یا بعض تفاسیر کے مطابق، خلافت پر ناجائز قبضہ جمانے والوں کو ملی سہولیات اور خود پر ہو رہے ظلم و ستم اور حقوق کی پائمالی کو دیکھتے ہوئے)۔

دوّم: غاصبانِ حکومت کی حکومت و فرمانروئی پر لالچائی نظر رکھنا اور اس لالچ کی بنیاد پر اسے آپس میں ہی تقسیم کر لینا اور اسے مل بانٹ کھانا۔ کیونکہ « تَشَطَّرَا » کا معنی آدھا کرنے کے بارے میں بھی ذکر ہے اور جس مقام سے اونٹ کا دودھ نکلتا ہے اس کی نوک کو باندھنے کے بارے میں بھی ذکر ہے تاکہ اونٹ کا بچہ دودھ نہ پینے پائے۔ چنانچہ امام علیہ السلام اسی جانب اشارہ فرماتے ہیں: مجھے کہ جو حقیقی معنوں میں خلافت کے لائق تھا منع کیا اور اسے آپس میں تقسیم کر لیا۔

«فَصَيَّرَهَا فِي حَوْزَةٍ خَشْنَاءَ يَغْلُظُ كَلْمُهَا ، وَيَخْشُنُ مَسُّهَا وَيَكْثُرُ الْعِثَارُ فِيهَا وَالِاعْتِذَارُ مِنْهَا. فَصَاحِبُهَا كَرَاكِبِ الصَّعْبَةِ ، إِنْ أَشْنَقَ لَهَا خَرَمَ وَإِنْ أَسْلَسَ لَهَا تَقَحَّمَ ، فَمُنِيَ النَّاسُ لَعَمْرُ اللهِ بِخَبْطٍ وَشِمَاسٍ وَتَلَوُّنٍ وَاعْتِرَاضٍ.»

اور اب اس نے خلافت کو ایک ایسی درشت اور سخت منزل میں رکھ دیا ہے جس کے زخم کاری ہیں اور جس کو چھونے سے بھی درشتی کا احساس ہوتا ہے۔ جہاں لغزشوں کی کثرت ہے اور معذرتوں کی بہتات! اس کو برداشت کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے سرکش اونٹنی کا سوار کہ مہار کھینچ لے تو ناک زخمی ہو جائے اور ڈھیل دیدے تو ہلاکتوں میں کود پڑے۔ اس کی وجہ سے خدا کی قسم لوگ ایک کجروی، سرکشی، تلون مزاجی اور بے راہ روی میں مبتلا ہو گئے۔

عمر کی حکومت اور عمر کے دورِ حکومت میں لوگوں کے حالات کیسے تھے اس بارے میں جناب امیر علیہ السلام کا بیان اس قدر واضح ہے کہ کسی بھی وضاحت اور تفسیر وتشریح کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔

«فَصَبَرْتُ عَلَى طُولِ الْمُدَّةِ وَشِدَّةِ الْمِحْنَةِ.»

اور میں نے بھی سخت حالات میں طویل مدت تک صبر کیا۔

یہاں پر بھی امام علیہ السلام، عمر کے دورِ حکومت میں اپنے صبر کے مظاہرے کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: جیساکہ میں نے ابوبکر کے دورِ حکومت میں آنکھ میں کانٹا اور گلے میں ہڈی ہونے کے باوجود صبر کیا، میں نے عمر کے دورِ حکومت میں بھی آفات کی شدت اور سخت حالات کا سامنا کیا۔

«حَتَّى إِذَا مَضَى لِسَبِيلِهِ، جَعَلَهَا فِي جَمَاعَةٍ زَعَمَ أَنِّي أَحَدُهُمْ فَيَا لَلَّهِ وَلِلشُّورَى. مَتَى اعْتَرَضَ الرَّيْبُ فِيَّ مَعَ الْأَوَّلِ مِنْهُمْ. حَتَّى صِرْتُ أُقْرَنُ إِلَى هَذِهِ النَّظَائِرِ. لَكِنِّي أَسْفَفْتُ إِذْ أَسَفُّوا وَطِرْتُ إِذْ طَارُوا.»

یہاں تک کہ دوسرا بھی اپنی راہ لگا، لیکن خلافت کو ایک جماعت میں قرار دے گیا جن میں ایک مجھے بھی شمار کر گیا جب کہ میرا اس شوریٰ سے کیا تعلق تھا؟ مجھ میں پہلے دن کون سا عیب و ریب تھا کہ آج مجھے ایسے لوگوں کے ساتھ ملایا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے انھیں کی فضا میں پرواز کی اور یہ نزدیک فضا میں اڑے تو وہاں بھی ساتھ رہا اور اونچے اڑے تو وہاں بھی ساتھ رہا۔

جیساکہ بیان کیا جا چکا، غاصبوں کی حکمرانی کا ایک نتیجہ جناب امیر علیہ السلام کی حیثیت و شخصیت کو توڑنے اور آپؑ کے مقام و مرتبے کو کم کرنے کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ اور آپؑ اپنے اس بیان میں اس جانب واضح انداز میں اس کی نشاندہی فرماتے ہوئے کہتے ہیں: پہلے ہی مرحلے میں میرا کوئی ہم پلہ

نہ تھااور میرے مدِ مقابل ابوبکر کی ہی کوئی حیثیت نہ تھی تو پھر عمر کے ذریعہ چنے گئے ان پانچ افراد کی وقعت میرے سامنے کیا ہے جو مجھے ان کے ساتھ شوریٰ میں شریک کر دیا گیا ہے! لیکن وقت نے ہمیں اتنا بھلا دیا ہے اور ہماری تصویر اتنی دُھندلی کر دی ہے کہ میں ایسے لوگوں کے مقابلے میں ہوں۔

تاہم، اس حقیقت کے باوجود کہ وہ لوگ جناب امیر علیہ السلام کے برابر اور ہم پلّہ نہیں تھے آپ نے ان کا ساتھ دیا اور شوریٰ میں حصہ لیا اور ان کی رائے کا بادل ناخواستہ پاس و لحاظ رکھا، کیونکہ کسی بھی خلاف ورزی کی صورت میں، عمر کی وصیت کو آپ کے بارے میں جاری کر دیا جاتا اور آپ قتل ہو جاتے۔

«فَصَغَىٰ رَجُلٌ مِنْهُمْ لِضِغْنِه. ومَالَ الآخَرُ لِصِهْرِه مَعَ هَنٍ وهَنٍ إِلَى أَنْ قَامَ ثَالِثُ الْقَوْمِ نَافِجاً حِضْنَيْه. بَيْنَ نَثِيلِه ومُعْتَلَفِه. وقَامَ مَعَه بَنُو أَبِيه يَخْضَمُونَ مَالَ اللّٰه. خِضْمَةَ الإِبِلِ نِبْتَةَ الرَّبِيعِ. إِلَى أَنِ انْتَكَثَ عَلَيْه فَتْلُه وأَجْهَزَ عَلَيْه عَمَلُه. وكَبَتْ بِه بِطْنَتُهُ.»

مگر پھر بھی ایک شخص اپنے کینہ کی بنا پر مجھ سے منحرف ہو گیا اور دوسرا دامادی کی طرف جھک گیا اور کچھ اور بھی ناقابل ذکر اسباب و اشخاص تھے جس کے نتیجے میں تیسرا شخص سرگین اور چارہ کے درمیان پیٹ پھلائے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ اس کے اہل خاندان بھی کھڑے ہوئے جو مال خدا کو اس طرح ہضم کر رہے تھے جس طرح اونٹ بہار کی گھاس کو چر لیتا ہے یہاں تک کہ اس کی بٹی ہوئی رسی کے بل کھل گئے اور اس کے اعمال نے اس کا خاتمہ کر دیا اور شکم پری نے منہ کے بل گرا دیا۔[1]

---

[1] مزید وضاحت اور نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۳ کے معانی و مطالب کو مزید اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے رجوع کریں: بحار الانوار ۲۹/۴۹۷-۵۴۸۔

عثمان کے زمانے میں حالات کے ناگفتہ بہ اور بگڑے ہونے کی بات اس قدر مشہور ہے کہ اہل تسنّن حضرات کی بھی نظروں میں عثمان کی کچھ خاص وقعت نہیں ہے یعنی وہ عثمان کے لیے اُس عظمت و بلندی کے قائل نہیں ہیں جو وہ شیخین یعنی پہلے دو خلفاء کے لیے قائل ہیں، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے دو خلفاء کے برعکس جناب امیر علیہ السلام عثمان کی مذمت کھل کر کرتے ہیں اور ماحول کچھ یوں تھا کہ امیرالمومنین علیہ السلام آسانی سے عثمان کے خلاف بول سکتے تھے اور مذمت کر سکتے تھے۔

اس خطبے کے مندرجات و مضامین پر توجہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس خطبے کے جملے غاصبوں کے ظلم و ستم کی مزید تائید و تصدیق کرتے ہیں اور غاصبوں کے ظلم کا ایک اور محکم و مستحکم ثبوت ہیں، جو کہ پوری طرح سے اس خیالی محل کو اس کی بنیادوں سمیت اکھاڑ پھینکتے ہیں کہ جس میں یہ گمان کر لیا گیا ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام خلفاء کی حکمرانی سے راضی اور خوش تھے اور یہ لافانی خطبہ حضرتؑ کی طرف رضایت و خوشی کے انتساب کے اندیشے کو پوری طرح ختم کر دیتا ہے اور اس خطبے کی شہرت ساتھ ہی شیعوں اور اہل تسنّن کے درمیان قدیم الایام سے اس پر بڑی بڑی شرحوں کا لکھا جانا اسے معتبر بناتا ہے اور سَنَد کے لحاظ سے اس کے جائزے سے بے نیاز کرتا ہے اور اسے شکوک و شبہات سے بالاتر کرتے ہوئے اعتراض و تنقید کے سارے دروازے بند کر دیتا ہے۔[1]

اور جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ دکھ اور غم کے نشانات ہیں جو اس خطبے میں جا بجا اور جناب امیر علیہ السلام کے کلام میں ہر جگہ بکھرے نظر آتے ہیں جو کہ ہر سننے والے کو جناب امیر علیہ السلام کے غم میں شریک کر لیتے ہیں۔

---

[1] رجوع فرمائیں: الغدیر ۷/۸۱-۸۵ اور بحار الانوار ۲۹/۵۰۴-۵۰۹۔

اُس دن کی آرزو اور امید کے ساتھ کہ جب بہت جلد آپؑ کے فرزند کے نعرۂ عدل وانصاف کی گونج پوری کائنات سنے اور الٰہی انتقام کا ہاتھ، ذوالفقار کو نیام سے کھینچے اور اہل بیت علیہم السلام اور شیعوں کی محرومیوں اور مایوسیوں کو ظہور کی خوشی میں بدل دے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْ أَعْوَانِهِ وَأَنْصَارِهِ وَالْمُسْتَشْهَدِينَ بَيْنَ يَدَيْهِ فِي جُمْلَةِ أَوْلِيَائِهِ.

منابع وماخذ

قــرآن کـریـم

۱) ابن ابی الحدید، عبدالحمید بن ابی الحدید، **شرح نهج البلاغة**، دار إحياء الكتب العربية، ط ۲، ۱۳۸۷ هق.

۲) ابن خلدون، **مقدمة**، دار و مكتبة الهلال للطباعة والنشر بيروت، ۲۰۰۰ م.

۳) ابن عبد البر، يوسف بن عبدالله بن محمد، **الإستيعاب فی معرفة الأصحاب**، مكتبة نهضة مصر، مصر، (بی تا).

۴) ابن فارس، احمد بن فارس، **معجم مقاييس اللغة**، دار إحياء التراث العربی، بيروت، ط ۱، ۱۴۲۲ هق.

۵) ابن قتيبه، عبدالله بن مسلم بن قتيبه الدينوری، **الإمامة والسياسة**، منشورات الرضی، قم، ۱۳۸۸ هق.

۶) ابن كثير، **البداية و النهاية**، دار الكتب العلمية، بيروت، ط ۱، ۱۴۲۱ هق.

۷) ابن منظور، **لسان العرب**، دار لسان العرب، بيروت، (بی تا).

۸) ابن ميثم، ميثم بن علی بن ميثم البحرانی، **شرح نهج البلاغة**، مؤسسة النصر، قم، ط ۱، ۱۳۶۲ هش.

۹) ابن هشام، **السيرة النبوية**، مطبعة مصطفی البانی الحلبی، مصر ۱۳۵۵ هق.

۱۰) امینی، عبدالحسین، **الغــدیــر فی الکــتاب والسنة والأدب**، دارالکتب العربی، بیروت، ط ۵، ۱۴۰۳ هق.

۱۱) انصاری، محمد باقر، **اسرار غدیر**، نشر مولود کعبه، قم، ط.۳، ۱۴۱۸ هق.

۱۲) بحرانی، سید هاشم، **البرهان فی تفسیر القرآن**، مؤسسة البعثة،قم، ط ۱، ۱۴۱۵ هق.

۱۳) ترمذی، محمد بن عیسی بن سورة، **الجامع الصحیح** (سنن ترمذی)، المکتبة الأسلامیة، (بی تا).

۱۴) ثقفی، ابراهیم بن محمد، **الغــارات**، انجمن آثــار مــلی، ط۲، ۲۵۳۵ شاهنشاهی.

۱۵) جعفر مرتضی عاملی، **الصحیح مــن ســیرة النبی الأعــظم**، دار السیرة، بیروت، ۱۴۱۴ هق.

۱۶) جعفریان، رسول، **تاریخ سیاسی اسلام** (ج ۱: سیره ی رسول خدا)، سازمان چاپ و انتشارات، تهران، ط ۱، ۱۳۷۳ هش.

۱۷) جعفریان، رسول، **تاریخ سیاسی اسلام** (ج۲: تاریخ خــلفا)، انتشارات دلیل، قم، ط ۱، ۱۳۸۰ هش.

۱۸) حــاکــم نیشابوری، محمد بــن عــبدالله، **المستدرک عــلی الصحیحین**، دارالمعرفة، بیروت، ط ۱، ۱۴۱۸ هق.

۱۹) حرّعــاملی، محمد بــن حســن بــن عــلی، **وسائل الشیعة**، مؤسسة آل البیت لإحیاء التراث، قم، ط ۱، ۱۴۰۹ هق.

۲۰) حسینی، عبد الزهرا الحسینی الخطیب، **مصادر نهج البلاغة و اسانیده** ، دار الزهراء ، بیروت، ۱۳۶۷ هش.

۲۱) خویی، سید ابوالقاسم، **بیان در علوم و مسایل کلّی قرآن**، دانشگاه آزاد اسلامی واحد خوی، ط ۵ ، ۱۳۷۵ هش.

۲۲) - خویی، میرزا حبیب الله هاشــمی خویی، **منهاج البراعة فی شرح نهج البلاغة**، مکتبة الاسلامیة، تهران، ط ۲، ۱۳۸۶ هق.

۲۳) دیلمی، حسین بن أبی الحسن، **إرشاد القلوب إلی الصـــواب**، انتشارات شریف رضی، ط ۱، ۱۴۱۲ هق.

۲۴) سـلیم، سـلیم بن قیس الهلالی، **کتاب سـلیم بن قیس الهـــلالي** (یک جلدی)، نشر الهادی، قم، ط ۱، ۱۴۲۰ هق.

۲۵) ســـیوطی، جلال الدین، **تاریخ الخلفاء**، شرکة دار الأرقم بن أبی الأرقم، بیروت، (بی تا).

۲۶) شهرستانی، سید علی، **منع تدوین الحدیث**، مؤسسة الامام علی، قم، ط ۱، ۱۴۱۸ هق.

۲۷) صدوق، محمد بن علی بن الحسین بـن بـابویه، **الخصال**، مؤسسة النشر الاسلامی التابعة لجماعة المدرسین، قم، ط۵،

۲۸) صـــدوق، محمد بن علی بن الحســـین بن بابویه، **علل الشرـایع** (یک جلدی)، مؤسسة الأعلمی، بیروت، ط ۱، ۱۴۰۸ هق.

۲۹) صدوق، محمد بن علی بن الحسین بن بابویه، **عـــیـــون أخـــبار الرضا** ،(مترجم)، نشر صدوق، تهران، ط ۱، ۱۳۷۳ هش.

۳۰) صـــدوق، محمد بن علی بن الحســـین بن بابویه، **کمال الدین و تمام النعمة**، (محقق)، مؤسسة الأعلمی، بیروت، ط ۱۴۱۲،۱هق.

۳۱) صـفار، ابوجعفر محمد بـن حسـن، **بصـائـرالـدرجـات**، شرکت چاپ کتاب، تهران، ۱۳۸۰ هق.

۳۲) طباطبایی، مصـطفی، **راهی به ســوی وحدت اســلامی**، مؤلف، تهران، ۱۴۰۰ هق.

۳۳) طبرســی، احمد بن علی بن ابی طالب، **الإحتجاج** (یک جلدی)، نشرـــ المرتضی، مشهد، ۱۴۰۳ هق.

۳۴) طـبـری، محمد بـن جـریر، **تـاریخ الأمـم والـمـلـوك**، مطبعة الاستقامة، قاهره، ۱۳۵۷ هق.

۳۵) طوسی، محمد بن الحسن، **الأمالي**، دار الثقافة، قم، ۱۴۱۴ هق.

۳۶) طوسی، محمد بن الحسن، **کتاب الغیبة للحجة**، مؤسسه ی معارف اسلامی، قم، ط ۱، ۱۴۱۱ هق.

۳۷) عاملی، علی بن یونس العاملی النباطی، **الصراط المستقیم إلی مستحقی التقدیم**، المکتبة المرتضویة، ط ۱، ۱۳۸۴ هق.

۳۸) عیاشی، محمد بن مسعود بن عیاش، **التفسیر**، المکتبة العلمیة الاسلامیة، تهران، ۱۳۸۰ هق.

۳۹) - قرطبی، ابوعبدالله محمد بن احمد، **الجامع لأحکام القرآن**، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، ط ۲، ۱۴۰۵ هق.

۴۰) قلمداران، حیدر علی، **حکومت در اسلام**، مؤلف، قم، ۱۳۸۵ هق. ۴۱ - قمی، علی بن ابراهیم، القمی، دارالکتاب، قم، ط۳، ۱۴۰۴ هق.

۴۱) قمّی، علی بن ابراهیم، **تفسیر القمّی**، دار الکتاب، قم، ط ۳، ۱۴۰۴ هق.

۴۲) کلینی، محمد بن یعقوب، **الکافی**، دار الکتب الاسلامیة، تهران، ط ۵، ۱۳۶۳ هش.

۴۳) - کورانی، علی، **تدوین قرآن** (ترجمه)، سروش، تهران، ط۱، ۱۳۷۹ هش.

۴۴) نعمانی، محمد بن ابراهیم، **کتاب الغیبة**، مکتبة الصدوق، طهران، (بی تا).

۴۵) ماوردی، علی بن محمد بن حبیب، **الأحکام السلطانیة والولایات الدینیة**، دار الکتب العلمیة، بیروت، (بی تا).

۴۶) مجلسی، محمد باقر، **بحارالانوار**، مؤسسة الوفاء، بیروت، ط ۲، ۱۴۰۳ هق،

۴۷) محدث نوری، حاج میرزا حسین، **مستدرک الوسائل و مستنبط المسائل**، مؤسسة آل البیت لاحیاء التراث، قم، ط ۱، ۱۴۰۸ هق.

۴۸) محمودی، محمد باقر، نهج السعادة فی **مستدرک نهج البلاغة** (ج۲)، دار التعارف للمطبوعات، بیروت، ط ۱، ۱۳۹۶ هق.

۴۹) محمودی، محمد باقر، **نهج السعادة فی مستدرک نهج البلاغة**، (ج۴،۵)، مطبعة النعمان، نجف، ط ۱، ۱۳۸۷ هق.

۵۰) معارف، مجید، **تاریخ عمومی حدیث**، انتشارات کویر، تهران، ط ۱، ۱۳۷۷ هش.

۵۱) محمودی، محمد باقر، **نهج السعادة فی مستدرک نهج البلاغة** (ج۱)، مؤسسة المحمودی، (بی تا).

۵۲) **المعجم المفهرس نهج البلاغة**، انتشارات مشهور، قم، ط ۱، ۱۳۸۰ هش.

۵۳) مفید، محمد بن محمد بن نعمان، **الإختصاص**، دار المفید، بیروت، ط ۲، ۱۴۱۴ هق.

۵۴) مفید، محمد بن محمد بن نعمان، **الإرشاد فی معرفة حجج الله علی العباد**، دار المفید، بیروت، ط ۲، ۱۴۱۴ هق.

۵۵) مفید، محمد بن محمد بن نعمان، **الأمالي**، دار المفید، بیروت، ط ۲، ۱۴۱۴ هق.

۵۶) **المنجد**، دار المشرق بیروت، ط ۲۰، ۱۹۶۹ م.

۵۷) المنقری، نصر بن مزاحم، **وقعة صفین**، المؤسسة العربیة الحدیثة، قاهره، ط ۲، ۱۳۸۲ هق.

ہم نے کامیابی کے ساتھ یہ راستہ طے کیا اور دشمنوں کی تمام تر سازشوں کو طشت از بام کر دیا ہے جو اس کوشش میں تھے کہ جناب امیرؑ کے کلام کو توڑ مروڑ کے اور آپؑ کے طرزِ زندگی کو غلط لبادہ اوڑھا کر کسی صورت یہ ثابت کر دیں کہ جناب امیرؑ، خلفاء اور ان کی حکمرانی سے راضی تھے!!۔

شیعہ مکتب، ایک حقیقی اسلامی عقیدے کے طور پر، اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد حکمرانی کا حق ائمہ کا الٰہی حق ہے اور دوسروں نے ان عظیم ہستیوں سے ناجائز طور پر مسند حکومت کو غصب کر لیا ہے۔ دوسری طرف مخالفین نے بھی اسلام کے آغاز میں رونما ہونے والے واقعات کو قانونی حیثیت دینے، انہیں خدا کی مرضی اور اسلام کی شریعت کے مطابق ثابت کرنے کے لیے مسلسل اور ان تھک کوششیں کی ہیں۔

اس کتاب میں جس چیز کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسے تنقید کی ترازو پر تولا گیا ہے وہ ایک ایسا نظریہ ہے جو "رفاقت اور رضامندی" کے نام پر پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں ہم نے امیر المومنین کی خلافت غصب کیے جانے کے موضوع پر اپنی ساری توجہ مرکوز کی ہے اور ہمارا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ امیر المومنین کے نقطہ نظر سے جو کچھ بھی رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد پیش آیا، وہ خلافت کے ان کے الٰہی حق کو غصب کرنا تھا اور ان کے [illegible] سے اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے پتہ چلتا ہو کہ آپ کا حق غصب کرکے آپ پر ظلم روا رکھنے والوں سے آپ راضی رہے ہوں۔ آپؑ کی مظلومیت کی انتہا یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد بھی آپؑ کی مظلومیت میں کمی واقع نہیں ہوئی اور آپؑ کو کہنا پڑا: "مَا زِلْتُ مَظْلُوماً مُنْذُ قَبَضَ اللّٰهُ رَسُولَهُ حَتّٰى يَوْمِ النَّاسِ هٰذَا" جب سے اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو دنیا سے اٹھایا مجھ پر ہمیشہ ظلم ہوتا رہا ہے۔